www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: ششم

حصولِ جنت

مقام حدیث میں ایک مضمون بعنوان "حصول جنت" احادیث کی رو سے بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں محترم پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہوتی ہے۔ یہی مجاہدانہ سرگرمیاں اور سپاہیانہ کوششیں ہیں۔ جن کے بعد ایک عبد مومن کو جنت ملتی ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ جنت یونہی بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۱۴)

"کیا تمہارا خیال ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ جب کہ ابھی تم پر وہ مراحل نہیں آئے جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے۔ انہیں سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ڈگمگا گئے حتیٰ کہ رسول اور ایمان والے سب پکار اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کہاں ہے؟ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) یاد رکھو کہ اب اللہ کی مدد آن ہی پہنچی۔"

دوسری جگہ ہے:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾ ﴾ (آل عمران۳/ ۱۴۲)

"کیا تمہارا خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم سے جہاد کرنے والوں کو معلوم ہی نہیں کیا اور نہ انہیں جو صبر کرنے والے ہیں۔"

یہ تھی وہ جنت جس کا وعدہ قرآن نے کیا تھا۔ یعنی خالص سعی و عمل کا نتیجہ (جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ) یہ تو تھی قرآن کی تعلیم لیکن اس کے برعکس آپ دیکھئے کہ احادیث کی رو سے جنت کس قدر سستی اور سہل الحصول بنا دی گئی۔" (مقام حدیث ص ۲۰۹ تا ص ۲۱۱)

پرویز صاحب کی یک چشمی: اب دیکھئے مندرجہ بالا آیات کا ترجمہ ہم نے اپنی طرف سے پیش کیا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(باقی سب کچھ پرویز صاحب کا ہے) آپ سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے مجاہدانہ زندگی اور جنت لازم وملزوم ہیں۔ اور مجاہدانہ زندگی سے آپ کا مطلب سپاہیانہ زندگی اور جہاد سے آپ کا مطلب جہاد بالسیف ہے۔ کیونکہ یہ دونوں آیات اسی بات کی طرف دلالت کر رہی ہیں۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پرویز صاحب کی عادت ہے کہ جس بات کو وہ ثابت کرنا چاہیں۔ اس کے مطابق آیات تو قرآن سے لے لیتے ہیں۔ اور جو ان کے نظریہ کے مخالف ہوں۔ ان سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ اب پیشتر اس کے ہم احادیث سے سہل الحصول جنت والی احادیث پر تبصرہ کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قرآن سے ہی پوچھ لیں کہ آیا پرویز صاحب کا یہ نظریہ درست ہے کہ جنت صرف جہاد کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے؟

قرآن اور حصول جنت : ① اب ارشادات باری ملاحظہ فرمایئے:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ قَالُوا۟ رَبُّنَا ٱللَّهُ ثُمَّ ٱسْتَقَٰمُوا۟ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا۟ وَلَا تَحْزَنُوا۟ وَأَبْشِرُوا۟ بِٱلْجَنَّةِ ٱلَّتِى كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ ﴾ (فصلت ٤١/ ٣٠)

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس بات پر ڈٹ گئے۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔"

دیکھئے اس آیت کی رو سے صرف رَبُّنَا اللّٰہُ کہنے اور پھر اس پر ڈٹ جانے پر جنت کی بشارت ہے۔ اس میں نہ بدنی عبادتوں کا ذکر ہے نہ مالی کا نہ جہاد کا لیکن جنت پھر بھی مل رہی ہے۔

② سورہ مومنون کی آیات ۱ تا ۹ میں ایمانداروں کی فلاح کی صورت درج ذیل اعمال میں بیان کی گئی ہے۔ "جو اپنی نماز میں ڈرتے ہیں۔ جو لغو باتوں سے دور رہتے ہیں۔ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ماسوائے اپنی بیویوں یا لونڈیوں کے کہ وہ ان کے لیے قابل ملامت نہیں ہیں۔ اور جو ان کے علاوہ تلاش کریں وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو امانتوں اور عہد کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں" یہ چھ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

﴿ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْوَٰرِثُونَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يَرِثُونَ ٱلْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿١١﴾ ﴾

"یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

(المؤمنون ۲۳/ ۱۰۔۱۱)

اب دیکھئے ان مومنوں کی صفات میں کہیں جہاد کا ذکر آیا ہے؟ اس کے باوجود انہیں جنت کے اعلیٰ درجہ یعنی جنت الفردوس کا وارث قرار دیا جا رہا ہے۔

③ اب ایک دوسرے مقام سے حقیقی مومنوں کی بعض دوسری صفات سن لیجیے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا

"مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤﴾﴾ (الأنفال ٨/ ٢-٤)

ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور جو مال ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ فی الحقیقت مومن ہیں۔ ان کے رب کے پاس درجات ہیں۔ مغفرت ہے اور عزت کا رزق ہے۔"

اب دیکھ لیجیے ان حقیقی مومنوں کی صفات میں کہیں جہاد کا ذکر آیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انہیں اللہ کے ہاں سے مغفرت بھی مل رہی ہے۔ بہترین رزق بھی اور درجات (جنت) بھی۔

④ اور سورہ معارج میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے جو اوصاف بتائے وہ یہ ہیں:

"کہ وہ لوگ جو نماز پر ہیشگی اختیار کرتے ہیں۔ اور جن کے اموال میں مانگنے اور نہ مانگنے والوں کا حصہ مقرر ہے۔ اور جو روز جزاء کی تصدیق کرتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے پروردگار کا عذاب ڈرنے کے قابل چیز ہے۔ اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے (کہ ان کے پاس جانے پر) انہیں کچھ ملامت نہیں اور جو لوگ ان کے سوا اور کے خواستگار ہوں تو وہ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اقرار کا پاس کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ سات اوصاف گنا کر فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾﴾ "یہی لوگ جنت میں عزت (واکرام) سے ہوں گے۔"

(المعارج ٧٠/ ٣٥)

بتایئے ان مذکورہ صفات میں کہیں جہاد یا مجاہدین کا ذکر آیا ہے؟ ان دونوں مذکورہ طویل فہرستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کے لیے جہاد شرط نہیں ہے۔ بلکہ سب سے اہم شرط نماز ہے۔ ان دونوں فہرستوں کا آغاز بھی نماز سے ہوتا ہے اور اختتام بھی نماز پر ہی ہوتا ہے۔

⑤ پھر سورہ فرقان میں "عباد الرحمٰن" کی ۱۴ صفات بتانے کے بعد فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٧٦﴾﴾ (الفرقان ٢٥/ ٧٥-٧٦)

"یہی لوگ ہیں جنہیں صبر کے عوض جنت کے بالاخانے ملیں گے۔ ان کی ملاقات تحیہ وسلام کے ذریعہ ہوا کرے گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ان کا مستقر اور مقام کتنا اچھا ہے۔"

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے دوسری ۱۴ صفات بتائی ہیں۔ جہاد کا کہیں ذکر نہیں فرمایا۔

بات دراصل یہ ہے کہ قرآن کا اسلوب بیان ایسا نہیں کہ مومنوں کی تمام صفات کو ایک ہی مقام پر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

بیان کر دے۔ بلاشبہ جہاد بھی مومنوں کی ایک اعلیٰ صفت ہے اور اس کی اہمیت کے ہم بھی قائل ہیں۔ ہم نے یہ آیات اس لیے درج کی ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ:

1. جنت میں داخلہ صرف جہاد کے ساتھ مستلزم نہیں۔ جہاد کے بغیر بھی ممکن ہے۔
2. جہاد سے بہت سہل درجہ کے کاموں پر بھی جنت کا ملنا یقینی ہے۔

جہاد اور جنت کو پرویز صاحب نے لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ تو یہ بات اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ جہاد سے عورتیں' بچے' بوڑھے' لولے' لنگڑے' بیمار وغیرہ سب مستثنیٰ ہیں۔ تو کیا ایسے لوگوں کا جنت میں داخلہ ممنوع ہو گا؟ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں فوج کا محکمہ ہی الگ بنا دیا تھا۔ اور ان فوجیوں کو بیت المال سے معاوضہ ملتا تھا۔ لہٰذا عام مسلمانوں پر جہاد فرض نہ رہا۔ کیا اس صورت میں فوجیوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کا جنت میں داخلہ نہ ہو سکے گا؟

حدیث اور جہاد: قرآن کریم سے جہاد کی فضیلت اور اہمیت پر آپ نے دو آیات پیش کی ہیں۔ جب کہ مزید آیات بھی اس اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔ ان سب کا شمار کیا جائے تو مجموعی تعداد دس' بارہ یا پندرہ سے آگے نہیں بڑھے گی۔ اب اس کے مقابلہ حدیث کی کسی کتاب میں کتاب الجہاد والسیر ملاحظہ فرمایئے۔ وہاں جہاد کی اہمیت' فضیلت اور درجات سے متعلق قرآن سے بیسیوں گنا زیادہ ارشادات نبوی مل جائیں گے۔ (امام بخاری نے تو اس کتاب کے ایک باب کا نام ہی الجنة تحت ظلال السُّیُوفِ تجویز فرمایا ہے۔)

کیا جہاد کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلہ میں طلوع اسلام کو حدیث میں کچھ بھی نظر نہیں آتا؟ اب ایک طرف آپ قرآن سے وہ پہلو آشکار کرتے ہیں جس سے جہاد کی اہمیت واضح ہو تو یہ بات چھوڑ جاتے ہیں کہ جہاد کے علاوہ اور بھی بہت سے اعمال وصفات ہیں جن کی بناء پر جنت مل جانا یقینی ہے اور دوسری طرف حدیث سے صرف ان اعمال وصفات کا ذکر کرتے ہیں جن پر جنت کا وعدہ ہے۔ اور جن احادیث میں جہاد کی اہمیت واضح ہے اسے نظرانداز کر جاتے ہیں تو کیا یہی تحقیق کا انداز ہوتا ہے؟ حدیث دشمنی کی پچ میں آکر قرآن دشمنی بھی شروع کر دی یعنی قرآن کا بھی ایک حصہ نظرانداز کر دیا۔

جنت اور مغفرت: جنت اور مغفرت کا تعلق یہ ہے کہ اگر اللہ کے ہاں مغفرت ہو جائے تو جنت لازماً مل جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے صرف ایک جرم ایسا ہے جس کی مغفرت نہیں ہو سکتی اور وہ شرک ہے (۴:۱۱۶) لہٰذا مشرک پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو بھی حرام کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جرم ایسا نہیں جس کی بالآخر مغفرت نہ ہو جائے۔ عذاب کی مدت کا طویل سے طویل تر ہونا ممکن ہے لیکن بالآخر شرک کے سوا سب مجرموں حتیٰ کہ کافروں کی مغفرت کا امکان بھی قرآن کی رو سے ثابت ہے (۶:۹۸ تا ۸) اور ہمارے خیال میں مغفرت اور جنت لازم وملزوم ہیں کیونکہ اللہ کی وسیع رحمت کا یہی تقاضا ہے۔

کن گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے؟: گناہ کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

دوسرے وہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتے۔ جب کہ متعلقہ شخص جس کا حق پامال ہوا ہے معاف نہ کرے۔ لیکن استثناء اس میں بھی موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اللہ چاہے تو وہ بھی معاف کر سکتا ہے وہ اس طرح کہ حق دار کو اس کا حق یا اس کا خاطر خواہ معاوضہ دے کر خوش کر دے یا یہ کہ حق دار کے دل میں ہی یہ بات ڈال دے کہ وہ حق پامال کرنے والے کو معاف کر دے باقی رہے حقوق اللہ تو اللہ مالک ومختار ہے چاہے تو کسی چھوٹے سے حق پر بھی گرفت کرے اور چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کر دے۔ لیکن اس مغفرت کے بھی کچھ اصول ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کے اعمال اس کے سابقہ برے اعمال کو ختم یا تلف کر دیتے ہیں ارشاد باری ہے:

مغفرت کیسے ہوتی ہے؟:

﴿ إِنَّ ٱلْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ﴾ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ (ھود۱۱/ ۱۱٤)

یعنی چھوٹے چھوٹے گناہوں کو نیکیاں آپ سے آپ ختم کرتی رہتی ہیں۔ اور انسانوں کی مغفرت ہوتی رہتی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ ٱلَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلْإِثْمِ وَٱلْفَوَٰحِشَ إِلَّا ٱللَّمَمَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ وَٰسِعُ ٱلْمَغْفِرَةِ ﴾ (النجم۵۳/ ۳۲)

"جو لوگ چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں تو (سن لو کہ) بے شک تمہارا پروردگار وسیع مغفرت والا ہے۔"

اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ اتنی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں جیسے کسی بیماری کے جراثیم جو انسان سے دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح سے سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے نماز کے لیے وضو اچھی طرح نہ کیا یا نماز ادا تو باجماعت کی مگر اللہ کی یاد سے غافل رہا یا اللہ کی راہ میں خرچ تو کیا مگر اس میں کچھ ریا بھی شامل ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ایسی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے کوئی شخص بھی بچ نہیں سکتا۔ ان کی مغفرت کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ نیک اعمال سے یہ تلف ہوتے رہتے ہیں۔ اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے رہنا یعنی استغفار' اور یہ استغفار تو ایسا طریقہ ہے کہ اس سے چھوٹے چھوٹے گناہ تو درکنار اللہ تعالیٰ بعض دفعہ بڑے بڑے گناہ بھی معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

﴿ وَإِذْ قُلْنَا ٱدْخُلُوا۟ هَٰذِهِ ٱلْقَرْيَةَ فَكُلُوا۟ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا۟ حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَٰيَٰكُمْ ۚ ﴾ (البقرۃ۲/ ۵۸)

"اور (اس بستی کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور بخشش طلب کرنا ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔"

اب دیکھئے یہی بات سورہ اعراف آیت نمبر ۱۶۰ میں بھی دہرائی گئی ہے۔ وہاں خَطَايَاكُمْ کی جگہ خَطِيٓـَٔتِكُمْ جس کا مطلب یہ ہوا کہ استغفار سے بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ اور مغفرت کے ساتھ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

جنت بھی لازم وملزوم ہے۔ گویا قرآن کی رو سے بھی بعض چھوٹے چھوٹے اعمال اور ذکر واذکار سے مغفرت بھی ہو جاتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جو محنت ومشقت اور جدوجہد کے لحاظ سے ایک معمولی عمل معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سب اعمال سے بڑا یعنی افضل عمل ہے ارشاد باری ہے۔

﴿ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ ٱللَّهِ أَكْبَرُ ﴾ "بلاشبہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑا (نیکی کا) کام ہے۔"

(العنکبوت۲۹/ ٤٥)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَٱلَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا۟ فَٰحِشَةً أَوْ ظَلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا۟ ٱللَّهَ فَٱسْتَغْفَرُوا۟ لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ إِلَّا ٱللَّهُ ﴾ "اور جو لوگ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟"

(آل عمران۳/ ١٣٥)

غرض ایسی بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ کے ذکر اور استغفار کی فضیلت اس انداز میں بیان ہوئی ہے کہ ان کاموں سے (جو منکرین سنت کو بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں) اللہ تعالیٰ فاحشہ، ظلم اور خطایا بھی بخش دیتے ہیں اور نیز یہ کہ ذکر واذکار اور استغفار اللہ کے ہاں بہت بڑے عمل ہیں اور صرف ان اعمال کی صحیح بجا آوری پر بھی مغفرت ہو سکتی یعنی جنت مل سکتی ہے۔ اب اگر یہی باتیں احادیث میں یہ حضرات دیکھ پاتے ہیں۔ تو چلا اٹھتے ہیں کہ دیکھو جنت کا داخلہ کن دشوار گذار راستوں سے ملتا تھا۔ جسے ملانے اس قدر آسان بنا دیا ہم ان کی اس کج فکری پر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ؟

جہاد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن دین کے دوسرے پہلوؤں کو جو جہاد سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ آخر انہیں کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے کیا مسلمانوں نے یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ کئی صدیوں تک نہیں نباہے؟ کیا مسلمان ایسی مثالیں تاریخ کے صفحات پر ثبت نہیں کر گئے۔ کہ اگر وہ صبح کو جہاد میں مصروف ہوتے تھے تو رات اللہ کی یاد میں بسر کر دیتے تھے۔ یہ دونوں طرح کے پہلو اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں۔ اور ہر دو طرح کے اعمال پر انسان کی مغفرت اور حصول جنت قرآن کی رو سے ثابت ہے۔ پھر اگر یہ دونوں باتیں کسی ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو زہے قسمت..... رسول اکرم ﷺ اور اکثر صحابہ میں یہ دونوں صفات موجود تھیں۔ تاہم ذکر اللہ میں اضافی خوبی بھی ہے۔ کہ اس سے عورتیں، بوڑھے، بچے، بیمار، لنگڑے سب اور ہر حالت (یعنی حالت جنگ اور امن) میں مستفید ہو سکتے ہیں۔

مصیبت بعض گناہوں کا کفارہ بھی ہے اور بعض گناہوں کی معافی بھی: ارشاد باری ہے:

﴿ وَمَآ أَصَٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ﴿٣٠﴾ ﴾ "جو مصیبت تم پر آتی ہے تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور وہ بہت سے گناہ معاف بھی کر دیتا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(الشوری ۴۲/ ۳۰) ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت آنے سے بعض گناہوں کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے (اور اگر ایسی بات نہ ہو تو اس مصیبت کے بدلے) اللہ بہت سے دوسرے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

اور اگر یہی باتیں احادیث میں مذکور ہوں تو انہیں اعتراض کا ہدف بنا لیا جاتا ہے۔ مثلاً پرویز صاحب نے جن احادیث کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کے عنوان یہ ہیں "مصیبتیں گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں" حتیٰ کہ بیماری بھی۔ بخار سے جنت' اندھا یعنی اندھے کا اپنی بے بصری پر صبر اور اللہ کا شکر جنت کا باعث بن جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

شہادت : لغوی لحاظ سے شہادت کا معنی گواہی دینا اور شہید بمعنی گواہی دینے والا۔ حاضر موجود وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والا شہید کا لغوی معنی نہیں بلکہ اصطلاحی معنی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ پرویز صاحب لغات القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

"خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شہید کہا جاتا ہے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی۔ یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص (یعنی مقتول فی سبیل اللہ) کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا۔"
(لغات القرآن' ج:۲' زیر عنوان ش-ہ-د)

شہید کون کون ہیں؟ : اب یہ تو واضح ہے کہ اگر قرآن نے شہید کو اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا تو پھر اس لفظ کو ان اصطلاحی معنوں میں پہلے کس نے استعمال کیا؟ واضح ہے کہ رسول اللہ نے کیا اور پھر اس کے بعد صحابہ نے۔ پھر یہ لفظ ان اصطلاحی معنوں میں اتنا معروف ہوا کہ آج کل غیر مسلم اقوام مثلاً ہندو اور کمیونسٹ بھی اپنے جنگی مقتولوں کے لیے یہ لفظ بڑے فخر سے استعمال کرتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہید کے ان اصطلاحی معنوں کو عام کرنے والے رسول اکرم ﷺ ہیں تو انہیں اتنا بھی حق حاصل نہیں دیا جا سکتا کہ اس لفظ کے معانی کی وسعت بھی بتا دیں۔ آپ نے اس لفظ کو ہر اس مومن کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ جس کی موت کسی حادثہ یا وبا یا ناگہانی طور پر واقع ہو۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے جسے طلوع اسلام نے مقام حدیث میں بحوالہ مسلم درج کیا ہے۔

"رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو؟" صحابہ نے عرض کیا "جو خدا کی راہ میں مارا جائے" حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی" صحابہ نے پوچھا "پھر شہید کون ہے؟" فرمایا: "جو خدا کی راہ میں مارا جائے وہ شہید جو اسہال سے مرگیا وہ شہید جو طاعون سے مرگیا وہ شہید۔ جو پانی میں ڈوب کر مرگیا وہ شہید۔ جو مکان کے گرنے سے دب کر مرجائے وہ شہید جو آگ میں جل کر مرجائے۔ وہ بھی شہید' اور جو عورت وضع حمل کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید۔" (مقام حدیث ص ۲۱۸)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب طلوع اسلام کا اعتراض یہ ہے کہ اس اصطلاح کے بانی نے اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو شہادت کے اس مفہوم میں کیوں شامل کر دیا؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ حضرات یا تو اس اصطلاح کا سارا مفہوم قبول کر لیں۔ یا پھر اس کے جزوی مفہوم یعنی مقتول فی سبیل اللہ کے لیے الگ اصطلاح وضع کر لیں۔ یا پھر جیسے قرآن نے ایسے لوگوں "مقتول فی سبیل اللہ" کہا ہے۔ آپ بھی یہی کچھ کہا کریں تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں۔

بعد ازاں پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ان شہداء کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے۔" (م۔ح ص۲۱۸)

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ظاہر ہو گیا کہ "شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے" کیا قرآن میں کہیں یہ لکھا ہوا ہے۔ قرآن میں تو صرف یہ ہے کہ وہ مردہ نہیں' زندہ ہیں۔ ان کو مردہ نہ کہو۔ اور اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں اور زندہ بھی ہیں۔ اس سے یہ کیسے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ گویا شہید کی اصطلاح بھی حدیث سے ماخوذ ہے اور اس کی رعایات بھی جو حدیث نے بتائی ہیں۔ وہ تو ان حضرات کے ہاں مسلم ہیں۔ البتہ کچھ باتیں قابل اعتراض بھی ہیں اور ان سے یہ حضرت انکار کر جاتے ہیں۔ گویا حدیث کے معاملہ میں بھی ان کا رویہ ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ کے مصداق ہوتا ہے۔

لڑکیوں کی تربیت پر جنت : پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"اولاد کے معاملہ میں انسان بے بس ہے کہ اس کے ہاں لڑکے پیدا ہوں یا لڑکیاں لیکن اس بے بسی میں بھی ایک رعایت کا پہلو ہے۔ حاکم کی روایت ہے کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں ہوئیں اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی۔ جب تک وہ اس کے پاس رہیں تو یہ لڑکیاں اسے جنت میں لے جائیں گی۔" (م۔ح ص۲۱۹)

اب دیکھئے دور جاہلیت میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآن نے اس کی دو وجوہ بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ لڑکیوں کی پیدائش کو باعث ننگ و عار سمجھا جاتا تھا۔ وہ کسی کو اپنا داماد بنانا ہی پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے اولاد کی تربیت پر اخراجات کے بار کی وجہ سے انہیں زندہ درگور کرتے تھے۔ لڑکے تو پھر بڑے ہو کر کماتے تھے۔ مگر لڑکیاں یہ کام بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا صرف لڑکیوں کو ہی زندہ درگور کیا جاتا تھا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جتنے بڑے جرم میں کوئی شخص یا قوم مبتلا ہو تو اسے اللہ کے حکم کی اطاعت میں اس کے چھوڑنے پر اتنا ہی بڑا اجر وثواب ملتا ہے۔ اور زندہ درگور کرنے کا فعل چونکہ باپ ہی کیا کرتے تھے۔ لہٰذا آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں پیدا ہوں۔ پھر وہ ان کو زندہ درگور کرنے کی بجائے بطریق احسن ان کی تربیت کرے پھر بلوغت پر ان کا نکاح کر کے رخصت کرے تو وہ لڑکیاں اسکی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مغفرت اور جنت کا باعث بن جائیں گی۔ مندرجہ بالا روایت میں بھلائی کرنے کا مطلب حسن تربیت اور جب تک پاس رہنے کا مطلب نکاح سے پہلے کی عمر ہے۔

فریب دہی کی کوشش: اب پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ "انسان اولاد کے معاملہ میں بے بس ہے لڑکے پیدا ہوں یا لڑکیاں" واقعی انسان اس معاملہ میں تو بے بس ہے۔ لیکن جس معاملہ میں با اختیار ہے اس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا۔ وہ بابس (بااختیار) اس معاملہ میں ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کرے۔ سوچئے کہ اس روایت میں آخر لڑکیوں کا ہی کیوں ذکر آیا ہے۔ لڑکوں کا کیوں نہیں آیا؟ نیز اولاد کے سلسلہ میں "رعایت کا پہلو" لڑکیوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کیا گیا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ طلوع اسلام جو مساوات مرد و زن کا صرف حامی ہی نہیں۔ بلکہ اسے اس کے جائز مقام سے بلند مقام عطا کرنے میں کوشاں رہتا ہے اسے تو اس حدیث پر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ اب جو شریعت نے رعایت کے پہلو کو لڑکیوں کے ساتھ مختص کیا ہے تو پھر بھی اس نے اعتراض جڑ دیا۔ گویا اس کا اصل مقصد حدیث پر اعتراض برائے اعتراض ہوتا ہے۔ بات خواہ کوئی بھی چل رہی ہو۔

ماؤں کے صبر پر جنت: پھر فرمایا:

"یہ تو رہا اس شخص کا معاملہ جس کی اولاد زندہ رہے۔ اب رہا وہ جس کے بچے فوت ہو جائیں۔ صحیحین کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین بچے نابالغ مرگئے۔ خدا تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ نیز فرمایا کہ کسی شخص [1] کے تین بچے مرجائیں پھر اسے آگ چھوئے ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف قسم پورا کرنے کے لیے اسے پل صراط سے گزارا جائے گا" نسائی میں ہے کہ تین بچوں کی وفات پر جنت کی بشارت سن کر ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جس کے دو ہی بچے مرے ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دو کے مرنے پر بھی یہی بشارت ہے۔ اس عورت نے بعد میں کہا۔ کاش میں ایک بچے کے متعلق بھی پوچھ لیتی تو کیا اچھا ہوتا" لیکن اس کمی کو احمد کی ایک روایت نے پورا کر دیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک بچے کی وفات پر بھی جنت کی بشارت دی حتیٰ کہ اسقاط حمل پر بھی۔" (م۔ ح ص۲۱۹)

اب دیکھئے کہ بچوں کی زندگی اور موت کے سلسلہ میں تو انسان واقعی بے بس ہے۔ لیکن یہ کیا معاملہ ہے مردوں کو جنت کی بشارت موت کی صورت میں نہیں بلکہ لڑکیوں کے حسن تربیت اور بروقت رخصتی پر دی جا رہی ہے اور اس میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں اور بچوں کے مرنے پر بشارت دی جا رہی ہے۔ تو صرف عورتوں کو اور اس میں مردوں کا کوئی حصہ نہیں۔

---

[1] آپ کا یہ خطاب خالص عورتوں سے تھا۔ مردوں سے نہیں۔ دیکھئے بخاری کتاب العلم

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب ہم جو دوسری احادیث کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بشارت صرف ان بچوں کی موت کی صورت میں ہے جو بلوغت سے پہلے فوت ہو جائیں (بخاری۔ کتاب العلم) جس کا طلوع اسلام نے حوالہ دیا ہے۔ اس سے اگلی حدیث میں وضاحت موجود ہے اور صرف اس صورت میں ہے کہ عورت اس بچی کی وفات پر صبر کرے۔ جزع وفزع یا نوحہ نہ کرے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ماں کی بچے سے محبت باپ کی نسبت بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وفات پر جزع وفزع اور بین کرنے میں عورت ہی پیش پیش ہوتی ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ بچہ بھی چھوٹا ہو۔ تو ایسے شدید صدمات کو صبر سے برداشت کرنے پر عورت کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ پرویز صاحب صرف موت وزیست میں بے بسی کا پہلو نکال کر "مفت کی جنت" عطا فرما رہے ہیں۔ حالانکہ جنت ایک بہت بڑے صدمے پر صبر اور ایک بااختیار عمل پر ملتی ہے صرف مرنے جینے کی بے بسی پر نہیں۔

تلاوت قرآن اور جنت : پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"قرآن نظام خداوندی کا ضابطہ قانون ہے اور قانون عمل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا عمل قرآن کے مطابق رہتا تو باطل قوتیں کبھی سر نہ اٹھا سکتیں لہٰذا مخالفین اسلام کی پہلی تدبیر یہ تھی کہ مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ قرآن فقط پڑھنے کی چیز ہے۔ عمل کرنے کی نہیں۔ ثواب اس کے پڑھنے سے ملتا ہے۔" (ص ۲۲۱)

اب دیکھئے کہ پرویز صاحب فرما رہے ہیں کہ قرآن محض ضابطہ قانون ہے کیا طلوع اسلام یہ بتا سکتا ہے کہ:

1 کٓھٰیٰعٓصٓ یا حٰمٓ عٓسٓقٓ میں کونسا ضابطہ قانون ہے؟ کیا یہ قرآن میں شامل ہے یا نہیں؟ یا تلاوت کرتے وقت اسے پڑھنا چاہیئے یا چھوڑ دینا چاہیئے؟ پھر جو آیات کوئی ضابطہ پیش ہی نہیں کرتیں۔ اور نہ ہی ان پر عمل ہو سکتا ہے تو پھر ان کو پڑھنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ پھر یہ صورت حال تمام تر آیات متشابہات کے سلسلہ میں پیش آتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآن سے صرف احکام کا حصہ الگ کر لیا جائے تو وہ صرف پانچواں حصہ یا زیادہ سے زیادہ چوتھا حصہ ہوگا۔ باقی تین چوتھائی قرآن میں کوئی ضابطہ قانون مذکور نہیں۔ اس لحاظ سے اس تین چوتھائی قرآن کی تلاوت کی جانی چاہیئے یا نہیں؟ (مزید تفصیل الگ مضمون تلاوت قرآن پاک میں دیکھئے۔) پھر فرمایا:

"جہاں قرآن کے اعمال کا ذکر ہے۔ اس سے مراد وہ عملیات ہیں جن کی رو سے بھوت پریت دور کیے جاتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ دہرانے میں الجھا دیا یعنی صرف قرآن پڑھنے میں۔" (حوالہ ایضاً)

اب سوال یہ ہے کہ اگر سب مسلمان انہیں عملیات میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ تو انہوں نے ان وضعی روایات کے بعد بھی سات سو سال تک حکومت کیسے کر لی؟

2 کیا طلوع اسلام کوئی ایسی صحیح حدیث پیش کر سکتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ "قرآن کے اعمال

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سے مراد وہ عملیات ہیں جن کی رو سے بھوت پریت دور کیے جاتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو یقیناً طلوع اسلام کا حدیث پر صریح الزام ہے؟ اگر بالفرض کچھ مسلمان از خود ایسا کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی کردار ہے۔ اس کا الزام حدیث پر کیونکر آسکتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں: "قرآن کے الفاظ دہرانے کی برکات سے متعلق تمام کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ نمونہ دو ایک مثالیں سن لیجیے" (حوالہ ایضاً) اس کے بعد آپ نے چھ ایسی روایات درج فرمادیں جن میں بعض قرآنی سورتوں کے فضائل مذکور ہیں۔ جو زیر بحث موضوع یعنی حصول جنت سے خارج ہیں۔ البتہ موطا کی ایک درج ذیل حدیث بھی درج فرمائی جو موضوع زیر بحث سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ ہم درج کر رہے ہیں:

"موطا امام مالک میں ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قل ھو اللہ پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہوگئی کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہوگئی؟ فرمایا جنت واجب ہوگئی۔" (م- ح ص ۲۲۲)

اب اگر قرآن کی رو سے صرف ربنا اللہ کہنے اور اس پر جم جانے سے جنت واجب ہو سکتی ہے تو سورہ اخلاص پوری پڑھنے اور اس پر قائم رہنے سے جنت کیوں واجب نہیں ہو سکتی؟ اور اس آیت پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔

پھر آخر میں حاکم کی درج ذیل روایت بیان فرمائی کہ:

"حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش آواز قرآن خوانوں کی آواز کو نہایت شوق سے سنتا ہے جیسے کوئی گانا سننے والا گانے والے کی آواز کو شوق سے سنتا ہے۔" (حوالہ ایضاً)

اس حدیث پر طلوع اسلام کو اعتراض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کسی بات پر خوش ہونے یا ناراض ہونے جیسی صفات سے عاری سمجھتا ہے۔ کیونکہ خدا کے متعلق اس کا تصور ہی بالکل جداگانہ ہے۔ جس کی تفصیل ہم پہلے بھی پیش کر چکے ہیں اور آخری حصہ میں مزید تفصیلات پیش کر رہے ہیں۔

جنت ضعیفوں اور کمزوروں کے لیے ہے:

پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے۔ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ قرآن بار بار [1] مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اتنی قوت جمع رکھو کہ مخالفین پر تمہارا رعب چھایا رہے... اور مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوت وسطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہے ان پر غالب آنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنا شروع کر دیں۔ کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف وناتوان ہیں۔ جن پر محتاجی اور مفلسی چھائی رہتی ہے جو کمزوری اور بے چارگی کے مجسمے ہیں جو دنیا میں ذلیل وخوار ہوں۔ چنانچہ بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا کہ اکثریت سے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فقیر تھے۔" (مقام حدیث ص ۲۲۴)

---

[1] بار بار نہیں بلکہ صرف ایک بار

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پہلے تو دیکھئے کہ اس مفسر قرآن نے آیت ہی غلط درج فرما دی۔ سورہ مجادلہ میں حزب الشیطٰن کے مقابلہ میں حزب اللہ کا ذکر آیا ہے۔ حزب الشیطٰن کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا اُولٰئِكَ هم الخٰسِرون (۱۹:۵۸) اور حزب اللہ کے متعلق فرمایا ان حزب الله هم المفلحون (۲۲:۵۸) اور فلاح کا لفظ قرآن میں اُخروی فلاح یا نجات کے لیے آتا ہے۔ یعنی اخروی فلاح تو یقینی ہوتی ہے۔ دنیاوی فلاح ہو یا نہ ہو۔ بالفاظ دیگر دنیا میں خوشحالی اور قوت وسطوت نصیب نہ بھی ہو تو بھی حزب اللّٰہ هم المفلحون ہی ہوتے ہیں۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

1. حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حقیر قسم کے لوگ تھے۔ حضرت عیسیٰ اور ان حواریوں کو نہ قوت نصیب ہوئی نہ حکومت۔ فرمایئے یہ لوگ هم المفلحون میں سے ہیں یا نہیں؟ یا انہیں جنت ملے گی یا نہیں؟
2. حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین غلامی کے چنگل سے تو نکل گئے لیکن حضرت موسیٰ کی وفات تک میدان تیہ میں ہی بھٹکتے رہے اور ان کو قوت وسطوت نصیب نہ ہوئی؟ ان کے متعلق کیا خیال ہے کہ انہیں جنت ملے گی یا نہیں؟
3. غرضیکہ تمام انبیاء کا یہی حال رہا ہے کہ ان کا مخالف فریق مترفین یعنی آسودہ حال ہوتے تھے اور وہ انبیاء کے متبعین کو اَرَاذِلُنا بادِیَ الرَّاْیِ کہتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان متبعین انبیاء کو یعنی فقیر مسکین مسلمانوں کو جنت ملے گی یا نہیں؟
4. بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء قوت وسطوت حاصل ہونے کے برعکس خود قتل ہو جاتے رہے۔ ان کی فلاح اور حصول جنت کے متعلق کیا خیال ہے؟
5. خود مسلمانوں کا مکہ میں اور جنگ احزاب سے پہلے تک کیا حال رہا؟ اس دوران جو مسلمان فوت ہو گئے ان کے متعلق کیا خیال ہے؟
6. جنگ احزاب کے بعد مسلمانوں کی زیردستی کا قصہ تو ختم ہوا۔ لیکن معاشی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ جنگ تبوک کے وقت مجاہدین آپ کے پاس جہاد کے لیے سواری (یا بعض کے نزدیک جوتیاں) طلب کرنے آتے ہیں۔ تو آپ انہیں جواب دے دیتے ہیں۔ جس پر مجاہدین کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ (۹۳:۹) اور یہ جنگ تبوک آپ کی وفات سے صرف ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ گویا اس وقت تک حکومت بھی فقیر و مسکین تھی اور مسلمان بھی جن کے پاس اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اب فرمایئے فقیر و مسکین جنت میں جا سکتے ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر جو مسلمان اس دوران فوت ہوئے ان کے متعلق کیا خیال ہے؟

جنت میں فقراء کی کثرت کیوں؟: اب سوال یہ ہے کہ فقراء جنت میں کیوں زیادہ ہوں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

① انبیاء پر سب سے پہلے یہی فقیر و مسکین لوگ ایمان لاتے' نبیوں کا ساتھ دیتے' مصیبتیں برداشت کرتے اور جہاد میں شامل ہوتے ہیں۔ مترفین یا خوشحال طبقہ صرف اس وقت اسلام لاتا ہے جب وہ ہر طرف سے مجبور ہو جاتا ہے۔

② قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ حساب لیں گے تو دو بنیادی سوالات یہ بھی ہوں گے کہ اس نے مال کن کن ذرائع سے حاصل کیا۔ بیشتر خوشحال طبقہ تو اس امتحان میں ہی ناکام رہے گا۔ اور جو کامیاب رہیں گے یعنی مال حلال طریقہ سے کمایا ہوگا۔ ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ مال کا حق بھی ادا کیا یا نہیں اور اس مال کو کن کن مدات میں خرچ کیا؟ اس امتحان میں بھی بہت سے خوشحال لوگ فیل ہو جائیں گے۔ اور جو تھوڑے سے باقی بچیں گے جو ہر طرح سے کامیاب ہوں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور فقیر و مسکین مالداروں سے پانچ سو سال پہلے اس لیے جنت میں جائیں گے کہ ان کے لیے ایسے حساب کتاب کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی گویا ان دو وجوہات کی بنا پر جنت میں فقیروں کی کثرت ہوگی۔ علاوہ ازیں فقیر ویسے بھی ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔

اختیاری فقر و مسکنت : جنگ احزاب کے بعد عرب کے مسلمانوں کی حیثیت برابر برابر کی تھی۔ فتح مکہ کے بعد بالادستی قائم ہو گئی۔ اس وقت اگر رسول اللہ چاہتے تو خوشحال زندگی بسر کر سکتے تھے۔ عوام نہ سہی لیکن ایک سربراہ مملکت تو ایسا کر سکتا ہے۔ مگر آپ نے پھر بھی ایسا نہیں کیا۔ اموال غنائم آئے تو ازواج مطہرات نے زیورات کا مطالبہ کر دیا۔ آپ پر یہ بات اتنی شاق گزری کہ آپ ﷺ نے ان سب بیویوں سے علیحدگی اختیار کر کے مسجد نبوی کے ایک حجرے میں جا ڈیرہ لگایا۔ اسی دوران آیات قرآنی نازل ہوئیں کہ "اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں اور اگر اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کی طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکی کرنے والوں کے لیے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔" (۳۳:۲۸-۲۹)

ان آیات سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

1. عورتوں کو زیور سے قدرتی محبت ہوتی ہے۔ پھر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا یہ مطالبہ مال غنائم کے دوران کچھ نامناسب بھی نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات رسول اللہ ﷺ پر شاق گزری کیونکہ یہ مسکنت اور فقیری کے خلاف تھی۔
2. آپ کی یہ مسکنت اضطراری نہیں بلکہ اختیاری تھی۔
3. آپ کا مسکنت اختیار کرنے کا یہ طرز عمل اللہ تعالیٰ نے بھی پسند کیا۔ کیونکہ وحی الٰہی نے آپ ہی کے خیال کی تائید کی۔
4. فلاح آخرت کے لیے دنیوی خوشحالی ہرگز ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے اس نظریہ کو اسباب زوال امت میں بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور ہم نے اپنے سابقہ مضمون "عجمی سازش"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

میں بھی اس پر قدرے روشنی ڈالی ہے۔

اضطراری مسکنت اور اختیاری مسکنت : پرویز صاحب فرماتے ہیں۔

"ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ کو مسکنت اور مساکین اتنے محبوب تھے کہ آپ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے بطور مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حالت میں موت دے اور مجھے قیامت کو مسکینوں کے گروہ میں شامل رکھنا۔" مسکنت ایسی چیز ہے جسے قرآن نے خدا کا عذاب بتایا ہے۔ یہودیوں کے متعلق کہا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ..... (م- ح ص۲۲۵)

اب دیکھئے رسول اللہ کی مسکنت اختیاری تھی اور یہ انسانیت کا انتہائی بلند مقام ہے۔ کہ انسان تمام مالی وسائل کے ہوتے ہوئے ان سے کنارہ کش رہے اور ان مالی وسائل کو اپنے بجائے دوسروں کی ضروریات پر خرچ کر دے اور خود دنیوی عیش و عشرت اور شان و شوکت سے پرہیز کرے اور منکسر المزاج رہے اور فقیروں جیسا اور ان کے ساتھ مل کر رہنے کو ترجیح دے اور اضطراری مسکنت کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان کے پاس وسائل معاش موجود ہی نہ ہوں ایسی مسکنت نہ خوبی ہے نہ نقصان۔ اس لحاظ سے بہتر بھی ہے کہ ایسے لوگ آخرت میں مال و زر کی جوابدہی سے بچ جائیں گے۔ اور اضطراری مسکنت کی بدترین قسم وہ ہے جس کا پرویز صاحب نے ذکر فرمایا جس کے ساتھ ذلت بھی شامل ہے۔ اب خود ہی سوچ لیجیے کہ رسول اللہ کی مسکنت کو یہودیوں کی مسکنت کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حیرانگی کی بات ہے کہ طلوع اسلام جب اپنے نظام ربوبیت کا ذکر کرے تو رسول اللہ کی یہ ادا اسے بہت پسند آتی ہے۔ کہ جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کا ذاتی سامان کچھ بھی نہ تھا پھر جب وہ اس نظام ربوبیت کے دائرہ سے نکل کر حصول جنت کی طرف آتا ہے۔ تو یہی بے مانگی یا مسکنت اسے مکروہ ترین چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔

کمزوری اور ذلت : اب پرویز صاحب کے ان الفاظ کو پھر سامنے لایئے۔ کہ "انہوں (مخالفین) نے اس قسم کی احادیث وضع کرنا شروع کر دیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف و ناتواں ہیں۔ جن پر محتاجی و مفلسی چھائی رہتی ہے۔ جو کمزوری و بے چارگی کے مجسّمے ہیں جو دنیا میں ذلیل و خوار ہوں۔" (ایضاً)

ایسے مضامین پر مشتمل کوئی حدیث ہماری نظر سے نہیں گذری جس میں مذموم اور ذلیل صفات و اخلاق کو جنت سے وابستہ کیا گیا یا شرط قرار دیا گیا ہو البتہ اس مضمون سے ملتی جلتی ایک آیت قران میں موجود ہے۔ جس سے ممکن ہے پرویز صاحب نے ایسا غلط مطلب اخذ کر لیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فرقان کے آخر میں اپنے خاص بندوں کی علامات بتائی ہیں۔ پہلی علامت یہ ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ﴾ (الفرقان ۲۵/ ۶۳) "اور اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر انکساری کے ساتھ چلتے ہیں۔"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اس آیت میں لفظ هَون ہے هُون نہیں هَون کا معنی انکساری اور تواضع ہے۔ یہ صفت محمود ہے جب کہ هُون کے معنی ذلت وخواری ہے اور یہ مذموم صفت ہے۔ انکساری کی صفت تکبر کے مقابلہ میں آئی ہے۔ کہ تکبر اور متکبرانہ چال اللہ کو نہایت ناپسند ہے۔ اسی طرح ایسی چال جس سے کمزوری ظاہر ہو وہ بھی اسلام میں ناپسند ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کو ایسی حالت میں دیکھا تو اسے درہ سے پیٹا اور کہا کہ سیدھے ہو کر چلو۔ اسلام کمزور دین نہیں ہے۔ اب پرویز صاحب نے ایک تو لفظ هَون کی ترجمانی هُون سے فرمائی۔ پھر اسے نہایت چابکدستی سے حدیث کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔

خلوت گزینی : خلوت گزینی کا اصلاً موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی آپ نے کوئی ایسی روایت درج فرمائی کہ خلوت گزینوں کو بھی آسانی سے جنت مل جاتی ہے تاہم آپ نے اس موضوع کو بھی لاگھسیڑا ہے فرماتے ہیں:

"قرآن نے مومنوں کو فرمایا تھا کہ تم شهداء عَلَى النَّاس ہو۔ یعنی تمام بنی انسان کے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا تمہاری ذمہ داری ہے..... ابوداؤد میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا جب لوگوں میں وعدہ اور اقرار کا وزن گھٹ جائے گا۔ امانت کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔ پھر انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر حاضرین کو بتایا کہ فتنے اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے جس طرح بوریا بنا جاتا ہے۔ ابن عباس نے کہا کہ ایسے وقت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ فرمایا اپنے گھر میں بیٹھ اور اپنی خطاؤں پر رویا کر' نیکی اختیار کر' بدی کو چھوڑ' اپنی جان کو دوزخ سے بچا اور پبلک زندگی سے الگ ہو جا۔" (م۔ ح ص ۲۲۷)

اب دیکھئے اسلام اگرچہ ایک معاشرتی دین ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس میں رہبانیت کلیتاً حرام قرار دی گئی ہو۔ اس روایت میں بھی اضطراری صورت حال کا ذکر ہے۔ یعنی جب پرفتن دور ہو جائے اور معاشرتی زندگی میں انسان کو اپنا ایمان بچانا بھی مشکل ہو جائے تو پھر ایسی صورت میں یہ راہبانہ زندگی ہی بہتر ہوگی۔ آخر رسول اللہ پر پہلی وحی اس وقت نہیں آئی جب آپ غار حرا میں خلوت گزیں تھے؟

خدا معلوم کہ پرویز صاحب قرآن کے صرف ایک پہلو پر ہی کیوں نظر ڈالتے ہیں۔ انہیں لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ تو نظر آگیا لیکن۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۷۳:۸) اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور تمام دنیوی علائق سے قطع تعلق کر کے اس کی طرف رجوع کرو۔ کیوں نظر نہیں آتی؟ پھر قرآن میں عمران کی بیوی کا اپنے بچے کو اللہ کے حضور نذر کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس نذر کو قبول کرنے کا بھی (۳:۳۵ تا ۳۷) تو کیا یہ رہبانیت نہیں؟ حضور اکرم ﷺ غار حرا میں کیا کرتے تھے؟ مسلمان مکہ کی ابتدائی زندگی اپنے گھروں میں خلوت گزین رہتے تھے یا نہیں اور پھر اجتماعی حیثیت سے تین سال تک دار ارقم میں خلوت گزیں رہے۔ کیا ان سب باتوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ بعض حالات میں خلوت گزینی ہی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

بہتر رہتی ہے اور اسلام میں رہبانیت کلیتاً حرام نہیں ہے؟

جنت کی راہ میں رکاوٹیں : پرویز صاحب کو حدیث کی رو سے جنت میں داخلے کی سہولتیں تو نظر آگئیں لیکن مشکلات نظر نہیں آتیں۔ مثلاً یہ کہ حسد نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو یا یہ کہ نماز کا تارک کافر ہے۔ یا یہ کہ چغل خور' خائن' چور' زانی' جھوٹی قسمیں کھانے والا احسان جتانے والا۔ یا غرور سے دامن گھسیٹ کر چلنے والا دوزخ میں جائیں گے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرے گا۔ یا یہ کہ اگر انسان کا خاتمہ خیر پر ہو تو مغفرت ہو جائے گی۔ ورنہ ساری زندگی کے کئے اعمال اکارت جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ بس طلوع اسلام کا موڈ ہی ہے جس طرف رخ کر لیتا ہے تو وہ اسے بہت نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

فضائل اعمال کی حقیقت : آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض محدثین اور ناقدین فن حدیث خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے فضائل اعمال کی روایات' خواہ ان کا تعلق تلاوت قرآن سے ہو یا کسی خاص سورہ کی فضیلت سے یا ان میں کسی خاص عمل کے اجر وثواب کا ذکر ہو۔ کی ایسے چھان پھٹک نہیں کی' جیسے احکام سے متعلق روایات کی' کی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے اعمال کا اجر وثواب دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کبھی تو کسی نیکی کا اجر اس سے دس گنا دیتے ہیں (۶:۱۶۰) پھر کبھی اس سے بھی زیادہ حتیٰ کہ یہ اجر وثواب سات سو گنا تک بھی پہنچ سکتا ہے (۲:۲۶۱) پھر اس پر بھی معاملہ ختم نہیں ہوتا۔ اور اللہ بے حد وبے حساب بھی دے سکتا ہے۔ اور یہ اجر وثواب کی کمی وبیشی عمل کرنے والے کے حالات اور درجہ خلوص نیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اب جہاں دینے والا خود اللہ تعالیٰ ہو جو دلوں کے راز تک کا واقف ہے اور لینے والا بندہ ہو تو اس معاملہ میں کوئی تحقیق کر بھی کیا سکتا ہے؟ تاہم محدثین نے اس میدان کو بھی بالکل کھلا نہیں چھوڑا۔ ان کے ہاں روایت کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک یہ شرط بھی ہے کہ "ہر ایسی حدیث جس میں چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو" وہ موضوع ہوتی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب : ہفتم

بخاری کی قابلِ اعتراض احادیث

اس مضمون میں طلوع اسلام نے بخاری میں ایسی تمام احادیث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر یک جا کر دیا ہے جن پر عقل یا سائنس کی رو سے گرفت کی جا سکتی ہے۔ یا طلوع اسلام کے خیال کے مطابق ان سے رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کی سیرت داغدار ہوتی ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر حرف آتا ہے۔ یا اس سے عورت کی شان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور آخر میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس قسم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں۔

اس عنوان کے تحت آپ نے چالیس احادیث درج فرمائی ہیں (اور وہ بھی صرف اردو ترجمہ ہے) اصل متن درج نہیں فرمایا۔ نہ ہی ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا ذکر فرمایا ہے۔ بلکہ اس بات کو انہوں نے قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ منکرین حدیث کا لٹریچر چونکہ اکثر میرے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ لہٰذا ان احادیث پر ممکنہ اعتراضات بھی خود ہی تشخیص کیے ہیں اور پھر ان اعتراضات کے جوابات سپرد قلم کیے گئے ہیں۔

البتہ طلوع اسلام کا یہ دعویٰ کہ "اس قسم کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ غلط معلوم ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ اگر اسے اور بھی بہت سی احادیث مل جاتیں تو انہیں درج کرنے سے کبھی نہ چوکتا۔ اس کے برعکس اس نے کیا یہ ہے کہ بہت سی ایسی احادیث بھی درج کر دیں جن کو وہ "تفسیر بالحدیث" یا دوسرے عنوانات کے تحت پہلے درج کر چکا ہے۔ پھر ان چالیس احادیث میں سے بہت سی ایسی ہیں جو نہ تو اقوال وافعال رسول ہیں نہ ہی منسوب الی الرسول بلکہ وہ کسی صحابی یا تابعی کا قول ہے۔ نیز ایک حدیث مسلم کی بھی درج کر کے یہ چالیس کی تعداد پوری کی گئی ہے۔ طلوع اسلام نے ان احادیث کے نمبر نہیں لگائے۔ یہ ہم نے اپنی طرف سے لگا دیئے ہیں تاکہ ایسی قابل اعتراض احادیث کی پوری تعداد معلوم ہو سکے۔ گویا بخاری کی چھ سات ہزار احادیث میں سے آپ کو انتالیس احادیث ایسی ملی ہیں جو آپ کے خیال کے مطابق قابل اعتراض تھیں۔ گویا اوسطاً آپ کو پونے دو سو احادیث میں سے ایک حدیث قابل اعتراض ملی۔ باقی ۱۷۴ پر آپ گرفت نہیں فرما سکے۔ پھر عجب بات یہ ہے کہ اس ایک قابل اعتراض حدیث کی وجہ سے ۱۷۴

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

درست احادیث کو ٹھکرا دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ پھر اگر اس ۳۹ کے عدد میں سے اقوال صحابہ اور تابعین کو الگ کر دیا جائے تو یہ نسبت اور بھی کم رہ جائے گی۔ اب ہم ان چالیس احادیث کو اپنے جوابات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

① پتھر کپڑے لے کر بھاگ گیا

یہ بحث پہلے "تفسیر بالحدیث" کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔ صرف عنوان بدلا گیا ہے۔ وہاں اس کا عنوان ہے "موسیٰ اور بنی اسرائیل" اور یہاں عنوان ہے "پتھر کپڑے لے کر بھاگ گیا۔" چونکہ حدیث ایک ہی ہے لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

② ملک الموت کے طمانچہ مارا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "ملک الموت حضرت موسیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ جب وہ آیا تو حضرت موسیٰ نے اس کے ایک طمانچہ مارا کہ اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی اور وہ اپنے پروردگار کے پاس واپس گیا اور عرض کیا کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ دوبارہ اسے عنایت فرمائی اور حکم دیا کہ پھر جا اور ان سے کہہ کہ وہ اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھیں۔ پس جس قدر بال ان کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے۔ ہر بال کے عوض ایک سال کی زندگی انہیں دی جائے گی (فرشتہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام الٰہی سنایا) انہوں نے کہا کہ اے پروردگار پھر کیا ہو گا؟ اللہ نے فرمایا کہ پھر موت آئے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ تو پھر ابھی سہی۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ انہیں ارض مقدس سے بقدر ایک پتھر پھینکنے کے قریب کر دے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ بیان فرما کر) مزید کہا کہ اگر میں اس مقام پر ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر راستہ کی طرف سرخ ٹیلے کے پاس دکھا دیتا۔" (م۔ ح ص ۳۱۵)

اب اس بات سے تو غالباً طلوع اسلام کو بھی انکار نہ ہو گا کہ:

1. موت کا فرشتہ تمام جانداروں اور اسی طرح تمام انسانوں کی روح قبض کرتا ہے (۱۱:۳۲) جس سے اس کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص ثابت ہوتا ہے۔
2. عام فرشتوں سے عام مومن افضل ہوتے ہیں۔ اور مقرب فرشتوں سے مقرب مومن کیونکہ فرشتوں میں شر کا مادہ پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ اور ان کی عبادت بھی تعبدی یا اضطراری ہوتی ہے پھر انبیاء کا درجہ تو مقرب فرشتوں سے بھی بہت بلند ہوتا ہے۔
3. فرشتے انبیاء اور غیر انبیاء کے پاس انسانی شکل میں بھی آسکتے ہیں۔" (۱۹:۱۷)

گویا ملک الموت کا حضرت موسیٰ کے پاس ان کی روح قبض کرنے کے لیے انسانی شکل میں آنا ممکن

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ ملک الموت سے افضل ہی سہی، مگر جب کسی دوسرے نبی نے ملک الموت کو کچھ نہیں کہا تو موسیٰ علیہ السلام نے کیوں طمانچہ مار دیا۔ حالانکہ وہ خدا کا فرستادہ تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسی جلالی طبیعت آپ نے پائی تھی اور کسی نبی کی نہ تھی۔ یہ آپ کی جلالی طبیعت ہی کا کرشمہ تھا کہ ایک سبطی کی شکایت پر طبیعت میں ذرا ملال آیا تو ایک ہی مکا سے ایک قبطی کا قصہ پاک کر دیا۔ آپ کا ارادہ اسے مار ڈالنے کا ہرگز نہ تھا مگر طبیعت ہی ایسی جوشیلی پائی تھی اور قوت بھی کہ وہ قبطی آپ کا ایک مکا بھی برداشت نہ کر سکا اور آگے چل بسا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس قتل کا حضرت موسیٰ سے کچھ مواخذہ بھی نہیں کیا بلکہ معاف کر دیا۔

اب اگر قران میں مذکور واقعہ قتل کو ہم بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں حالانکہ آپ کو اس وقت اس سبطی کے ہلاک کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ تو پھر اس واقعہ کو تسلیم کرنے میں آخر کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ کو یہ جلال کس بات پر آیا تھا؟ تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں کہ فرشتہ کے جان نکالنے کی بناء پر آپ کو طیش آگیا تھا۔ کیونکہ اگر یہی بات ہوتی تو دوسری بار حضرت موسیٰ ایک لمبی عمر کی پیش کش کے باوجود فورا جان حاضر کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ فرشتہ انسانی شکل میں بغیر اذن کے آپ کے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ اس بات پر موسیٰ علیہ السلام کو طیش آگیا۔ اور کچھ کہے سنے بغیر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا تو درکنار صرف جھانکنا بھی شریعت کی نگاہ میں ایسا شدید جرم ہے کہ اگر صاحب خانہ کنکری وغیرہ سے جھانکنے والے کی آنکھ بھی پھوڑ دے تو اس پر کوئی حرجانہ نہیں پڑتا۔ گویا ملک الموت کا انسانی شکل میں بلا اجازت گھر میں داخل ہونا موسیٰ کے اس فعل کا محرک ہوا تھا۔

③ حضرت سلیمان علیہ السلام اور سو عورتوں کا دورہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام بن داؤد علیہ السلام نے ایک دفعہ کہا:

"آج شب میں سو یا ننانوے بیویوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کریں گے۔ کسی ہم نشین نے کہا کہ انشاء اللہ کہو۔ مگر آپ بھول گئے پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی۔ وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو سب عورتوں کے بچے ہوتے اور بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔" (مقام حدیث ص ۳۰۵)

اب دیکھئے حدیث بالا میں دو باتیں ہی طلوع اسلام کے نزدیک قابل اعتراض ہو سکتی ہیں۔ ایک ننانوے یا سو بیویوں کا ہونا۔ دوسرے ایک رات میں ان سب کے پاس جانا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

جہاں تک بیویوں کی تعداد کا تعلق ہے۔ تو رات سے حضرت داؤد علیہ السلام کی ۹ بیویاں اور دس حرمیں (کل تعداد انیس) ثابت ہیں (۲ سموئیل ۵/۱۳) اور حضرت سلیمان کی سات سو جوروئیں اور ۳۰۰ حرمیں' (کل ایک ہزار) ثابت ہیں۔ (سلاطین ۱۱/۳) بحوالہ رحمۃ للعالمین از سلمان منصور پوری۔ ج ۲ ص ۱۳۰) اور ان کی کثرت زوجات کی وجہ سے عیسائیوں نے ان انبیاء کی تقدیس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اگر اس حدیث میں ننانوے یا سو بیویوں کا ذکر آگیا ہے۔ تو اس میں اور کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک عظیم بادشاہ تھے جن کا محل بھی تھا اور اس محل میں شیشے کا فرش کچھ اس طرح لگا ہوا تھا کہ وہ پانی کی لہریں مارتا سمندر ایک حوض میں بند معلوم ہوتا تھا۔ ہوا اور جنات آپ کے مسخر تھے۔ پرندوں کی بولی سمجھتے اور انہیں بات سمجھا سکتے تھے۔ پھر آپ کا تخت ہوا میں اس تیزی سے اڑتا کہ ایک مہینہ کی مسافت ایک پہر میں طے کر لیتا۔ پھر آپ نے نہایت اعلیٰ قسم کے گھوڑے بھی لاتعداد رکھے ہوئے تھے۔ اس شاہانہ شان وشوکت اور کروفر' ٹھاٹھ باٹھ کے باوجود آپ خلیفہ بھی تھے اور نبی بھی۔ اگر یہ سب باتیں قرآن سے ثابت ہوں تو پھر ان کے حرم میں ننانوے یا سو بیویوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

رہی یہ بات کہ کوئی انسان ایک رات میں اتنی بیویوں کے پاس جا بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اندازا جماع کے وقت میں انزال کے لیے صرف تین منٹ درکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات بھی کوئی محیر العقول اور خلاف عقل نہیں جس کا وقوع ناممکنات سے ہو۔ علاوہ ازیں اگر ہم قرآن کی رو سے دوسری بہت سی معجزہ کی قسم سے تعلق رکھنے والی "غیر معقول" باتیں تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اس بات کو بھی تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے؟ یہ بات بھی تو آخر نبی ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

④ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ

حضرت ابو ہریرہ علیہ السلام کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے اپنا ختنہ بسوئے سے کیا۔ اور وہ اس وقت ۸۰ برس کے تھے۔" (مقام حدیث ص۳۰۵) اس حدیث پر غالباً یہی اعتراض ہو سکتا ہے کہ آپ نے ۸۰ برس کی عمر یعنی بڑھاپے میں ختنہ کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ایک کافر کے ہاں پیدا ہوئے۔ لہٰذا بچپن میں ختنہ کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ۷۵ سال کی عمر میں آپ نے ہجرت فرمائی۔ اس سے پیشتر توحید اور بنیادی عقائد دین آپ پر نازل ہوتے رہے۔ اور آپ ان کی تبلیغ کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد احکام شریعہ کا نزول شروع ہوا۔ پھر جب ختنہ کا حکم نازل ہوا تو اس وقت آپ نے ختنہ کیا آپ اسّی سال کی عمر میں کچھ ایسے بوڑھے بھی نہ تھے کیونکہ اس دور میں انسان کی طبعی عمر آج سے کافی زیادہ تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۱۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑤ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے کبھی جھوٹ نہ بولا سوائے تین مرتبہ کے۔ دو مرتبہ تو خدا کے واسطے ان کا یہ کہنا کہ اِنی سقیم اور یہ کہنا کہ بَلْ فَعَلَهٗ کبیرھم ھذا یہ دونوں تو خدا کے لیے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن اس حال میں کہ وہ اور سارہ جا رہے تھے کہ ایک ظالم بادشاہ پر ان کا گزر ہوا۔ کسی نے اس بادشاہ سے کہا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے ساتھ اس کی خوبصورت بیوی بھی ہے۔ اس بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلوا بھیجا اور سارہ کی بابت پوچھا کہ یہ کون ہے؟" ابراہیم علیہ السلام نے کہہ دیا کہ میری بہن ہے۔ پھر وہ سارہ کے پاس گئے اور کہا کہ اے سارہ! روئے زمین پر میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ اور اس ظالم نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ میری بہن ہے پس تم مجھے جھوٹا نہ کرنا....." الحدیث (م- ح ص۳۱۶)

اس حدیث پر اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صدیق کہا ہے۔ یہ روایت آپ کے تین جھوٹ بتاتی ہے اب دیکھئے کہ:

① ان تین جھوٹوں میں سے دو کا ذکر تو قران کریم میں موجود ہے۔ بتوں کو توڑا تو آپ نے تھا۔ لیکن پوچھنے پر یہ کہہ دیا کہ اس بڑے بت نے انہیں توڑا ہے۔ اسی طرح جب ان کی قوم جشن منانے کو نکلی تو آپ کو ساتھ جانے کو کہا تو آپ نے کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ پھر اسی وقت جا کر ان کے بت بھی توڑ ڈالے تو بیمار کیسے تھے۔ کیا یہ باتیں خلاف واقعہ نہیں؟ لہٰذا معترضین کا اصلی رخ قرآن کی طرف ہونا چاہیئے نہ کہ حدیث کی طرف۔

② رسول اللہ نے خود ابتداءً یہ الفاظ فرمائے کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہ بولا" یہ ان کے فی الواقع صدیق ہونے کی بہت بڑی شہادت ہے کہ ان سے ۱۷۵ سال کی زندگی میں تین سے زیادہ مرتبہ جھوٹ سرزد نہیں ہوا۔ اب آپ اپنی زندگی کے شب و روز پر نگاہ ڈالیے کہ اپنی ساری زندگی میں نہیں صرف ایک دن رات میں کتنے جھوٹ بولتے ہیں۔ دانستہ بھی اور نادانستہ بھی اور پھر خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ اگر ۱۷۵ سال کی زندگی میں کسی سے تین سے زیادہ جھوٹ سرزد نہ ہوں اس کو صدیق کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پھر ان تینوں واقعات کے لیے ٹھوس بنیادیں بھی موجود ہیں مثلاً:

③ ان میں سے دو جھوٹ تو ایسے ہیں جو مشرکین پر حجت قائم کرنے اور کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے آپ نے بولے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ اور تیسرا جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ آپ نے اپنی جان بچانے کے لیے بولا تھا۔ شاہ مصر کا دستور یہ تھا کہ ہر حسین عورت کو زبردستی چھین لیتا۔ اگر اس کے ساتھ اس کا خاوند ہوتا تو اسے مروا ڈالتا۔ لیکن اگر بھائی یا کوئی دوسرا رشتہ دار ہوتا تو اس سے عورت تو چھین لیتا لیکن اس کی جان سے درگزر کرتا تھا۔ اب اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

بول لیا۔ تو آخر اس میں قیامت کونسی آگئی؟ جان بچانے کی خاطر اگر مردار تک کھالینا جائز ہے تو آخر جھوٹ بولنا کیوں جائز نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ کون سی شریعت ہے جس میں اس قدر سختی روا رکھی گئی ہو۔ جان بچانے کی خاطر تو اللہ تعالیٰ نے کلمہ کفر تک کہہ دینے کی بھی اجازت دی ہے۔ بشرطیکہ دل میں کوئی بات نہ ہو (۲۸:۳) تو پھر کیا جھوٹ بولنا اس سے بڑا جرم ہے؟

⑥ گرگٹ کو مارنا

حضرت ام شریک سے روایت ہے کہ "رسول اللہ نے گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم پر آگ روشن کرتی تھی۔" (م۔ ح ص ۳۱۷)

سمجھا یہ جاتا ہے کہ گرگٹ کو مارنے کی وجہ ہی آپ نے یہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ روشن کرتی تھی لہٰذا اس جرم کی پاداش میں اس کا مارنا ضروری ہے حالانکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ بھی موذی جانور ہے۔ اور موذی جانور کو حدیث میں فویسق کہا گیا ہے۔ اور گرگٹ کو بھی انہیں میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں مروی ہے۔

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِلْوَزَغِ الْفُوَيْسِقُ» "یعنی نبی ﷺ نے گرگٹ کو بھی فویسق (موذی جانور) کہا ہے۔ (بخاري، كتاب بدء الخلق)

اور موذی جانوروں کو عام حالات تو درکنار مسجد حرام میں مار ڈالنے کا حکم ہے۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً) اس حدیث میں اس کے آگ روشن کرنے کے فعل کو ضمناً ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے بھی واضح ہے۔

ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ گرگٹ نے حضرت ابراہیم کا کیا بگاڑا تھا۔ جو یہ درپے آزار ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جانور موذی ہی کیا ہوا۔ جو بگاڑنے کے لیے کسی وجہ کا انتظار کرے؟ بچھو کسی کو اس لیے نہیں کاٹتا کہ کسی نے اس کا کچھ بگاڑا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کاٹتا ہے کہ ڈنگ مارنا اور ایذا دہی اس کی فطرت میں داخل ہے۔

گرگٹ کا طریق ایذا رسانی یہ ہے کہ یہ اپنی لمبی زبان سے دور سے تھوکتی ہے۔ اس کے منہ کا لعاب زہریلا ہوتا ہے جس سے کیڑے مکوڑے مرجاتے ہیں پھر اس کی خوراک بنتے ہیں۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ گرگٹ نے اپنے پھونکنے یا نفخ سے آگ میں کیا اضافہ کیا تھا۔ یہ ہم نہیں جانتے البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس میں تین چار خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتیں مثلاً یہ جانور ماحول کے مطابق فوراً اپنا رنگ بدل سکتا ہے اور اس کی یہ خاصیت اتنی مشہور ہے کہ "گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا" ضرب المثل بن چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی آنکھیں پپوٹوں میں ملفوف ہوتی ہیں جن میں سوراخ ہوتے ہیں۔ انہی سوراخوں میں سے یہ دیکھتی ہے تیسرے یہ کہ یہ آگے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پیچھے دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف دیکھ سکتی ہے اور چوتھے یہ کہ اگر اس کے جسم کا پچھلا دھڑ کٹ جائے تو بھی وہ بہت دیر تک متحرک اور زندہ رہتا ہے۔ اور کیا معلوم کہ اس کا یہ لعاب دہن آگ کے شعلوں کو بھی تیز کرتا ہو۔

⑦ حضرت آدم علیہ السلام کا قد

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز تھا۔ پھر برابر اب تک یہ قد کم ہوتا رہا۔" (مقام حدیث ص ۳۱۷)

اب دیکھئے اس حدیث میں دو باتیں غور طلب ہیں:

① حدیث میں ذراع کا لفظ ہے جس کے معنی "ہاتھ" ہے نہ کہ "گز" اور ہاتھ کی اوسط لمبائی ۱/۲-۱ فٹ ہوتی ہے۔ لیکن ترجمہ بالا میں ذراع کا معنی گز کر لیا گیا ہے۔ اصل ترجمہ کی رو سے یہ ساٹھ ہاتھ یا ۳۰ گز بنتا ہے۔

② قد اور عمر دونوں چیزیں ایسی ہیں جو ابتداءً بہت زیادہ تھیں لیکن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر بھی ایک ہزار سال تھی۔ لیکن بعد کے ادوار میں انسانی عمر بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میری امت کی اوسط عمر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہے اور یہ عمر ہزار سال کا پندرہواں حصہ بنتی ہے۔ اب اگر ۳۰ گز قد کا پندرہواں حصہ لیا جائے تو یہ دو گز یا ۶ فٹ رہ جاتا ہے۔ اور تقریباً یہی قد آج کل پایا جاتا ہے۔ کسی علاقہ کے لوگ چھ فٹ سے بلند ہیں تو کسی دوسرے علاقہ میں چھ فٹ سے قدرے کم ہوتے ہیں۔ اب اگر عمر کے تناسب کا ثبوت قرآن سے مل جاتا ہے تو پھر اگر قد کا وہی تناسب حدیث سے ثابت ہو تو اس میں اعتراض یا حیرانگی کی کوئی معقول وجہ ہمیں نظر نہیں آتی۔

⑧ نمازیں کیسے فرض ہوئیں؟

اعتراضات کا جائزہ : معراج کا واقعہ اور اس موقعہ پر نمازوں کے فرض ہونے کا ذکر اتنا مشہور ہے کہ اس کے درج کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس حدیث پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث کسی یہودی کی گھڑی ہوئی ہے۔ جس نے حضرت موسیٰ کی شان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلند کر کے دکھایا ہے۔ اس اعتراض کا جواب ہم "تفسیر بالحدیث" کے ذیلی عنوان "سیرت یوسفی" میں دے چکے ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار پچاس نمازیں فرض کر دیں۔ اور اس بات کا علم نہ اللہ کو ہوا نہ رسول کو کہ امت محمدیہ پچاس نمازوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر اس طرف توجہ دلائی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چنانچہ آپ بار بار خدا کے ہاں حاضر ہوتے اور تخفیف کراتے رہے تا آنکہ پانچ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نمازیں باقی رہ گئیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو ضرور علم تھا۔ مگر احسان وکرم مقصود تھا۔ اور اس کی صورت یہ ہی تھی کہ پہلے زیادہ بار ڈالا گیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی التجا پر کمی کی جاتی رہی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں ایمان کی پختگی کا معیار یہ قرار دیا کہ میدان جنگ میں ایک مومن کو دس کافروں پر غالب آنا چاہئے (۶۵:۸) لیکن اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں فرمایا۔

﴿ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (الأنفال۸/ ٦٦)

"اب اللہ نے تم پر سے (بوجھ) ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔"

اب دیکھئے یہ دونوں آیات سورہ انفال کی ہیں اور متصل ہیں۔ پہلی میں معیار ایمان کی نسبت ۱۰:۱ ہے۔ پھر ساتھ ہی اس میں اتنی تخفیف کر دی کہ یہ نسبت ۲:۱ یا پانچواں حصہ رہ گئی اب یہ اعتراض تو قرآن پر بھی ہونا چاہیئے کہ اللہ کو (نعوذ باللہ) اتنا بھی علم نہ تھا کہ پہلی آیت میں اتنا کڑا معیار رکھ دیا۔ پھر ساتھ ہی اس میں اتنی زبردست تخفیف بھی کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں بھی رحم وکرم خسروانہ کی بات ہے اور نیز یہ کہ اگر پہلے زیادہ بار ڈال کر تخفیف کر دی جائے تو بندے اللہ کے زیادہ ممنون ومشکور ہوتے ہیں اور یہی بات حدیث معراج کی بھی ہے۔ حالانکہ اللہ کو ان دونوں باتوں کا پہلے سے علم تھا۔

تیسرا اعتراض اس حدیث پر یہ کیا جاتا ہے کہ جب آخر میں پانچ نمازیں رہ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (میرے ہاں بات نہیں بدلا کرتی) حالانکہ بات کئی بار بدلی۔ پہلے پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ پھر چالیس رہ گئیں پھر تیس' پھر بیس' پھر دس' پھر پانچ' یعنی پانچ بار تو بات بدل گئی۔ پھر بات بدلنا اور کسے کہتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "القول" سے مراد نہ نمازوں کی تعداد ہے اور نہ احکام شریعت کی بلکہ یہاں القول سے مراد حسنات کا وہ اٹل قانون ہے جسے اللہ نے خود یوں بیان فرما دیا ہے۔

"جو نیکی کرے گا اس کو اس نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا۔"

چنانچہ اسی روایت میں مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ کی وضاحت بھی ان الفاظ میں موجود ہے وَهِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُوْن یعنی ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس نمازوں کے برابر ہی ملے گا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑨ حضور ﷺ پر جادو

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ "(ایک مرتبہ) رسول اللہ پر جادو کیا گیا۔ (اس کا اثر) یہاں تک ہوا کہ آپ کا خیال ہوتا تھا کہ ایک کام کیا ہے۔ حالانکہ آپ نے کیا نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن آپ نے اللہ سے بہت دعا کی بعد اس کے مجھ سے فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بات بتا دی جس میں میری شفا ہے۔ دو آدمی (خواب میں) میرے پاس آئے ان میں سے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ دوسرے نے کہا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر پہلے نے کہا۔ کس نے جادو کیا؟ دوسرے نے کہا۔ لبید بن عاصم نے۔ پہلے نے کہا کس چیز میں؟ دوسرے نے کہا کنگھی میں اور روئی کے گالے میں اور نر کھجور کی کلی کے اوپر والے چھلکے میں۔ پہلے نے کہا وہ کہاں ہے؟ دوسرے نے کہا۔ ذروان (نامی) کنوئیں میں۔ پس وہاں نبی ﷺ تشریف لے گئے بعد اس کے جب لوٹے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ اس کنوئیں کے قریب والے درختوں کے خوشے گویا شیاطین کے سر ہیں میں نے کہا آپ ﷺ نے اس کو نکلوا لیا؟ فرمایا اللہ نے مجھے شفا دے دی۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ لوگوں میں فساد پھیلے گا اور جادو کا چرچا زیادہ ہوگا اس کے بعد کنواں بند کر دیا گیا۔" (م۔ ح ص ۳۲۰)

اعتراضات اور ان کا جائزہ : اس حدیث پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ جادو چونکہ کفر و شرک کا کام ہے۔ لہٰذا نبی پر جادو نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر کوئی کرے بھی تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نبی پر جادو کا اثر ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ فرعون کے جادوگروں نے جب ہزار ہا لوگوں کے مجمع میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو اس کا اثر مجمع پر یہ ہوا کہ۔

﴿ قَالَ أَلْقُوا ۖ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُو بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾ ﴾ (الأعراف ۷/ ۱۱۶)

"جب جادوگروں نے (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا (یعنی ان کی نظر بندی کر دی) اور انہیں دہشت زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لائے۔"

اس دہشت کا اثر موسیٰ علیہ السلام کے دل پر بھی ہو گیا تھا ارشاد باری ہے:

﴿ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾ ﴾

"موسیٰ اپنے دل میں ڈر گئے تو ہم نے بذریعہ وحی کہا اے موسیٰ ڈرو مت تم ہی غالب رہو گے۔"

(طٰہٰ ۲۰/ ۶۷۔۶۸)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر نبی پر جادو کا اثر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شریعت ساری کی ساری

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ناقابل اعتماد ٹھہرتی ہے۔ کیا معلوم کہ نبی کا فلاں کام وحی کے تحت ہوا تھا یا جادو کے زیر اثر۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ سن ۷ھ (صلح حدیبیہ اور فتح خیبر وغیرہ) کے بعد پیش آیا جب کہ یہودی ہر میدان میں پٹ چکے تھے۔ پہلے خیبر کے یہودی خود ایک سال تک جادو کرتے رہے جس کا خاک اثر نہ ہوا۔ پھر وہ مدینہ میں لبید بن عاصم کے پاس اسی غرض سے آئے لبید بن عاصم سب سے بڑا جادوگر تھا۔ پھر اسکی دو بیٹیاں اس کام میں اس سے بھی زیادہ ماہر تھیں۔ اس نے اپنی بیٹیوں کی مدد سے آپ ﷺ کے بال حاصل کیے۔ پھر ان میں گانٹھیں دیتا اور منتر پڑھتا جاتا تھا۔ اور بڑا سخت قسم کا تاثیر والا جادو کیا۔ اس جادو کا بھی چھ ماہ تک آپ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ چھ ماہ بعد اس کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تاہم اس کا اثر محض آپ کے ذاتی افعال تک محدود تھا۔ یعنی آپ یہ سوچتے کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں جب کہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ذہنی کوفت اور بے چینی آپ کو چالیس دن تک رہی۔ تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیج کر اس کی حقیقت اور علاج بتا دیا۔ پھر آپ شفایاب ہوگئے یہ واقعہ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں میں باختلاف الفاظ مندرج ہے۔ اور اتنی کثیر روایات ہیں جو حد تواتر کو پہنچتی ہیں جن کا انکار محال ہے۔ لبید بن عاصم نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا۔ تاہم آپ نے اسے معاف کر دیا کیونکہ آپ نے ذاتی تکلیف کی بناء پر کسی سے کبھی انتقام نہیں لیا۔

اب اصل اعتراض کی طرف آیئے۔ تو یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ جادو شریعت کے احکام پر ہر گز اثر انداز نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اثر محض آپ کی ذاتی حیثیت تک محدود رہا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت تک آدھے سے زیادہ قرآن نازل ہو چکا تھا۔ عرب کے لوگ اس وقت دو متوازی فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ جن میں ایک فرقہ یا تو مسلمان تھا یا مسلمانوں کا حلیف اور دوسرا فرقہ ان کے مخالف۔ اگر اس دوران آپ ﷺ پر جادو کا اثر شریعت میں اثر انداز ہوتا۔ یعنی کبھی آپ نماز ہی نہ پڑھاتے یا ایک کے بجائے دو پڑھا دیتے یا قرآن کی آیات خلط ملط کر کے یا غلط سلط پڑھتے یا کوئی اور کام شریعت منزل من اللہ کے خلاف سرزد ہوتا تو دوست و دشمن سب میں یعنی پورے عرب میں اس کی دھوم مچ جاتی۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں ایک بھی ایسی روایت نہیں ملتی جس میں یہ اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو کہ اس اثر سے آپ کے شرعی اعمال وافعال میں کبھی حرج واقع ہوا ہو۔

اور تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کفار کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کو یا تو جادوگر کہتے تھے اور یا جادو زدہ (مسحور) کہتے تھے۔ اگر ہم خود ہی آپ پر جادو اور اسکی اثر پذیری تسلیم کر لیں تو گویا ہم بھی کفار کے ہمنوا بن گئے۔

یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ کفار کا یہ الزام ہوتا تھا کہ نبی نے اپنی نبوت کے دعویٰ کا آغاز ہی جادو کے اثر کے تحت کیا ہے۔ اور جو کچھ یہ آخرت' قیامت' حشر ونشر اور جنت دوزخ کے افسانے سناتا ہے یہ سب کچھ جادو کا اثر یا پاگل پن کی باتیں ہیں۔ گویا نبوت اور شریعت کی تمام تر عمارت کی بنیاد جادو قرار دیتے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ واقعہ آپ کی نبوت کے بیس سال بعد پیش آتا ہے جب کہ آدھا عرب آپ کی نبوت اور احکام شریعت کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر یہ واقعہ احکام شریعت پر بھی چنداں اثر انداز نہیں ہوا۔ البتہ اس واقعہ سے اس کے برعکس یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ آپ ہرگز جادوگر نہ تھے۔ کیونکہ جادوگر پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔

(۱۰) حضور ﷺ اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

انس رضی اللہ عنہ بن مالک کہتے ہیں کہ "رسول اللہ اپنی (تمام) بیبیوں کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے۔ اور وہ گیارہ تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں میں نے انس سے کہا۔ کیا آپ ﷺ ان سب کی طاقت رکھتے تھے؟ وہ بولے کہ ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی اور سعید نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے نو بیبیاں بیان کیں۔" (مقام حدیث ص ۳۲۰)

اس حدیث میں دراصل تین مختلف موقعوں کی باتیں یک جا بیان کر دی گئی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

- انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تمام بیبیوں کے پاس ایک ساعت رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے اور وہ گیارہ تھیں۔
- قتادہ کہتے ہیں میں نے انس سے کہا کہ کیا آپ اتنی طاقت رکھتے تھے؟ وہ بولے ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی طاقت ملی ہے۔
- سعید نے قتادہ سے نقل کیا کہ انس رضی اللہ عنہ نے نو بیبیاں بیان کیں۔ (یہ حدیث کتاب النکاح میں بالکل الگ سندوں کے ساتھ الگ طور پر بھی بخاری میں مذکور ہے) ان تینوں مختلف واقعات کی باتوں کو یکجا بیان کرنے سے کئی غلط فہمیاں یا اعتراض پیدا ہو گئے مثلاً (۱) آپ کی ازواج گیارہ تھیں یا نو؟ (۲) آپ روزانہ سب بیبیوں سے مجامعت کرتے تھے اور کر سکتے تھے کیونکہ آپ میں تیس مردوں کی طاقت تھی۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک ہی وقت میں رسول اللہ کی گیارہ بیویاں اور نو بیویاں نہیں کہہ سکتے تھے۔ اور قوت کے متعلق خود ان کا اپنا بیان ہے کہ ہم آپس میں یہ باتیں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اسی حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ تین مختلف مواقع کی باتیں ہیں۔

اعتراضات کا جائزہ: اب پہلی بات یہ ہے کہ دورہ کرنے سے مراد مجامعت ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ آپ یہ دورہ دن کے کسی وقت [1] بھی یا رات کو شب بسری سے پہلے کیا کرتے تھے۔ اور اس دورہ کا مقصد

---

[1] یہ دورہ عموماً عصر کی نماز کے بعد اور شام سے پہلے ہوتا تھا۔ (بخاری کتاب النکاح) پھر یا یہ دورہ شام اور عشاء کے درمیان ہوتا تھا حسب موقع و فرصت۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

صرف تمام گھرانوں کی خیر خیریت معلوم کرنا اور خانگی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ یعنی آپ نہایت مختصر وقت یا ایک ساعت میں سب گھروں سے چکر لگا آتے تھے۔ اور دورہ سے مجامعت مراد نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے تمام بیبیوں کے ہاں شب بسری کے لیے باری مقرر کر رکھی تھی۔ لہٰذا ایک ہی رات میں سب بیبیوں کے پاس اس غرض سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں روایت میں دن کا بھی ذکر ہے اور مجامعت عموماً رات کو کی جاتی ہے۔

دورہ سے مجامعت مراد لینے کی غلطی دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ساتھ ہی آپ کی قوت کا ذکر آگیا۔ تو اس قوت سے مراد قوت مردمی یا جماع کی قوت سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ جب آپ کی ایک ہی بیوی کے پاس شب بسری کی باری احادیث صحیحہ سے ثابت ہے تو یہاں قوت مردمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ساعت میں گیارہ گھروں میں خیر وعافیت کا معلوم کر آنا بھی چستی اور قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر آپ کی قوت اور شجاعت کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن کے متعلق صحابہ آپس میں ایسا تبصرہ کیا کرتے تھے مثلاً رکانہ پہلوان کو پچھاڑنا یا جنگ خندق میں پتھر کو پاش پاش کرنا وغیرہ۔

اب رہا مسئلہ ازواج مطہراتؓ کی تعداد کا تو یہ تعداد آپ کی وفات کے وقت نو ہی تھی۔ بخاری' کتاب النکاح' باب کثرۃ النساء میں دو احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تعداد نو ہی درست ہے۔ اور ان ازواج کے نام یہ ہیں۔ حضرت سودہ' حضرت عائشہ' حضرت حفصہ' حضرت ام سلمہ' حضرت زینب بنت جحش' حضرت جویریہ' حضرت ام حبیبہ' حضرت صفیہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہن اور جس روایت میں تعداد گیارہ مذکور ہے اس میں آپ کی دو کنیزیں ماریہ قبطیہ اور ریحانہ بھی شامل ہیں۔ ماریہ قبطیہ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے اسے آزاد کر کے نکاح کیا تھا' مگر یہ بات درست نہیں یہ شاہ مصر نے ہدیتاً آپ کو بھیجی تھی۔ اور جب یہ بھیجی تو اس وقت رسول اللہ ﷺ پر مزید نکاح کرنے پر پابندی لگ چکی تھی۔

(۱۱) حالت حیض میں مباشرت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ "میں اور رسول اللہ ایک طرف سے غسل کرتے تھے اور ہم دونوں جنبی ہوتے تھے۔ اور حالت حیض میں آپ مجھے حکم دیتے تو میں آزار پہن لیتی اور آپ مجھ سے اختلاط کرتے تھے اور بحالت اعتکاف آپ اپنا سر میری طرف نکال دیتے تھے اور میں اس کو دھو دیتی حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔" (م۔ ح ص ۳۲۰)

اس حدیث پر سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں حالت حیض میں مباشرت کا ذکر ہے۔ جب کہ قرآن میں اس بات سے منع کیا گیا ہے اس غلط فہمی یا اعتراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ مباشرت کا معنی ہماری زبان میں مجامعت سمجھا جاتا ہے۔ اس غلط استعمال سے منکرین حدیث نے یہ ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ قرآن نے مجامعت کے لیے باشر (جلد کے ساتھ جلد لگنا) لا مس (ایک دوسرے کو ٹٹولنا)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مس (چھونا) اور آتی (آنا) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اور یہ سب کنائی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اپنے حقیقی بنیادی یا لغوی معنوں میں ایک بھی استعمال نہیں ہوا۔ اب یہ غلط فہمی یوں پیدا ہوئی کہ قرآن میں تو باشر کا لفظ کنائی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور حدیث میں اپنے حقیقی معنوں [1] میں۔ ترجمہ میں "اختلاط" کا لفظ بھی غلط ترجمہ ہے۔ اس کا معنی صرف بدن کا دوسرے بدن سے لگنا ہے۔ یعنی میاں بیوی اکٹھے لیٹ بھی سکتے ہیں معانقہ بھی کر سکتے ہیں۔ بوسہ بھی لے سکتے ہیں۔ غرضیکہ مجامعت کے علاوہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ حیض کی حالت میں اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو کنگھی کر دی جب آپ مسجد کے باہر کھڑی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ تو اس سے شرعی مسئلہ تو سمجھا جا سکتا ہے کہ عورت حیض کی حالت میں اتنی ناپاک بھی نہیں ہوتی کہ اپنے میاں کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ تاہم وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ اسی طرح اگر میاں بیوی رات کو اندھیرے میں درمیان میں رکھے ہوئے پانی کے ایک برتن سے غسل کر لیں تو اس میں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

(۱۲) اعتکاف اور اِستحاضہ

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپ کی کسی بیوی نے اعتکاف کیا اور وہ خون اور زردی کو (خارج ہوتے) دیکھتی تھیں۔ اور نماز پڑھنے کی حالت میں طشت ان کے نیچے رکھا رہتا تھا۔" (مقام حدیث ص۳۲۱)

طلوع اسلام کی فریب دہی: یہ حدیث دراصل کتاب الحیض' باب الاستحاضہ' پھر اس کے تحت ذیلی باب "اعتکاف المستحاضہ" میں مذکور ہوئی ہے۔ نیز اس حدیث سے پہلے جو حدیث درج ہوئی ہے وہ ذرا مفصل ہے اور اس میں یہ وضاحت بھی ہے کہ وَهِيَ مُسْتَحَاضَةٌ یعنی انہیں استحاضہ کی بیماری تھی۔ لیکن طلوع اسلام نے مفصل حدیث درج نہیں کی نہ کہیں سے یہ پتا چلنے دیا کہ یہاں معاملہ حیض کا نہیں استحاضہ کا ہے۔ حیض میں نماز معاف ہے۔ استحاضہ میں معاف نہیں حیض کی حالت میں عورت نہ مسجد میں داخل ہو سکتی ہے نہ اعتکاف بیٹھ سکتی ہے۔ لیکن استحاضہ کی صورت میں یہ مسجد میں جا بھی سکتی ہے اور اعتکاف بھی بیٹھ سکتی ہے۔ اب طلوع اسلام نے یہ کیا کہ حدیث تو استحاضہ کی درج کر دی اور ظاہر یوں کیا کہ یہ سب کچھ حیض سے متعلق ہے۔

---

[1] بخاری میں یہ لفظ کئی مقامات پر ان اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً کتاب النکاح کے ایک باب کا عنوان ہی یہ ہے کہ لا تباشِر المَرأة المَرأة یعنی کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ نہ سوئے۔ یا اس کے ساتھ نہ چمٹے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(۱۳) روزہ اور مباشرت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ "رسول اللہ روزہ کی حالت میں (اپنی ازواج کے) بوسے لے لیا کرتے تھے اور مباشرت کیا کرتے تھے۔ مگر آپ ﷺ اپنی خواہش پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے۔"
(م۔ ح ص ۳۲۱)

اس حدیث سے بھی مباشرت کے غلط مروجہ مفہوم سے دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اس حدیث کا آخری فقرہ صاف بتا رہا ہے کہ یہاں مباشرت سے مراد مجامعت ہرگز نہیں۔ رہا روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینا تو اس سے آپ کو کون روکتا ہے؟ یہی مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے جواباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا۔ "کیا روزہ کی حالت میں کلی کرنا جائز ہے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا "تو پھر بیوی کا بوسہ لینے کی بھی یہی صورت ہے" یعنی جس طرح پانی جب تک حلق سے نیچے نہ چلا جائے۔ روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح مجامعت کے علاوہ بوس وکنار اور مل کر لیٹنے بیٹھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۱۴) روزہ اور جنابت

ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ "میں اپنے والد کے ہمراہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ میں یقین کے ساتھ بیان کرتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کو بغیر احتلام کے جماع کے سبب سے بحالت جنابت صبح ہو جاتی تھی۔ پھر آپ اس دن روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد ہم حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئے۔ تو انہوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ ابو جعفر کہتے ہیں میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا کہ اگر روزہ توڑ ڈالے تو کیا جماع کرنے والے کی طرح وہ کفارہ دے گا۔ انہوں نے کہا نہیں کیا تم حدیث کو نہیں دیکھتے کہ اس میں یہ صاف الفاظ موجود ہیں ((لَمْ يَقْضِهِ وَإِنْ صَامَ الدَّهْرَ)) (م۔ ح ص ۳۲۲)

اب دیکھئے اس حدیث میں مندرجہ ذیل تین مسائل بیان ہوئے ہیں۔

1. جنبی شخص وقت کی تنگی کی وجہ سے پہلے سحری کھالے تاکہ روزہ رکھ سکے اور بعد میں نہالے۔ خواہ اس دوران صبح ہو جائے۔
2. مجامعت کی وجہ سے روزہ توڑنے والے کے لیے کفارہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔
3. اگر کوئی شخص بلاوجہ فرضی روزہ توڑ دیتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے۔ تو اس کا گناہ اتنا زیادہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی روزے رکھ کر اس فرضی روزہ کی قضا دینا چاہے تو اس کی قضا نہیں ہو سکتی۔

مجامعت کی وجہ سے روزہ توڑنے والے کے لیے کفارہ اس لیے ہے کہ اس صورت میں انسان بسا اوقات بے بس ہو جاتا ہے۔ اور بلاوجہ فرضی روزہ توڑنا یا چھوڑنا ایسی بات ہے جو انسان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لہٰذا بلاوجہ روزہ توڑنا' مجامعت کی وجہ سے روزہ توڑنے سے بہت زیادہ جرم ہے۔ جس کا نہ کفارہ اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نہ ہی اس کی قضا ہو سکتی ہے۔ اگرچہ وہ قضا کے طور پر زندگی بھر بھی روزے رکھتا رہے۔

اب ہم نہیں سمجھتے کہ طلوع اسلام کو اس حدیث میں کونسی بات کھٹکی ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے اس حدیث کو بھی اس باب میں درج کر دیا۔

(۱۵) صحابہ رضی اللہ عنہم (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے

اس عنوان پر تفصیلی بحث "تفسیر بالحدیث" میں گزر چکی ہے۔ لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

(۱۶) نفاست

مسور اور مروان سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ کے زمانے میں نکلے۔ پھر انہوں نے پوری حدیث درج کی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جتنی مرتبہ تھوکا وہ کسی نہ کسی شخص کے ہاتھ پر پڑا اور اس نے اسے اپنے چہرہ اور بدن پر مل لیا۔" (م۔ ح ص ۳۲۳)

یہ الفاظ اس طویل حدیث سے لیے گئے ہیں۔ جن میں صلح حدیبیہ کی شرائط کا ذکر ہے جب عروہ بن مسعود ثقفی اہل مکہ کی طرف سے سفیر بن کر حدیبیہ کے مقام پر آیا۔ اور اس کی گفتگو ناکام رہی۔ تو اس نے واپس جا کر قریش مکہ سے کہا کہ۔

"میں روم، ایران اور حبش کے بادشاہوں کے پاس بھی گیا ہوں۔ خدا کی قسم! میں نے تو نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے لوگ اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں۔ جیسے محمد کی تعظیم آپ کے اصحاب کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے تھوکا تو کوئی اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اپنے منہ اور بدن پر مل لیتا ہے اور جب وہ کوئی حکم دیتا ہے تو لپکتے ہوئے فوراً اس کا حکم بجالاتے ہیں۔ اور جب وضو کرتے ہیں تو وضو کے پانی کے لیے قریب ہوتا کہ لڑ پڑیں گے۔ اور جب وہ بات کرتے ہیں یہ اپنی آوازیں دھیمی کر لیتے ہیں۔ اور ادب و تعظیم کی وجہ سے ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتے۔ "لہٰذا تم محمد ﷺ کی بات مان لو تمہارا اسی میں فائدہ ہے۔"

(بخاری، کتاب الشروط باب الشروط فی الجهاد للمصالحة)

اب دیکھئے ایک کافر سفیر نے اصحاب النبی کی تعظیم کے سلسلہ میں جو پانچ باتیں بتائیں۔ جو ان میں سرفہرست ہے۔ وہی منکرین حدیث کے نزدیک نفاست کے خلاف ہے اب اسے عقلوں کے فرق کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ تھوک اگر پاک چیز نہیں تو کم از کم ناپاک یا پلید بھی نہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا نبی ﷺ کی تھوک اور عام انسانوں کی تھوک برابر ہے؟ غار ثور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں کو سانپ نے ڈس لیا۔ تو آپؐ نے اس پر اپنا تھوک لگایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالکل شفایاب ہو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

گئے۔ درد جاتا رہا اور زہر کا اثر ختم ہو گیا۔ جنگ خیبر کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ آشوب چشم کے عارضہ سے بیمار تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو بلا کر ان کی آنکھوں پر اپنا تھوک لگایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل شفایاب ہو گئے۔ درد بھی جاتا رہا۔ تو آپ ﷺ نے اسلامی جھنڈا ان کے حوالے کیا۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس کوئی بھی مریض آیا تو آپ وہیں سے تھوڑی مٹی لیتے اس میں اپنا تھوک ملاتے اور ماؤف مقام پر اس کا لیپ کر دیتے تو وہ شفایاب ہو جاتا اور ساتھ ہی یہ الفاظ زبان سے پڑھتے۔

«عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ لِلْمَرِيْضِ بِسْمِ اللهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا وَرِيْقَةُ بَعْضِنَا يَشْفِيْ سَقِيْمَنَا»(بخاري، كتاب الطب، باب رقية النبي ﷺ)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ مریض سے یوں کہا کرتے تھے۔ اللہ کے نام سے ہماری زمین کی خاک اور ہم میں سے بعض کی تھوک سے ہمارے بیماروں کو شفا ہو جاتی ہے۔"

امید ہے آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی تھوک کیوں اپنے چہروں اور بدن پر مل لیا کرتے تھے؟ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے جو والہانہ محبت تھی اس کا بھی یہی تقاضا تھا۔ جیسا کہ اس کافر سفیر نے بھی یہی سمجھا۔

(۱۷) عزل

اس ضمن میں طلوع اسلام نے عزل سے متعلق دو احادیث درج فرمائی ہیں۔ جن میں صحابہ کا رسول اکرم ﷺ سے استفسار ہے۔ احادیث سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ نے عزل کو ناپسند فرمایا۔ تاہم اس سے منع بھی نہیں کیا۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں "اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔ (م۔ ح ص ۳۲۴)

ان احادیث میں کیا بات قابل اعتراض ہے۔ یہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ اگر طلوع اسلام یا اس جیسے دوسرے حضرات یہ رخصت قبول نہیں کرتے۔ تو نہ کریں۔ اور یہی بہتر بات ہے۔ لیکن کوئی اس رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے بھی مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۱۸) شرمگاہ کے علاوہ

یہ بحث۔ "تفسیر بالحدیث" میں ذیلی عنوان "عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں" میں گزر چکی۔

(۱۹) متعہ

اس پر بھی تفصیلی بحث "متعہ کی اباحت و حرمت" کے تحت گزر چکی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑳ زانیہ عورت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (گزشتہ زمانے میں) ایک عورت نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ حالانکہ اس کا بیٹا اپنے عبادت خانہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس عورت نے کہا جریج! تو لڑکے نے (اپنے دل میں) کہا۔ کہ اے اللہ (اب میں کیا کروں) میری ماں مجھے پکار رہی ہے۔ اگر نہیں بولتا ہوں تو وہ ناخوش ہوگی۔ اور (اگر بولتا ہوں تو) میری نماز (جاتی ہے) پھر دوبارہ اس کی ماں نے کہا۔ اے جریج اس لڑکے نے (اپنے دل میں) کہا۔ اے اللہ (اب میں کیا کروں) میری ماں اور میری نماز پھر تیسری بار اس کی ماں نے کہا "اے جریج! تیسری بار پھر جریج نے یہی کہا کہ اے اللہ! میری ماں اور میری نماز' جب تیسری مرتبہ بھی وہ نہ بولا تو اس کی ماں کو غصہ آگیا اور کہنے لگی کہ اے اللہ! جریج کو موت نہ آئے۔ جب تک زانیہ عورتوں کی صورت نہ دیکھ لے اور ایک چرواہے کی عورت اس کے عبادت خانہ کے قریب بکریاں چرانے آیا کرتی تھی۔ اس کے بچہ پیدا ہوا اور اس سے دریافت کیا گیا یہ بچہ کس سے پیدا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا جریج سے وہ اپنے عبادت خانہ سے اترا تھا اور میرے ساتھ ہمبستر ہوا تھا۔ لوگوں نے جا کر اس واقعہ کے متعلق جریج سے باز پرس کی جریج نے پوچھا وہ عورت کہاں ہے جو یہ بیان کرتی ہے کہ اس کا بچہ میرا ہے (لوگ اس عورت کو جریج کے پاس لائے) اس بچے سے جریج نے کہا اے بابوس! تیرا باپ کون ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ایک چرواہا۔ غرض اس طرح پر جریج کی ماں کی دعا کا اثر ہوا کہ جریج کو ایک زانیہ عورت کی صورت دیکھنی پڑی۔" (م۔ ح ص ۳۲۶)

مندرجہ بالا اقتباس جس طویل حدیث سے لیا گیا ہے۔ وہ بخاری کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم میں اور مسلم میں کتاب البر و الصلۃ کے باب برالوالدین میں مذکور ہے۔ اس حدیث میں دراصل ان تین بچوں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے گود میں کلام کیا۔ ان تین میں پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کا ذکر چونکہ قرآن میں تفصیل سے موجود ہے۔ لہٰذا حدیث میں صرف اجمالی ذکر ہوا۔ تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ دوسرے نمبر پر یہی بچہ ہے۔ جس کی ماں نے اس کی نسبت غلط طور پر جریج راہب کی طرف کردی۔ تیسرے ایک اور گود میں دودھ پیتے بچے کا ذکر حدیث میں جریج کے واقعہ کے بعد تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

اب طلوع اسلام نے جتنا اقتباس اس طویل حدیث سے پیش کیا ہے۔ اس میں بھی کانٹ چھانٹ بہت ہے۔ اور جس نسخہ بخاری کا وہ حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ نسخہ نایاب ہے۔ اور جو بخاری کا اصل عربی متن والا نسخہ (مطبوعہ نور محمد کراچی) ہے۔ وہ اس سے ملتا نہیں اور کئی باتیں آپ چھوڑ گئے تاہم ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جو کچھ بھی آپ نے نقل کیا ہے۔ اس میں اعتراض آپ کو کس بات پر ہے۔ اگر حرامی بچے کے گود میں بولنے پر اعتراض ہے۔ تو ایسا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قرآن کریم میں مذکور ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

واقعہ کی تفصیل مسلم میں اس طرح مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے بعض لوگ جریج راہب کے حاسد بن گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس کو بدنام کرنے کی ٹھانی۔ اور ایک حسین اور فاحشہ عورت کو یہ کام سپرد کیا۔ جو بن ٹھن کر جریج کے پاس گئی لیکن جریج نے صاف انکار کر دیا۔ اب اسے اپنی توہین کا خیال بھی شامل ہوگیا۔ وہ اسی جنگل کے ایک چرواہے کے پاس گئی اور اس سے حاملہ ہوئی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو پوچھنے پر جریج کا نام لگا دیا۔ لوگ جریج کے پاس گئے تو اسے مارنے لگے اور کٹیا بھی گرا دی۔ جریج نے وجہ پوچھی تو انہوں نے اس زانیہ کی بات بتائی۔ جریج نے اس زانیہ عورت کو طلب کیا اور خود اللہ سے دعا میں مشغول ہوگیا۔ جب وہ آگئی تو جریج نے بچے کے پیٹ میں کچوکہ مارا اور کہا۔ بتا تیرا باپ کون ہے؟ اس نے چرواہے کا نام بتا دیا۔ تب لوگ بہت نادم ہوئے۔ جریج راہب سے معافی مانگی۔ اور کہنے لگے ہم تجھے سونے کی کٹیا بنا دیتے ہیں۔ جریج نے کہا نہیں جیسے پہلے تھی ویسی ہی بنا دو۔ اس طرح جریج پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کی بریت ہوگئی۔

ان تصریحات کے بعد بھی ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر طلوع اسلام کو اعتراض کس بات پر ہے؟ عنوان سے کچھ سمجھ نہیں آسکی کہ انہیں زانیہ عورت کے وجود پر اعتراض ہے۔ یا جریج کی ماں کی پکار پر نہ بولنے پر؟ یا ماں کی بد دعا پر؟ یا اس کی قبولیت پر؟ یا جریج کی بریت پر؟ اگر کچھ اشارہ فرما دیتے تو اس کا جواب بھی دیا جاتا۔

(۲۱) جو عورت انکار کرے۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جب مرد اپنی بیوی کو ہمبستری کے لیے کہے اور وہ انکار کر دے۔ پھر وہ مرد ناخوش ہو کے سو رہے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔" (م۔ ح ص ۳۲۶)

یہ حدیث بھی بالکل درست اور عقل کے عین مطابق ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عورت مرد سے اپنے حقوق تو پورے وصول کرے اور اگر نہ کرے تو اسے بذریعہ عدالت چارہ جوئی کا بھی اختیار ہو۔ لیکن جب اس کے حق کی ادائیگی کا وقت آئے تو انکار کر دے؟ کیا معاہدہ نکاح انہیں شرائط پر نہیں طے پاتا؟ جس پر طرفین کی طرف سے ایجاب قبول ہوتا ہے ہاں اگر انکار کی کوئی معقول وجہ ہو تو یہ اور بات ہے۔ اور اگر فی الواقع کوئی وجہ معقول ہو تو اول تو مرد ایسا مطالبہ کرتا ہی نہیں اور اگر کرے بھی پھر عورت اس معقول وجہ کی بناء پر انکار کر دے تو مرد اس پر بلاوجہ عموماً ناراض نہیں ہوا کرتا۔

(۲۲) دوزخ میں عورتیں

حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں کے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لوگوں میں اکثر فقراء پائے اور میں نے دوزخ میں دیکھا تو وہاں کے اکثر لوگ عورتوں کو دیکھا۔" [1] (م ح ص ۳۲۶)

اب دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے دوزخ میں عورتوں کے زیادہ ہونے کی وجہ بھی ایک دوسری حدیث میں بتا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

«قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ الإِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَاَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ» (بخاري، كتاب النكاح، باب كفران العشير وهو الزوج . . .)

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے خاوند کی اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں اگر تو کسی عورت سے ہمیشہ بھلائی کرے پھر وہ تجھ سے کسی وقت کوئی کمی دیکھے تو کہنے لگتی ہے میں نے تجھ سے کبھی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔"

لہٰذا طلوع اسلام اور تہذیب مغرب کے دلدادہ دوسرے سب حضرات کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ جو عورتیں اس جرم میں مبتلا نہیں۔ وہ کم از کم اس وجہ سے دوزخ میں نہیں جائیں گی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس عیب سے کم ہی عورتیں محفوظ ہوتی ہیں۔

(۲۳) بھینگا بچہ

اس عنوان پر "تفسیر بالحدیث" کے ذیلی عنوان "عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں" میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

(۲۴) سورج کہاں جاتا ہے؟

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے جب کہ آفتاب غروب ہو رہا تھا فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے پھر طلوع ہونے کی اجازت مانگے تو اسے طلوع کی اجازت دی جاتی ہے اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے اجازت نہ ملے اس سے کہہ دیا جائے تو جہاں سے آیا ہے وہیں واپس لوٹ جا۔ پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ (م۔ ح ۳۲۸)

---

[1] جنت میں فقراء کے زیادہ ہونے کی وجہ ہم "حصول جنت" میں بیان کر چکے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

یہ حدیث منکرین حدیث کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہے۔ کوئی اس پر "حدیث کا علم الافلاک" کا عنوان جماتا ہے تو کوئی "معلومات عامہ" کا کیونکہ آج کے دور میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ سورج ساکن ہے وہ نہ کبھی طلوع ہوتا ہے نہ غروب۔ بلکہ زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن اس نظریہ جدید پر یقین رکھنے کے باوجود ہم طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے الفاظ ہر وقت استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے قرآن اور حدیث میں بھی یہی زبان زدیا معروف انداز بیان اختیار کیا گیا ہے ذوالقرنین کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ ٱلشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِى عَيْنٍ حَمِئَةٍ ﴾ (الکھف ۱۸/ ۸۶)

"یہاں تک کہ (ذوالقرنین) سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اسے کیچڑ کے ایک چشمہ میں غروب ہوتے پایا۔"

اس آیت میں بھی طرز بیان وہی اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے کہ عام انسانوں کو معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کی مندرجہ بالا دونوں آیات سے سورج کا متحرک ہونا ثابت ہوتا ہے۔ سائنس نے جہاں سورج کے ساکن ہونے کا نظریہ پیش کیا وہاں اس کی محوری گردش کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ جسے اس کا مستقر قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر مزید "جدید نظریہ سائنس" یہ کہتا ہے کہ ہمارا سورج اپنے پورے خاندان سمیت کسی اپنے سے بہت بڑے سورج یا سیارے کے گرد گردش کر رہا ہے۔ یہ نظریہ بھی کسی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔

یہاں یہ بات ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کسی دور کے مخصوص سائنسی نظریہ کا قطعاً پابند نہیں۔ قرآن اگر اللہ کا قول ہے۔ تو کائنات اس کا فعل ہے۔ ان دونوں میں تضاد ناممکن ہے۔ سائنسی نظریہ غلط ہو سکتا ہے قرآن غلط نہیں ہو سکتا۔ اور سائنسی نظریات کا تو یہ حال ہے کہ آج تک سورج اور زمین کی حرکات کے متعلق چار مرتبہ نظریات بدل چکے ہیں۔ کبھی زمین کو ساکن اور سورج کو متحرک قرار دیا جاتا رہا ہے۔ تو کبھی سورج کو ساکن اور زمین کو متحرک آخر قرآن سائنس کے کون کون سے نظریے کا ساتھ دے؟

اب رہا سورج کا سجدہ کرنے کا معاملہ تو ایک سورج ہی کیا کائنات کی ہر چیز اللہ کو سجدہ کر رہی ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسْجُدُ لَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ وَٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ وَٱلْجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ ﴾ (الحج ۲۲/ ۱۸)

"کیا آپ دیکھتے نہیں کہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات سورج، چاند، ستارے، پہاڑ درخت جانور اور آدمیوں میں سے بھی اکثر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔"

اور اس سجدہ سے مراد ان امور کی سرانجام دہی ہے جو امور اللہ نے کسی چیز کے ذمے لگا دیئے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اسی کو تعبدی سجدہ یا سجدہ عبودیت بھی کہتے ہیں اور عرش کے نیچے سجدہ کرنے کا مطلب اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرنا ہے۔ کیونکہ ذوالعرش اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (۱۷:۴۲، ۴۰:۱۵ نیز ۸۵:۱۵) اور رب العرش بھی وہی ہے۔ (دیکھئے ۲۱:۲۲)

عرش کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں تاہم اتنا معلوم ہے کہ ہماری زمین کو آسمان محیط ہے اور سارے آسمانوں کو عرش محیط ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی چیز جو اللہ کو سجدہ کر رہی ہے وہ عرش کے تحت ہی سجدہ ہے۔

اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ سورج تو غروب ہوتا ہی نہیں تو نہ سمجھے۔ وہ یہ سمجھ لے کہ سورج ہر وقت خدا کے حضور (یا تحت العرش) سجدہ ریز رہتا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے مقرر کردہ اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے۔ اور اس کے لیے ہر آن اللہ تعالیٰ کی منظوری بھی چاہتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ سورج کو آگے چلنے کے بجائے واپس مڑ جانے کا حکم دیا جائے گا اور وہ الٹی چال چلنا شروع کر دے گا۔ جیسا کہ کئی دیگر سیارے بھی سیدھی چال چلتے چلتے الٹی چال چلنے لگتے ہیں۔ (دیکھئے سورہ تکویر آیت نمبر۱۵) اور علم نجوم کی اصطلاح میں انہیں خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔

اب بتایئے اس حدیث میں کونسی ایسی بات آگئی ہے جو قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا منکرین حدیث کو سائنس کے بدلے ہوئے نظریات پر ضرورت سے بھی زیادہ ایمان نہ لانا چاہیئے۔

㉕ موسم کیسے بدلتے ہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصہ نے میرے دوسرے حصہ کو کھا لیا ہے تو اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور دوسرا گرمی میں۔ (پس جو تم جو سخت سردی دیکھتے ہو یہ بھی جہنم کا سانس ہے۔)" (مقام حدیث ص۳۲۹)

اب دیکھئے پہلے زمانوں میں موسم سورج کی حرکت اور اسکے کسی خاص خطہ زمین سے دور نزدیک ہونے سے بدلا کرتے تھے۔ لیکن آج کل زمین کو ساڑھے چھیاسٹھ درجے زاویہ پر رکھ کر سورج کے گرد گھمانے سے بدلتے ہیں۔ اور حدیث کی رو سے جہنم کے سانس سے بدلتے ہیں۔ زمین کی کیفیت بہت حد تک ہمیں معلوم ہے اور سورج کو ہم دیکھتے تو ہیں لیکن اس کی کیفیت سے واقفیت نسبتاً کم ہے۔ اور جہنم کی کیفیت ہمیں مطلق معلوم نہیں۔ صرف ایمان بالغیب کی رو سے اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اب کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ ہمارا سورج ہی جہنم ہو؟ یا جہنم کا براہ راست اس سورج سے تعلق ہو؟ پھر اگر یہ اس قدر بھڑکتا ہوا سورج سخت سردی کا موسم لا سکتا ہے (کیونکہ موسم سورج کی وجہ سے بدلتے ہیں) تو پھر موسم بدلنے کی نسبت جہنم کی طرف کیوں نہیں کی جا سکتی؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ زمہریر بھی ایک سخت سردی کا عذاب ہے۔ جو اہل جہنم

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کے لیے ہے۔ اہل جنت اس سے محفوظ رہیں گے۔

(۲۶) نحوست کس چیز میں؟

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ "نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نحوست صرف تین چیزوں میں ہے۔ گھوڑے میں' عورت میں اور گھر میں۔"

حضرت سہیل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نحوست اگر کسی چیز میں ہو تو عورت میں' گھوڑے میں اور مکان میں ہوگی۔" (م۔ ح ص۳۲۹)

اب دیکھئے جو دو حدیثیں طلوع اسلام نے درج فرمائیں ان میں تضاد معلوم ہوتا ہے پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین چیزوں میں نحوست ہوتی ہے۔ دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ نحوست اگر ہو تو ان تین چیزوں میں ہو سکتی ہے پہلی حدیث کے راوی عبداللہ بن عمر ہیں اور دوسری کے سہل بن سعد۔

پھر ان دونوں حدیثوں کے درمیان ایک تیسری حدیث بھی بخاری میں مذکور ہے۔ اور وہ عبداللہ بن عمر ہی کی روایت ہے اور اس میں انہوں نے خود ہی بات واضح کر دی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

«ذَكَرُوْا الشُّوْمَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنْ كَانَ الشُّوْمُ فِيْ شَيْءٍ فَفِي الدَّارِ وَ الْمَرْاَةِ وَالْفَرَسِ»(بخاري، كتاب النكاح)

"لوگوں نے نبی ﷺ سے پاس نحوست کی بات چھیڑ دی۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ نحوست کا اگر کسی چیز میں وجود ہے تو وہ عورت' گھر اور گھوڑے میں ہو سکتی ہے۔"

اب دیکھئے امام بخاری نے ان تینوں احادیث کو مندرجہ ذیل آیت کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّ مِنْ أَزْوَٰجِكُمْ وَأَوْلَٰدِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَٱحْذَرُوهُمْ ﴾

"اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں۔ سو ان سے بچے رہنا۔"

(التغابن ٦٤/ ١٤)

اور بیوی اور اولاد ہی وہ چیزیں ہیں جن سے انسان محبت کرتا ہے۔ اور ان سے بچنا اس کے لیے مشکل ہے تاہم ان ہی چیزوں کی محبت انہیں فتنہ میں ڈال دیتی ہے۔ اور اس کی شامت یا نحوست کا سبب بن جاتی ہے۔ بالکل یہی بات مندرجہ بالا احادیث میں مذکور ہے۔ کہ بیوی اور گھر اور سواری ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کو محبت ہوتی ہے اور وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ چیزیں بجنسہ بری بھی نہیں ہیں۔ تاہم اگر انسان ضرورت سے زیادہ ان چیزوں کی طرف رغبت کرے تو یہی پیاری چیزیں اس کے لیے شامت اعمال یا نحوست کا سبب بن سکتی ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ طلوع اسلام موجودہ دور کے رجحان کے مطابق کم از کم عورت کو نحوست کی زد سے بچانا چاہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے ان احادیث کو قابل اعتراض سمجھ کر درج فرمایا ہے۔ لیکن

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مشکل یہ ہے کہ عورت کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ اور اس لحاظ سے اور بھی مشکل بن جاتی ہے کہ حدیث میں عورت کو (بعض صورتوں میں) منحوس قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ قرآن اسے علی الاطلاق دشمن قرار دیتا ہے۔

(۲۷) بیل باتیں کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک شخص بیل پر سوار تھا بیل نے اس سوار ہونے والے شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا میں اس بات کے لیے پیدا نہیں ہوا میں تو کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا میں اس پر یقین رکھتا ہوں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی یقین رکھتے ہیں۔ اور ایک بھیڑیے نے ایک بکری پکڑ لی۔ چرواہا اس کے پیچھے دوڑا۔ بھیڑیئے نے کہا کہ یوم سبع میں بکری کا محافظ کون ہو گا؟ اس دن تو میرے سوا اس کا چرواہا نہ ہو گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ میں اس پر یقین رکھتا ہوں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی یقین رکھتے ہیں آپ نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے بھی شہادت دی۔ حالانکہ وہ دونوں اس وقت موجود نہ تھے۔" (م۔ ح ص ۳۳۰)

اس حدیث میں غالباً قابل اعتراض بات بیل کے باتیں کرنے کی ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے تو ہمارے خیال میں سارے حیوانات اور چرند پرند باتیں کرتے ہیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی بولی سمجھتے بھی ہیں۔ لیکن انسان ان کی بولی نہیں سمجھتے۔ مگر جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی بولی کے سمجھنے کی صفت سے سرفراز فرمایا ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام صرف پرندوں کی بولی ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے کیڑی جیسے چھوٹے جانور کی بات بھی سمجھ لی تھی۔ یہ سب کچھ تو قرآن سے ثابت ہے۔ اب اگر اس حدیث میں بیل یا بھیڑیئے کی بات کرنے اور اس بات کرنے کی حقیقت پر رسول اللہ نے شہادت دی یا کامل وثوق کی بنا پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے شہادت دی کہ بیل اور بھیڑیا بات کر سکتے ہیں تو اس حدیث پر اعتراض کیوں ہو؟

(۲۸) شیطان گوز مارتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ نے فرمایا جب نماز کی اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے۔ یہاں تک کہ اذان کی آواز نہیں سنتا۔ پھر جب موذن خاموش ہو جاتا ہے تو سامنے آجاتا ہے۔ پھر جب تکبیر کہی جاتی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے پھر جب تکبیر کہنے والا سکوت کر لیتا ہے تو سامنے آجاتا ہے اور نمازی آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کر جو اسے یاد نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بھول جاتا ہے کہ کس قدر نماز پڑھی" (م۔ ح ص ۳۳۰)۔

اس مقام پر اصل بحث یہ ہے کہ شیطان کا کوئی خارجی وجود ہے بھی یا نہیں؟ قرآن کریم کی بے شمار

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

آیات سے شیطان کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ طلوع اسلام شیطان کے ذاتی تشخص کا ہی قائل نہیں۔ وہ اس سے انسان کی اندرونی سرکش قوتیں [1] مراد لیتا ہے۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ جب شیطان کے متعلق یہی تصور ہو تو نہ اس کے گوز مارنے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ اس کے گھبرانے اور گھبرا کر دوڑنے اور واپس آنے کا۔ جب کہ قرآن سے شیطان کا الگ وجود ذاتی تشخص اور زندگی ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کی لاتعداد اولاد اور اولاد در اولاد بھی ثابت ہے۔ (۱۷:۶۴) جب یہ باتیں ثابت ہو جائیں تو اس کے گوز مارنے کو تسلیم کرنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے رہی یہ بات کہ نماز میں یا اس کے علاوہ دوسرے امور میں انسان خود بھولتا ہے۔ یا اسے شیطان بھلاتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ دونوں صورتیں ممکن اور درست ہیں۔ خود بھولنے پر تو کسی کو اعتراض نہیں اور شیطان کے انسان کو بھلانے کے ثبوت میں درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے۔

﴿ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ ﴾ (یوسف ۱۲/ ۴۲)

"اور یوسف علیہ السلام نے اس شخص کو جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ رہائی پائے گا۔ کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ لیکن شیطان نے اس شخص کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔"

﴿ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ ﴾ (الکہف ۱۸/ ۶۳)

(موسیٰ کے ساتھی نے موسیٰ سے) کہا۔ بھلا آپ نے دیکھا کہ جب ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

پھر اگر شیطان دخل اندازی اور وسوسہ اندازی سے کچھ باتیں بھلا سکتا ہے تو کچھ باتیں یاد بھی دلا سکتا ہے۔ وہ نماز کی حالت میں انسان کو نماز کی رکعتیں یا خدا کی یاد تو بھلا دیتا ہے اور اس کے بجائے بعض دوسری بھولی بسری باتیں یاد دلاتا رہتا ہے۔

(۲۹) عذابِ قبر میں تخفیف

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک باغ میں تشریف لے گئے تو دو آدمیوں کی آواز سنی۔ جن پر ان کی قبروں میں عذاب کیا جاتا تھا۔ آپ نے فرمایا ان دونوں پر عذاب کیا جاتا ہے اور کسی بڑی بات میں بھی نہیں۔ ان میں ایک تو اپنے پیشاب سے پرہیز نہ کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھایا کرتا تھا۔ پھر آپ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے اس کتاب کا چوتھا باب "سرسید کا ایمان بالغیب اور نظریہ ارتقاء" یا طلوع اسلام کی شائع کردہ کتاب "قصہ ابلیس و آدم"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نے ایک سبز شاخ منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کیے اور ان میں سے ایک ایک ٹکڑا ہر ایک کی قبر پر رکھ دیا۔ آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: امید ہے جب تک یہ خشک نہ ہو جائیں ان پر عذاب کم رہے۔" (م۔ ح ص ۲۳۱)

اب پہلی بات تو یہ ہے کہ عذاب قبر ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ طلوع اسلام اس کا منکر ہے جب کہ قرآن کریم کی پانچ آیات سے عذاب قبر کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تفصیل ہم اس کتاب میں "عذاب قبر" کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قبر میں عذاب ہوتا ہے تو اس میں تخفیف ممکن ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے نماز جنازہ عذاب قبر میں تخفیف یا نجات کے لیے ہی پڑھی جاتی ہے اور آپ صحابہ کی نماز جنازہ تمام عمر پڑھاتے رہے۔ نماز جنازہ میں میت کے لیے دعائے مغفرت ہی کی جاتی ہے۔ یہ نماز جہاں عذابِ قبر کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ وہاں اس میں تخفیف اور مغفرت کا بھی ثبوت ہے۔ اگر عذاب قبر یا اس میں تخفیف دونوں کا انکار کر دیا جائے تو نماز جنازہ کی ادائیگی ایک عبث فعل ٹھہرتا ہے۔ حالانکہ آپ ساری زندگی پڑھاتے رہے۔ آپ کو صرف منافقوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع کیا گیا تھا۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ ﴿٨٤﴾ ﴾ (التوبۃ ۹/ ۸۴)

"اے نبی! ان (منافقوں) میں سے اگر کوئی مر جائے تو کبھی ان کی نماز جنازہ نہ پڑھنا' نہ ہی ان کی قبر پر کبھی (دعائے مغفرت کے لیے) کھڑا ہونا۔ یہ اللہ اور اس کے ساتھ کفر کرتے رہے اور مرے بھی تو نافرمان ہو کر۔"

اب سوال یہ ہے کہ اگر عذابِ قبر اور اس میں تخفیف کو سرے سے تسلیم ہی نہ کیا جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کو منافقین کی نماز جنازہ اور مغفرت سے منع کیوں کیا جا رہا ہے؟ اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ منافقین کو چھوڑ کر باقی سب مسلمانوں کی آپ نماز جنازہ بھی پڑھا کیجیے اور بعد میں قبرستان میں جا کر ان کی قبروں کے پاس کھڑے ہو کر کبھی کبھار دعائے مغفرت بھی کیا کیجیے جس کی وجہ سوائے عذاب قبر میں تخفیف یا نجات کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اب رہا ہری شاخ گاڑنے کا مسئلہ تو اس کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں سمجھ لیجیے۔

1. ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔ جن وانس کی تسبیح اختیاری ہوتی ہے۔ باقی تمام اشیاء کی تعبدی یا اضطراری۔
2. زندہ اشیاء کی تسبیح زندگی کے تناسب کے لحاظ سے موثر اور قابل فہم ہوتی ہے جن وانس کی تسبیح سب سے بالا و برتر اور سب سے زیادہ موثر اور قابلِ فہم ہوتی ہے حیوانات کی اس سے کم جمادات کی اس

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سے کم۔

3 جن وانس کی تسبیح چونکہ اختیاری ہے لہٰذا گاہے گاہے ہوتی ہے۔ باقی تمام اشیاء ہر وقت تسبیح میں مصروف رہتی ہیں۔

4 جب کوئی چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے تو اللہ کی طرف سے اس پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

اب زیر بحث حدیث سامنے لایئے۔ ہری شاخ جب تک خشک نہ ہوگی۔ اس کی زندگی کے آثار کی بناء پر اور اس کی تسبیح کی وجہ سے اس مقام پر رحمت کا نزول زیادہ ہوگا۔ اور اگر رحمت کا نزول ہو تو عذاب قبر میں تخفیف بھی ممکن ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ نے پورے وثوق سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک یہ خشک نہ ہوگی۔ تو عذاب قبر میں ضرور تخفیف ہوگی۔ بلکہ یوں فرمایا کہ "امید ہے کہ جب تک یہ خشک نہ ہو جائیں ان پر عذاب کم رہے"

تاہم بعض لوگ اسے معجزہ اور ایک وقتی چیز قرار دیتے ہیں۔

(۳۰) زنا کے باوجود جنت

حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ "رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس میرے پروردگار کی طرف سے ایک آنے والا (جبریل) آیا۔ اس نے مجھے بشارت دی کہ جو شخص میری امت میں سے اس حال میں مرے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔ وہ جنت میں داخل ہوگا میں نے عرض کیا۔ اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو۔" (مقام حدیث۔ ص ۳۱۲)

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ﴾ (النساء ٤/ ١١٦)

"اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے۔ مشرک کے علاوہ دوسرے گناہ جسے چاہے گا بخش دے گا۔"

اور جو مومن ہیں اللہ سے شرک نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا:

﴿ قُلْ يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾ ﴾ (الزمر ٣٩/ ٥٣)

"اے نبی لوگوں کو (میری طرف سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب کے سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ اور وہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔"

اب بتایئے کہ ان آیات اور اس حدیث کے مفہوم میں کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر تفصیلی بحث تو ہم حصول جنت کے تحت کر چکے ہیں۔ سردست یہ سمجھ لیجیے کہ جس شخص کی موت عقیدہ توحید پر ہوئی ہو وہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ایک نہ ایک دن ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ اگرچہ اسے پہلے اپنے کیے ہوئے گناہوں کی سزا ضرور بھگتنا ہوگی۔ اور اگر اللہ چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے۔

(۳۱) اگر گناہ نہ کرو گے تو.....

بخاری کی احادیث کا ذکر کرتے کرتے طلوع اسلام کو صحیح مسلم سے بھی ایک ایسی حدیث مل گئی جو اعتراض کے لحاظ سے لاجواب تھی۔ لہٰذا اسے چھوڑنا گوارا نہ کیا گیا۔ اور وہ حدیث یہ ہے۔

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے۔ جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہ کرے اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔" (م۔ ح ص ۳۳۱)

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ کی بے شمار ایسی مخلوق اب بھی موجود ہے اور بنی نوع انسان سے پہلے بھی موجود تھی جس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً فرشتے، شجر و حجر، حیوانات اور چرند پرند وغیرہ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ تو اللہ کے ہاں اس انسان کے پیدا کرنے کی غرض وغایت کیا تھی؟ کیا یہی نہ تھی کہ جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو وہ اللہ کے حضور مغفرت و بخشش کی طلبگاری کرتا ہے۔ اب اگر تمام کے تمام انسان اتنے نیک بن جائیں کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہو۔ جیسے فرشتے یا شمس و قمر اور شجر و حجر (جو کہ ناممکنات سے ہے) تو کیا اللہ ایسا کرنے پر قادر نہیں کہ وہ ایسی قوم لے آئے جو اگر گناہ کرے تو بعد میں توبہ و استغفار کرے۔

اب اس حدیث سے طلوعِ اسلام یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ انسان کو زیادہ گناہ کرنے چاہئیں۔ پھر بخشش طلب کرے تاکہ خدا خوش ہو۔ حالانکہ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر گناہ ہو جائے جو کہ انسان کی سرشت میں داخل ہے تو اس کے لیے طلبِ استغفار ضرور کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی طلب استغفار سے ہے۔ نہ کہ گناہ کرنے سے، گناہ تو از خود اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اگر تمام انسان ایسے ہو جائیں کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب وہ انسان نہ رہے۔ کوئی اور ہی چیز بن گئے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ پھر کوئی انسان جیسی ہی مخلوق پیدا کرے گا۔ جو گناہ بھی کرے اور استغفار بھی۔ ہاں اگر انسان گناہ ہی کرتا جائے اور استغفار نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے ایک دوسرے قانون کی رو سے تباہ و برباد کر دے گا۔ پھر اس کی جگہ ایسی قوم لائے گا جس کا فطری رجحان تو گناہ کی طرف ہو لیکن روحانی تقاضا طلب استغفار ہو۔

(۳۲) بنی اسرائیل چوہے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "اگر ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھ دیا جاتا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا تو وہ پی لیتے ہیں۔" (م۔ ح ص ۳۳۲)

یہ حدیث مسلم کتاب الزھد میں بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ اس قوم پر مسخ کا عذاب آیا اور ابن عباس کی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ جس قوم پر مسخ کا عذاب آیا وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہی اور یہ تو واضح ہے کہ حضرت ابن عباس کا یہ قول ان کی اپنے رائے یا بصیرت نہیں۔ بلکہ مرفوع حکمی کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر رسول اللہ کو ایسا خیال آیا بھی تھا تو وحی الٰہی نے اس کی تائید نہیں کی۔

(۳۳) اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو.....

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "آپ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔" (م۔ ح ص ۳۳۳)

غالباً اس حدیث کا مفہوم غلط سمجھنے کی وجہ سے اعتراض پیدا ہوا ہے۔ اس حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل سے پہلے بنی نوع انسان میں سے کسی نے نہ کبھی گوشت کا ذخیرہ کیا تھا نہ ہی گوشت گلا سڑا تھا۔ یعنی اس دور سے پہلے گوشت کو سٹور کرنے رواج ہی نہ تھا۔ جو کچھ بذریعہ شکار ملتا۔ سب اہل خاندان مل کر اسے کھا لیتے تھے۔ بنی اسرائیل پر جو آسمان سے من وسلویٰ اترتا تھا تو انہوں نے کھانے کے بعد کسی دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کی بجائے اسے سنبھالنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے نہ کبھی گوشت سٹور ہوا نہ ہی گلا سڑا۔

اور غلط مفہوم جو سمجھا گیا وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے پہلے گوشت کے گلنے سڑنے کے سلسلہ میں مادہ کے خواص اور تھے۔ اور گوشت اگر سٹاک کیا بھی جاتا تو گلتا سڑتا نہ تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کے بعد مادہ کے خواص بدل گئے جو آج تک چلے آرہے ہیں۔

اور حدیث کے دوسرے حصے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حوا سے پہلے نہ کوئی عورت موجود تھی نہ اس کا شوہر۔ حوا ہی پہلی عورت تھی جس نے شوہر سے خیانت کی تو اس کے بعد ہی شوہر سے خیانت کا سلسلہ جاری ہوا۔

حوا کی اپنے شوہر سے خیانت یہ تھی کہ وہ خود ابلیس کے بھرے میں آئی۔ پھر اس کے بعد اپنے شوہر کو درخت کا پھل چکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح ان دونوں نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ حوا کا شیطانی فریب میں پہلے آنے کا ذکر احادیث میں بھی موجود ہے۔ اور تورات میں بھی۔

طلوع اسلام جو مساوات مرد و زن کا حامی ہے۔ اور عورت پر کسی طرح کا "الزام" برداشت نہیں کرتا۔ وہ ایسی روایات کا بھی منکر ہے اور ایسے معاملات میں تورات و انجیل کا بھی۔ عورت کو مرد کے برابر کا درجہ قرار دینے میں وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ قرآن میں ہے فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (شیطان نے دونوں کو بہکا دیا)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

حالانکہ قرآن نے صرف نتیجہ پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل پیش نہیں کی اور عام اصول یہ ہے کہ عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں آتی۔ اگر قرآن میں یہ تفصیل مذکور نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کچھ تفصیل ہے ہی نہی۔ یا اگر ہے تو وہ غلط ہے۔

۳۴ اگر مکھی گر جائے تو.....

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے (کھانے) پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اسے چاہئے کہ اس کو غوطہ دے دے۔ بعد اس کے اس کو نکال ڈالے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہے۔" (م ح ص ۳۴۳)

آج کا مہذب طبقہ مکھی سے بہت کراہت کرتا ہے کیونکہ وہ صرف غلاظت پر بیٹھتی ہے۔ صاف ستھری چیزوں پر کبھی نہیں بیٹھتی۔ پھر جراثیم کے نظریہ نے تو مکھی کو اور بھی بدنام کر دیا ہے۔ لہٰذا اگر مکھی چائے کی پیالی یا پانی اور شربت کے گلاس میں گر پڑے۔ تو اسے پھینک دیتا ہے۔ لیکن اگر دودھ کی بالٹی یا پگھلے ہوئے گھی یا شہد وغیرہ میں گر جائے تو اسے نہ گراتا ہے نہ ضائع کرتا ہے۔ اس وقت مکھی میں نہ جراثیم رہتے ہیں نہ غلاظت رہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ غلاظت کے جو جراثیم مکھی کو چمٹتے ہیں ان کا سب سے پہلا حملہ تو مکھی پر ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا مکھی کو مر جانا چاہیئے۔ لیکن وہ مرتی نہیں بلکہ وہ زندہ رہتی اور اڑتی پھرتی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مکھی میں بھی ایسی کوئی جراثیم کش چیز ہے ضرور جو اس کی زندگی کو باقی رکھتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور طبی رسالہ (Doctorian Experiences) نمبر 1057 شائع شدہ 1927ء میں مکھی کے متعلق نئی تحقیق یوں بیان کی گئی ہے۔

"مکھی جب کھیتوں اور سبزیوں پر بیٹھتی ہے تو اپنے ساتھ مختلف بیماریوں کے جراثیم اٹھا لیتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ جراثیم مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ مکھی کے پیٹ میں بکتر فالوج نامی ایک مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو زہریلے جراثیم کو ختم کرنے کی خاصیت رکھتا ہے۔ اگر تم کسی نمکین پانی میں مکھی کے پیٹ کا مادہ ڈالو تو تمہیں وہ بکتر فالوج مل سکتا ہے۔ جو مختلف بیماریاں پھیلانے والے چار قسم کے جراثیم کا مہلک ہے۔ اس کے علاوہ مکھی کے پیٹ کا یہ مادہ بدل کر بکتر فالوج کے بعد ایک ایسا مادہ بن جائے گا جو چار مزید قسم کے جراثیم کو فنا کرنے کے لیے مفید ہو گا۔" (بینات' ترجمہ مشکلات الحدیث' ص: ۱۱۸-۱۲۰)

اب دوسری تحقیق ملاحظہ فرمایئے جو "جمعیة الهداية الاسلامية" کی طرف سے ایک طویل مضمون کی صورت میں شائع ہوئی اس کا قابل ذکر حصہ یہ ہے۔

"مکھی کے جسم میں جو زہریلا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے مبعدالبکٹیریا کہتے ہیں۔ مکھی کے ایک پر کا خاصہ یہ ہے وہ البکٹیریا کو اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا مکھی جب کسی کھانے یا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پینے کی چیز پر بیٹھتی ہے تو پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈال دیتی ہے۔ ان جراثیم سے بچانے والی پہلی چیز وہ مبعدالبکتیریا ہے جسے مکھی اپنے پیٹ میں ایک پر کے پاس اٹھائے ہوئے ہوتی ہے۔ لہٰذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم اور ان کے عمل کو ہلاک کرنے کے لیے یہ چیز کافی ہے کہ پوری مکھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے۔" (تفہیم اسلام ص ۴۵۵)

اب فرمایئے کیا یہ موجودہ تحقیقات حدیث رسول اللہ کی تائید کر کے اسے ایک علمی معجزہ ثابت نہیں کرتیں؟

۳۵ مرغ فرشتے کو دیکھتا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "آپ نے فرمایا جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ سے اس کا فضل طلب کرو۔ کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے۔ اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے خدا کی پناہ مانگو۔ کیونکہ جب وہ شیطان کو دیکھتا ہے تب بولتا ہے" (م۔ ح ص ۳۳۳)۔

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ قَالُوا۟ رَبُّنَا ٱللَّهُ ثُمَّ ٱسْتَقَٰمُوا۟ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا۟ وَلَا تَحْزَنُوا۟ وَأَبْشِرُوا۟ بِٱلْجَنَّةِ ٱلَّتِى كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ ﴾ (فصلت ۴۱/ ۳۰)

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم گئے۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) نہ تو ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت کی خوشخبری سنو۔ جس کا تم وعدہ دیئے گئے تھے۔"

اس میں صرف یہی نہیں کہا گیا کہ ایمانداروں پر فرشتے اترتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے وہ ان کو خوشخبری سناتے اور تسلی بھی دیتے ہیں۔ پھر کیا آپ نے کسی ایماندار سے سنا ہے کہ وہ اس بات کی شہادت دے کہ واقعی اس پر فرشتے اترے تھے۔ اور انہوں نے یہ باتیں کہی تھیں۔ آج بھی دنیا ایسے ایمانداروں سے بالکل خالی نہیں تاہم اس دور کو جانے دیجیے اور دور صحابہ کی طرف آیئے کیونکہ وہ تو بہرحال یہ شرائط ایمان پوری کرتے تھے۔ کیا کوئی ایسی حدیث یا تاریخی روایت نظر سے گزری ہے جس میں کسی صحابی نے اقرار کیا ہو۔ کہ واقعی مجھ پر فرشتے اتر کر یہ بات کہتے ہیں؟ یہ نہیں تو کم از کم کوئی دوسرا صحابی یہ ہی شہادت دے دے کہ مجھ پر تو نہیں۔ لیکن فلاں صحابی پر اترتے تھے اور میں نے دیکھے تھے؟

پھر جس طرح ایمان والوں پر فرشتے اترتے ہیں۔ اسی طرح ہر افاک اثیم پر شیطان بھی نازل ہوتے ہیں (۲۲۲:۲۶) وہ کسی نے دیکھے ہیں؟ یا کسی جھوٹے گنہگار نے خود ہی ان کا ذکر کیا ہے؟

بات صرف اتنی ہے کہ مرغ کی آواز کو مرغ کی بانگ یا اذان بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ آواز انسان کو مرغوب بھی ہے۔ پھر اسی بانگ یا اذان کے تصور سے انسان کی وجہ اللہ کی یاد کی طرف مائل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے فرشتہ نظر آنے سے منسوب کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمیں فرشتہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح گدھے کی آواز مکروہ ہوتی ہے۔ اور بالعموم یہ اس کی شہوت کی بناء پر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے ہینگنے کو شیطان نظر آنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سے منسوب کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہم شیطان کو بھی دیکھ نہیں سکتے۔

دراصل یہ امور غیبیہ ہیں جن پر ایمان لانے کا نام ہی ایمان بالغیب ہے۔ اب اگر انہیں عقل اور تجربہ کے معیاروں پر جانچنا شروع کر دیا جائے تو پھر ایمان بالغیب کی خیر منانی چاہیئے۔ اب اگر ایمان کی رو سے قرآن کی اس آیت کو درست سمجھا جا سکتا ہے تو اسی ایمان ہی کی رو سے اس حدیث کو بھی درست ہی سمجھا جانا چاہیئے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض جانوروں کی کوئی خاص حس انسانوں کی نسبت بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مور میلوں دور سے آواز سن لیتا ہے۔ چیونٹی کی قوت شامہ انسان سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ چیل انتہائی بلندی پر اڑتی ہوئی زمین پر گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ لیتی ہے۔ اسی طرح مرغی اس وقت کٹ کٹ کرتی ہے اور اپنے بچوں کی حفاظت شروع کر دیتی ہے۔ جب کہ چیل ابھی انتہائی بلندی پر ہوتی ہے۔ بارش کی آمد کا جانوروں کو بہت پہلے احساس ہو جاتا ہے۔ کسی جگہ پر کوئی آفت یا طوفان آنے والا ہو تو وہاں کے جانور کسی محفوظ مقام کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ بعض دفعہ کتے یوں بھونکتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ کوئی انتہائی مہیب شکل دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو انسان کے تجربہ میں آچکی ہیں۔ اور جو نہیں آئیں وہ بے حد و بے حساب ہیں۔ پھر انسان آخر کس برتے پر امور غیبیہ کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتا ہے؟ انسان نہ فرشتوں کو دیکھ سکتا ہے نہ شیطان کو' نہ ہی ان کی کیفیت سے واقف ہے تو پھر اعتراض کس بات کا؟

(۳۶) آفتاب کہاں سے نکلتا ہے؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ نے فرمایا..... کہ تم اپنی نماز میں نہ طلوع آفتاب کا وقت آنے دو اور نہ غروب آفتاب کا۔ اس لیے کہ آفتاب شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔" (م۔ ح ص ۳۳۴)

اس حدیث میں پہلی قابل اعتراض بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورج طلوع ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ سورج تو ساکن ہے۔ اس بات کا تفصیلی جواب ہم "سورج کہاں جاتا ہے" کے تحت پیش کر چکے ہیں۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ ہو سکتا ہے کہ سورج جسامت کے لحاظ سے ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ اب جس شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔ وہ شیطان کتنا بڑا ہوگا؟ اور کہاں ٹھہرتا ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کو اتنا بڑا تصور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سورج آپ کی دو انگلیوں کے درمیان بھی آسکتا ہے۔ اور طلوع بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی دو انگلیاں اپنی آنکھوں سے ذرا آگے بڑھا کر اور ان میں فاصلہ دے کر سورج کی طرف دیکھئے تو سورج ان دو انگلیوں کے درمیان دکھائی دے گا۔ پس یہی صورت سورج کے شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہونے کی سمجھ لیجیے۔

تیسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ آیا شیطان کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص ہے بھی یا نہیں۔ یہ بحث ہم پہلے کر چکے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کی شکل وصورت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جنوں کی جنس

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سے ہے۔ اور وہ ہر قسم کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

یہ اور ایسے جتنے اعتراضات ہیں یہ مادہ پرستی کی غمازی کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں اگر قرآن میں پائی جائیں مثلاً "ذوالقرنین نے دیکھا کہ سورج ایک کیچڑ والے چشمے میں غروب ہو رہا تھا۔" تو وہاں ان حضرات کی زبانیں یا تو گنگ ہو جاتی ہیں یا پھر تاویل کر لیتے ہیں کہ غیر مسلموں کو کچھ نہ کچھ جواب دیا جا سکے۔ لیکن حدیث پر اعتراض کرنے میں یہ حضرات بہت دلیر واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں انہیں کسی قسم کی تاویل بھی گوارا نہیں ہوتی۔

اس حدیث کا مطلب جو کسی مسلمان کو ہدایت کے لیے درکار ہے۔ صرف اتنا ہے کہ آتش پرست چونکہ ان اوقات میں سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان ان اوقات میں خدا کو بھی سجدہ نہ کریں نہ نماز پڑھیں۔ مبادا کہ ان کفار سے مشابہت پائی جائے۔ اب جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ تو اس حدیث سے اتنا ہی مطلب حاصل کرے گا۔ جیسا کہ اس کی وضاحت مسلم میں موجود ہے کہ حِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّار (اور اس وقت کافر سورج کو سجدہ کرتے ہیں) اور جن لوگوں کا مقصد قابل اعتراض باتیں تلاش کرنا ہو۔ تو ان کو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں جو اوپر مذکور ہیں۔

(۳۷) بخار کیسے ہوتا ہے؟

رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ "میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بخار جہنم کے جوش سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔" (م۔ ح ص ۳۳۴)

اس حدیث میں پھر ایک چیز ایسی آگئی۔ جو غیر مرئی بھی ہے اور مابعد الطبیعات سے بھی تعلق رکھتی ہے جس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں۔ لہٰذا اس پر عقلی بحث ناممکن ہے۔ تاہم دو باتیں ہم جانتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ:

1. کہ اگر جہنم کے لفظ کی جگہ حرارت یا گرمی رکھ دیا جائے خواہ یہ حرارت یا گرمی بدن کے اندر کی ہو یا باہر کی دنیا کی جو بدن پر اثر انداز ہو رہی ہے تو اسی حرارت یا گرمی سے بخار پیدا ہوتا ہے گویا جہنم اور حرارت کا بہت گہرا تعلق ہے۔
2. موجودہ دور میں بھی بخار کا علاج پانی کی پٹیاں رکھنے سے اور اگر زیادہ تیز بخار ہو تو بدن پر برف رکھنے سے کیا جاتا ہے تاکہ حرارت کے جوش کو ٹھنڈا کیا جا سکے۔

(۳۸) پیشاب پینے کا حکم

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "کچھ لوگ عکل یا عرینہ کے آئے۔ مگر وہ مدینہ میں مریض ہو گئے۔ تو آپ نے انہیں چند اونٹنیوں کے دینے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ لوگ ان کا پیشاب اور ان کا دودھ پئیں۔ پس وہ جنگل میں چلے گئے (اور ایسا ہی کیا) جب اچھے ہو گئے تو نبی اکرم ﷺ کے چرواہے کو قتل کر ڈالا اور جانوروں کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہانک کر لے گئے۔ پس دن کے اول وقت یہ خبر آپ کے پاس پہنچی۔ آپ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجے۔ پس دن چڑھے وہ گرفتار کر کے لائے گئے۔ پس آپ نے حکم دیا تو ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ ڈالے گئے۔ اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں اور گرم سنگلاخ پر ڈال دیئے گئے پانی مانگتے تھے تو انہیں پانی نہیں پلایا جاتا تھا۔" (م۔ ح ص ۳۳۴)

اس حدیث پر ایک تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ آپ نے پیشاب پینے کا حکم دیا۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پیشاب قرآن کی رو سے حرام نہیں ہے۔ اور ہم تمام منکرین حدیث کو یہ مشورہ دینے میں حق بجانب ہیں کہ وہ بھی پیشاب پی لیا کریں کیونکہ پیشاب کی حرمت قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے۔

یہ تو خیر الزامی جواب تھا۔ اور درست جواب یہ ہے کہ جب جان کا خطرہ لاحق ہو تو ایسے وقت میں حرام چیز کے استعمال کی رخصت قرآن سے ثابت ہے۔ یہی صورت ان مریضوں کو پیش آئی۔ وہ دودھ پینے کے عادی تھے۔ یہاں انہیں دودھ نہیں ملتا تھا۔ آب وہوا ویسے ہی راس نہ آئی۔ اسلام لائے اور مدینہ رہنے کے لیے آئے تھے کہ سخت بیمار پڑ گئے۔ آپ نے بیت المال سے چند دودھ دینے والی اونٹنیاں دیں۔ اونٹنیوں کی خدمت کے لیے چرواہا بھی خود مہیا کیا۔ اور چراگاہ میں بھیج دیا۔ ان کی غذا اونٹنیوں کا دودھ اور دوا دودھ اور ان کا پیشاب تجویز کیا۔ جس سے چند ہی دنوں میں شفایاب بھی ہو گئے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے رحمتہ للعالمین ہو کر انہیں چار سزائیں کیوں دیں؟ اگر انہوں نے چرواہے کو قتل کیا تھا تو قران کی رو سے انہیں بس قتل ہی کرنا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے جرائم کی تعداد بھی کافی ہے۔ جب وہ تندرست ہو گئے تو ان کی نیت بدل گئی۔ پھر انہوں نے۔

1. پہلے چرواہے کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں۔ پھر اسے گرم ریت پر پھینک دیا۔ پانی بھی نہ دیا تا آنکہ وہ مرگیا۔ یہ تھا نبی اکرم ﷺ کے احسانات کا بدلہ جو انہوں نے دیا۔
2. اسلام سے مرتد ہو گئے۔ جس کی سزا قتل ہے۔
3. بیت المال کے سب جانور ہانک کر چلتے بنے۔ گویا یہ ڈاکہ زنی کی صورت تھی۔ جس کے لیے قرآن نے چار سزائیں مقرر کی ہیں (۱) انہیں تکلیفیں پہنچا کر مارا جائے (۲) یا انہیں سولی دیا جائے (۳) یا ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں (۴) یا انہیں جلاوطن کیا جائے۔ یعنی ڈاکہ زنی کی صورت میں جرم کی جیسی نوعیت ہوگی۔ اس کے مطابق ان کو سزا دی جائے گی۔ (۵:۳۳)

پھر قرآن کا قانون قصاص یہ ہے کہ "جس طرح کسی نے زیادتی کی ہو اسی طرح اس سے بدلہ لیا جائے گا" (۳:۱۹۴) اب ان ڈاکوؤں نے چرواہے کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری تھیں تو ان کی آنکھوں میں بھی پھیری گئیں انہوں نے چرواہے کو تپتی ریت پر ڈال دیا تھا تو ان سے بھی یہی سلوک کیا گیا۔ انہوں نے چرواہے کو پیاسا مارا تھا تو ان کو بھی پیاسا رکھا گیا۔ ڈاکہ زنی کے عوض ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے چرواہے کو جان سے مار ڈالنے کے عوض ان کو مار ڈالا گیا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

رہی یہ بات کہ جب آپ رحمۃ للعالمین تھے تو یہ سب سزائیں کیوں دیں۔ یا ان میں تخفیف اور رحمت کا پہلو کیوں نہ اختیار کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت میں پہنچ جائے اور جرم ثابت ہو جائے تو قاضی کو رحمت کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ وہ سزا دینے میں نرمی نہیں برت سکتا۔ (۲:۱۸)

㊴ بندر کو سنگسار کیا گیا

عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ "میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا تو اسے ان سب نے سنگسار کیا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ اسے سنگسار کیا۔" (مقام حدیث ص۱۰۲۵)

تمام ذخیرہ حدیث کو بالعموم اور بخاری کو بالخصوص ناقابل اعتماد ثابت کرنے کیلئے منکرین حدیث کیلئے یہی حدیث سب سے بڑا اور لاجواب شاہکار ہے۔ اس پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

① کیا بندر بھی مکلف مخلوق ہیں یعنی وہ شرعی احکام کے پابند ہیں؟

② جس بندر یا بندریا کو رجم کیا گیا تو پہلے یہ ثابت کیا جانا چاہیئے کہ وہ منکوحہ تھی؟

③ اگر بندریا کو رجم کیا گیا تو بندر کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟

اب ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرما لیجیے جو یوں ہے کہ۔

"عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں یمن میں تھا۔ اپنے لوگوں کی بکریوں میں ایک اونچی جگہ پر میں نے دیکھا کہ ایک بندر بندریا کو لے کر آیا اور اس کا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اتنے میں ایک چھوٹا بندر آیا اور بندریا کو اشارہ کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ پہلے بندر کے تلے سے کھینچ لیا اور چھوٹے بندر کے ساتھ گئی۔ اس نے اس کے ساتھ صحبت کی۔ میں دیکھ رہا تھا صحبت کے بعد بندریا لوٹی اور آہستگی سے پھر اپنا ہاتھ پہلے بندر کے سر کے نیچے ڈالنے لگی۔ جس پر وہ جاگ اٹھا گھبرایا ہوا اور بندریا کو سونگھا اور ایک چیخ ماری۔ تو سب بندر جمع ہو گئے۔ یہ اسی بندریا کی طرف اشارہ کرتا تھا اور چیختا جاتا تھا (یعنی اس نے زنا کیا ہے) آخر دوسرے بندر داہنی بائیں طرف گئے اور اس چھوٹے بندر کو لے کر آئے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے اس بندریا اور اس زانی بندر کے لیے گڑھا کھودا اور دونوں کو سنگسار کر ڈالا۔ تو میں نے بنی آدم کے سوا جانوروں میں بھی رجم دیکھا۔" (تیسیر الباری ج۲۔ ص۶۲۶)۔

اب یہ دیکھئے:

① بندر ہی وہ مخلوق ہے جو حس و شعور کے لحاظ سے انسان سے قریب تر ہے (اسی لیے ڈارون اور اس کے معتقدین اسے انسان کا جد امجد قرار دیتے ہیں) اور انسان کی نقالی بھی خوب جانتا ہے۔

② بنی اسرائیل کا ایک فرقہ جس نے احکام سبت کی نافرمانی کی تھی اسے بندر بنا دیا گیا تھا۔ (۶۵:۲)

③ بنی اسرائیل میں زنا کی سزا رجم تھی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ یہ بندروں کا گروہ اسی فرقہ بنی اسرائیل سے روابط رکھتا ہو جسے بندر بنا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اور ان میں زنا کی سزا کا شعور بھی موجود ہو۔ تیسیر الباری میں واقعہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے۔ وہ اس واقعہ کو عقل سے بہت قریب کر دیتی ہے۔ نکاح والا اعتراض بھی حل کر دیتی ہے کہ ان میں بھی باہمی ایجاب و قبول کو نکاح ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس اعتراض کا بھی کہ اکیلی بندریا کو ہی کیوں رجم کیا گیا تھا۔ بندریا اور بندر دونوں کو رجم کرنا چاہیئے تھا۔

اب اس حدیث کا دوسرا پہلو سامنے لائیے۔ یہ واقعہ منسوب الی الرسول ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ کسی صحابی کی طرف بھی منسوب نہیں۔ اس حدیث کے راوی عمرو بن میمون صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں۔ پھر اسے وہ کسی کی طرف منسوب بھی نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس واقعہ کو درست تسلیم کرنا ایمانیات میں داخل نہیں نہ ہی اس کے انکار پر کسی شخص کو دائرہ اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ (جیسا کہ طلوع اسلام ڈھنڈورا پیٹتا ہے) ہم اس واقعہ کو صرف اس حد تک درست سمجھتے ہیں کہ یہ ایک تو قرین قیاس ہے۔ دوسرے اس واقعہ کو روایت کرنے والے اشخاص قابل اعتماد ہیں۔

(۴۰) جنّ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا آج کی رات میرے پاس ایک جن آیا (یا کچھ ایسا ہی لفظ کہا) تاکہ نماز میں خلل ڈالے۔ اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم لوگ صبح کو دیکھ لو........ حضور نے اس جن کو خوار کر کے چھوڑ دیا۔" (ص ۳۳۵)

جنات پر بھی بحث مرئی چیزوں سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم درج ذیل حقائق قرآن کریم سے ثابت ہیں۔

(۱) انسانوں کی طرح وہ بھی شرعی احکام کے پابند اور مکلف مخلوق ہیں۔ جو آخرت میں عذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوں گی۔ (۵۱:۵۶ نیز ۷:۱۷۸)

(۲) جو نبی بنی نوع انسان کے لیے مبعوث رہے وہی نبی جنوں کے لیے بھی تھے۔ (دیکھئے سورہ جن) آپ چونکہ امت کے سردار ہیں لہٰذا لامحالہ جنوں کے بھی سردار ہوئے۔

(۳) جن آتشین مخلوق ہے وہ اپنی شکل بدلنے پر قدرت رکھتی ہے اور انسانوں کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے (سورہ جن)۔

(۴) انسان تو ایک مادی اور مرئی مخلوق ہونے کی وجہ سے صرف کلام کے ذریعہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں اور یہ کام جن بھی کرتے ہیں لیکن غیر مرئی ہونے کی وجہ سے ان کے وسوسہ ڈالنے کے وسائل بڑھ جاتے ہیں (۱۱۴:۵-۶)

(۵) یہ نماز نماز تہجد تھی۔ جو آپ اکیلے ادا کرتے تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ان سب حقائق کی روشنی میں اس حدیث کو دیکھ کر بتایئے کہ کیا کوئی اعتراض باقی رہ جاتا ہے؟

حرفِ آخر

"یہ ہے نمونہ ان احادیث کا جو بخاری شریف میں درج ہیں۔ اس میں اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں۔ ان احادیث میں سے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا جائے۔ تو ان حضرات کے نزدیک آپ کافر ہو جاتے ہیں۔" (مقام حدیث ۳۳۵)

یہ تو واقعی طلوع اسلام کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے اور بہت سی ایسی احادیث کو پردہ اخفاء میں رکھا ہے تاکہ پھر کسی وقت کام آسکیں۔ رہا کافر ہونے کا معاملہ تو آپ ہی کے کہنے کے مطابق امام ابو حنیفہؒ نے کئی احادیث کا انکار کیا۔ لیکن انہیں (معاذ اللہ) کوئی بھی کافر نہیں کہتا۔ اور اگر آپ ایک حدیث کا بھی انکار کردیں تو آپ کافر ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا معمہ نہیں جس کی اصل وجہ آپ نہ جانتے ہوں۔

پھر فرمایا "اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ کیا اس قسم کی احادیث اس قابل ہیں کہ ان کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ فی الواقع رسول اللہ کے ارشادات ہیں اسی قسم کی وہ احادیث ہیں جن کے انکار کرنے پر طلوع اسلام کو منکر حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج کیا جاتا ہے۔" (ایضاً)

پھر فرمایا: "اور اسی قسم کی ہیں وہ احادیث جن کو پیش کر کے مخالفین اسلام حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو (معاذ اللہ) مورد طعن و تشنیع ٹھہراتے ہیں۔ طلوع اسلام ان سے کہتا ہے کہ یہ احادیث ہمارے رسول کی ہیں ہی نہیں۔ اس لیے حضور کا دامن اس قسم کے اعتراضات سے پاک ہے اور یہ ہے اس کا وہ جرم جس کی پاداش میں اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔" [1] (م۔ح ص۳۲۶)

اب دیکھئے یہ کیسا آسان طریق ہے کہ مخالفین اسلام ان احادیث پر اعتراض کریں ان کا سرے سے انکار ہی کر دیا جائے۔ مخالفین اسلام تو قرآن پر بھی بہت سے اعتراض کرتے ہیں۔ پھر کیا آپ قرآن کی ایسی آیات کا بھی انکار کر دیں گے؟ جہاں تک مخالفین کے اعتراض کا معاملہ ہے وہ تو بات ایک ہی ہے۔ قرآن پر اعتراضات کا جواب دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ایسی قرآنی آیات کا انکار کر دیا جائے جیسا کہ حدیث کے معاملہ میں آپ نے کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو مدلل، معقول مسکت جوابات دیئے جائیں۔ طلوع اسلام سے یہ تو نہ ہو سکا۔ الٹا اس نے قرآن کی تاویل ہی اس انداز سے کر ڈالی۔ جو مخالفین اسلام کے افکار کی ترجمانی کرتی ہے۔

---

[1] ان تمام باتوں کا تفصیلی جواب "طلوع اسلام کے کفر کی اصل وجہ" کے تحت دیا جا چکا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: ہشتم

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی شرعی تبدیلیاں

انکار حدیث کا فتنہ بڑا پہلو دار ہے اور اسی لحاظ سے منکرینِ حدیث کی بھی کئی اقسام بن گئی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو حدیث کو حجت سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت۔ ان کے نزدیک تمام تر ذخیرہ احادیث دفتر بے معنی ہے۔ وہ اپنا کام صرف قرآن سے چلانا چاہتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے۔ یہ اہل قرآن کہلاتے ہیں جن کے لیڈر مولوی عبداللہ چکڑالوی تھے۔ یہ فرقہ مسلسل ناکامیوں کے بعد اب قریباً قریباً اپنا وجود ختم کر چکا ہے۔

دوسرا گروہ اس ذخیرہ احادیث کو صرف تاریخ کی حد تک مفید سمجھتا ہے۔ جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق احادیث سے اپنی تحریروں اور دفتروں کو سجاتے ہیں اور ایک کثیر حصہ کو اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق رد کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کی نمائندگی اس دور میں ادارہ طلوع اسلام کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی حدیث درست بھی ہو تو بھی وہ دور نبوی کے لیے حجت تھی۔ بعد کے ادوار کے لیے اور اسی طرح آج بھی وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو کسی حدیث کے درست ثابت ہو جانے کے بعد یا بالفاظ دیگر سنت رسول کو حجت شرعیہ تو ضرور سمجھتا ہے مگر ان کے خیال کے مطابق اسوہ حسنہ کا ایک قلیل حصہ ہی ایسا ہے جو تشریعی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی حصہ غیر متبدل ہے جیسے عبادات کو بجالانے کے طریقے' رہا معاملات پر مشتمل ایک کثیر حصہ سنت رسول' تو اس حصہ میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت تبدیلیوں کے جواز کے قائل ہیں۔ آج کل اس گروہ کی نمائندگی ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کر رہا ہے۔ یہ حضرات سنت تو درکنار' حالات کے تقاضوں کے مقابلہ میں قرآنی احکام کو بھی متبدل سمجھتے ہیں۔ حدیث کو مقبول و مردود قرار دینے کے لیے بھی ان کے معیار الگ ہیں گویا جس نتیجہ پر طلوع اسلام پہنچا تھا۔ یہ حضرات بھی بالآخر وہیں جا پہنچے ہیں۔ اگرچہ ان کا راستہ جداگانہ ہے۔

مذکورہ بالا تین گروہوں کے علاوہ ایک چوتھا گروہ ایسا بھی ہے جو سنتِ رسول کو فی الواقع شرعی حجت اور شرعی قوانین کا مستقل اور الگ ماخذ تسلیم کرتا ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ محدثین کے کیے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہوئے کام پر پوری طرح مطمئن نہیں۔ یہ حضرات درایت کو روایت سے زیادہ قابل اعتناء سمجھتے ہیں۔ خبر واحد کی حجت کے سلسلہ میں خاصی لچک رکھتے ہیں اور ہر خبر واحد کو قابل اتباع نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک خبر واحد عقیدہ کی بنیاد نہیں بن سکتی خواہ وہ صحیح ہو۔ ایسے لوگوں کو منکر حدیث یا سنت کہنا تو بہت زیادتی ہوگی تاہم بعض پہلوؤں میں ان کی سرحدیں منکرین حدیث سے جا ملتی ہیں۔

آج ہم گروہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ کوئی بھی صحیح حدیث یا سنت رسول بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت غیر متبدل نہیں رہ سکتی اور اس میں حسب ضرورت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر سنت رسول فی الواقع غیر متبدل ہوتی تو خلفائے راشدین ان میں تبدیلیاں کیوں کرتے رہے۔ ان خلفائے راشدین کے ایسے اقدامات میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ ادارہ طلوع اسلام کی نظر انتخاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بطور "شہکار رسالت" محض اس لیے پڑی کہ ادارہ مذکور کے خیال کے مطابق تمام تر "شرعی ترمیمات" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھیں تو یہ بات بھی بے جا نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں پہلے تو "اولیاتِ عمر" کا ہوا دکھایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کم وبیش نصف صد ایسے امور ہیں جو دور نبوی میں موجود نہیں تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی ابتداء کی تھی۔ لیکن یہ حضرات ایسے نصف صد امور درج کرنے سے عموماً گریز کیا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے چند ایک ایسے امور لکھ دیتے ہیں جن کا تعلق فی الواقع امور شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے ان اولیات عمر رضی اللہ عنہ میں چونکہ بیشتر امور محض تدبیری قسم کے ہیں لہٰذا ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سے ایک عام قاری کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اگر نصف صد کے قریب سنت رسول ایسی ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تبدیلی کر دی تو پھر سنت رسول غیر متبدل کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان "اولیات عمر" کو پہلے مکمل طور پر درج کر دیا جائے۔ تبصرہ کی باری بعد میں آئے گی۔ یہ تفصیل عام تاریخ کی کتابوں میں یکجا طور پر کم ہی ملتی ہے۔ ہم یہ تفصیل ایم اے تاریخ کی کتاب تاریخ اسلام کے صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴ سے پیش کر رہے ہیں۔

اولیاتِ عمر رضی اللہ عنہ

① بیت المال یا خزانہ قائم کیا۔
② سنہ ہجری قائم کیا۔
③ عدالتیں بنائیں اور قاضی مقرر کیے۔
④ امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔
⑤ فوجی دفتر قائم کیا۔
⑥ مالی دفتر ترتیب دیا۔
⑦ رضاکاروں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
⑧ پیمائش کا طریقہ جاری کیا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑨ مردم شماری کرائی۔
⑩ نہریں کھدوائیں۔
⑪ شہر آباد کرائے۔
⑫ مقبوضہ ممالک کو صوبوں میں تقسیم کیا۔
⑬ عربی تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔
⑭ درے کا استعمال کیا۔
⑮ جیل خانہ قائم کیا۔
⑯ پولیس کا محکمہ قائم کیا۔
⑰ پرچہ نویس مقرر کیے۔
⑱ رات کو گشت کر کے رعایا کا حال معلوم کرنے کا طریقہ نکالا۔
⑲ راستے اور مسافروں کے لیے کنوئیں اور سرائیں بنوائیں۔
⑳ نادار عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے۔
㉑ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔
㉒ قیاس کا اصول وضع کیا۔
㉓ مدرسے کھولے۔
㉔ معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
㉕ گھوڑوں کی نسل میں اصیل وغیرہ کی تمیز قائم کی۔
㉖ راستے میں پڑے بچوں کی پرورش کے لیے روزینے مقرر کیے۔
㉗ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قرآن مدون کرایا۔
㉘ فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا۔
㉙ وقف کا طریقہ ایجاد کیا۔
㉚ مسجدوں میں وعظ کا طریقہ ایجاد کیا۔
㉛ اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔
㉜ مسجدوں میں روشنی کا اہتمام کیا۔
㉝ ہجو گو کے لیے سزا مقرر کی۔
㉞ غزلوں میں عورتوں کے نام لینے کی ممانعت کی۔
㉟ عشر مقرر کیا۔
㊱ دریا کی پیداوار پر محصول لگایا۔
㊲ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔
㊳ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا جملہ بڑھایا۔
㊴ تراویح کی نماز باجماعت پڑھنے کا اہتمام کیا۔
㊵ جنازے کی نماز میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا۔
㊶ ایک ہی دفعہ دی ہوئی تین طلاقوں کو بائن ٹھہرایا۔
㊷ شراب کی حد اسی (۸۰) کوڑے مقرر کی۔
㊸ بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیے کے بجائے زکوٰۃ مقرر کی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مندرجہ بالا فہرست میں نصف صد کے بجائے ۴۳ امور کا اندراج ہے۔ جن پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے پہلے ۳۲ امور ایسے ہیں جن کا تعلق صرف تدبیر سے ہے۔ شریعت سے نہیں۔ لہٰذا ان پر بدعت یا تبدیلی سنت کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ دور نبوی یا خلفائے راشدین میں نہ ریل تھی نہ تار برقی نہ ٹیلی فون نہ ریڈیو نہ وائرلیس وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر یہ محکمے اپنے اپنے محکمہ کے انتظام کے لیے ایسے امور طے کریں یا ایسے قوانین بنالیں جن سے کوئی شرعی حکم مجروح نہ ہوتا ہو تو یہ وقت کا تقاضا اور ایک مستحسن کام ہوگا۔ جس پر تبدیلی سنت یا بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا۔ یہی صورت پہلے ۳۲ امور کی ہے۔ البتہ ۳۳ سے ۴۳ تک گیارہ امور ایسے ہیں جن کا بظاہر شرعی امور سے تعلق معلوم ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اب ہم جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی رکن ادارہ ثقافت اسلامیہ کی تصنیف "اسلام' دین آسان" کے صفحہ ۱۴ تا ۱۶ سے ان ۱۶ "شرعی تبدیلیوں" کا ذکر کرتے ہیں جن میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو بھی شامل فرمایا ہے۔

۲۔ جعفر شاہ صاحب کی پیش کردہ "شرعی تبدیلیاں"

دور فاروقی: شاہ صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل "شرعی ترمیمات" کا ذکر فرمایا ہے۔

(۱) دور نبوی میں غزلوں میں عورتوں کا نام لینے یا ذکر کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شعراء کو آگاہ کر دیا کہ جو شخص کسی عورت کا نام لے کر تشبیب کرے گا میں اسے کوڑوں کی سزا دوں گا۔

(۲) جب قریش مکہ نے اسلام' اہل اسلام نیز رسول اللہ کی شان میں بھی ہجو یہ اشعار کہنے شروع کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جوابی ہجو کی اجازت دی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں یہ حکم جاری کیا کہ ان اشعار کو اب زبان پر نہ لایا جائے۔ کیونکہ اس سے گذشتہ رنجشیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور تک شرابی کی تعزیر چالیس درے تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بڑھا کر اسی درے کر دیا اور حضرت عثمان نے مختلف اوقات میں دونوں طرح کی سزا دی۔ یعنی کبھی چالیس کوڑے اور کبھی اسی۔

(۴) دور صدیقی تک ام ولد (جس لونڈی کے بطن سے کوئی اولاد ہو جائے) کی خرید و فروخت جائز تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ام ولد کی خرید و فروخت کو روک دیا کیونکہ قوانین غلامی کا اصل مقصد غلامی کی رسم کو ختم کر دینا ہی تھا۔

(۵) غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قیدی کا فدیہ ایک دینار مقرر فرمایا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔

⑥ حضور ﷺ کے زمانہ میں مفتوحہ زمینیں (مثلاً خیبر) مجاہدین میں تقسیم کی گئیں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی زمینیں مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے قومی تحویل میں لے لیں۔

⑦ دور صدیقی تک بیک مجلس تین طلاق کو طلاق رجعی قرار دیا جاتا رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اسے طلاق مغلظہ قرار دیا۔

⑧ حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو حضور ﷺ نے محض ملعون قرار دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اعلان فرمایا کہ "حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو سنگسار کر دوں گا"

⑨ حضور ﷺ نے پورے رمضان میں کبھی بیس رکعت اور وہ بھی باجماعت نماز نہیں پڑھی۔ دور صدیقی میں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس کا باقاعدہ اہتمام فرمایا اور وہ اب تک رائج ہے۔

⑩ حضور ﷺ نے کاشت اجناس کی شرح خراج کی تفصیل نہیں بتائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں بالتفصیل ہر جنس کے متعلق خراج کی شرح (کہ فلاں جنس میں فی جریب اتنا) متعین فرمائی۔

⑪ حضور ﷺ نے یہ کبھی نہ فرمایا کہ "کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا" لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا۔

⑫ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصارف زکوٰۃ سے "مؤلفۃ القلوب" کی مد کو ختم کر دیا اور کہا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

⑬ دور صدیقی تک غیر شادی شدہ کی سزائے زنا سو کوڑے کے ساتھ ایک سال کی ملک بدری بھی تھی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ملک بدری کو روک دیا۔

⑭ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولیات کو بھی جن کی تعداد کم وبیش نصف صد ہے۔ اسی میں داخل سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً تجارتی گھوڑوں اور دریائی پیداوار پر زکوٰۃ قائم کرنا وغیرہ اسی طرح اور بھی بیسیوں مسائل ہیں۔

دور عثمانی :

⑮ عہد فاروقی تک جمعہ کے دن قبل از خطبہ جمعہ ایک ہی اذان ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب تمدن وسیع ہو گیا اور کاروبار تجارت میں خاصا پھیلاؤ پیدا ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ایک اور اذان کا اضافہ فرمایا۔ جواب تک رائج ہے۔

دور علوی :

⑯ دور عثمانی تک اجازت قرآنی کے مطابق کتابیہ عورت سے نکاح کا رواج تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں مسلمانوں کو بعض فتنوں کے اندیشے کی وجہ سے روک دیا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ عبادات سے لے کر معاملات تک میں بیسیوں شرعی ترمیمات محض اس لیے ہوتی رہیں کہ بدلتے ہوئے حالات کا یہی تقاضا تھا۔" (ص ۱۶)

"یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو فیصلہ نبوی اور فیصلہ صدیقی بدلنے کا اختیار ہو لیکن خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بدلنے کا کسی کو حق نہ ہو۔" (ایضاً ص ۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس میں شاہ صاحب نے ایک دفعہ تو نصف صد کے قریب "اولیات عمر" کا ذکر فرمایا اور دو دفعہ "بیسیوں شرعی ترمیمات" کا مگر جب لکھنے بیٹھے تو بہ مشکل ۱۶ نمبر پورے کر سکے۔

پرویز صاحب کے پیش کردہ اختلافی فیصلے

اب ہم اسی قبیل کی وہ "شرعی ترمیمات" درج کرتے ہیں جو پرویز صاحب نے "اختلافی فیصلے" کے عنوان کے تحت اپنی تصنیف شہکار رسالت کے صفحہ ۲۷۷ تا ۲۸۰ پر درج فرمائے ہیں اور بالآخر یہی نتیجہ پیش کیا ہے کہ سنت رسول ایک متبدل چیز ہے۔

1. تطلیق ثلاثہ جس کا ذکر پہلے دو بار آچکا ہے۔
2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا تو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اسی کے پاس رہتی تھی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی غیر منقولہ جائیداد اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کے کفاف (بدلہ) کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔
3. شرابی کی تعزیر میں اضافہ جس کا ذکر دو بار پہلے آچکا ہے۔
4. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کی زمانہ میں چوری کی سزا موقوف کر دی۔ اور قرآن کریم کے عام حکم کو مشروط بہ حالات کر دیا۔ نیز آپ نے جنگ کے دوران سزا دینے سے بھی منع کر دیا۔
5. مصارف زکوٰۃ میں تالیف قلوب کی مد کو ختم کر دیا۔
6. دور نبوی میں آپ کے ارشاد کے مطابق حج کے ایک رکن طواف کے پہلے تین چکر عام رفتار سے تیز لگائے جاتے تھے۔ ایسی چال کو رمل کہتے ہیں۔ اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ کافروں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان مدینہ جا کر کمزور ہو گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس الزام کی تردید کے طور پر مسلمانوں کو ایسا حکم دیا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں کہا۔ اب وہ مصلحت باقی نہیں رہی۔ نہ مخالفین باقی رہے نہ ان کی طنز۔ لہٰذا اب ہمیں معمول کے موافق طواف کرنا چاہیئے۔
7. کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگا دی۔ نیز آپ نے مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔
8. ام ولد کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑨ عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔
⑩ رسول اللہ ﷺ نے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بعض افراد امت کے وظائف مقرر کرتے وقت ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خدمات کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دیا۔
⑪ عشور (محصول چنگی) کی ابتداء کی۔
⑫ دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر ٹیکس عائد کیا۔
⑬ نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔
⑭ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا
⑮ خزانہ قائم کیا۔
⑯ سنہ ہجری رائج کیا۔
⑰ دفاتر قائم کئے اور رجسٹر مرتب کرائے۔
⑱ مردم شماری کرائی۔
⑲ مسجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔
⑳ شہر آباد کرائے۔ نہریں کھدوائیں۔

مندرجہ بالا بیان کردہ بیس امور میں سے آخری چھ امور تو بالکل انتظامی قسم کے ہیں۔ باقی ۱۴ قابل غور ہیں۔ گویا گیارہ امور تاریخ اسلام سے ۱۶ جعفر شاہ صاحب کے اور ۱۴ پرویز صاحب کے کل ۴۱ ہوئے۔ ان میں سے اگر تکرار کو حذف کیا جائے تو ۲۵ رہ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں پرویز صاحب نے کتاب شہکار رسالت کے صفحہ ۹۴-۹۵ پر "فقہ عمری" کے ذیلی عنوان کے تحت چھ ایسے امور کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سابقہ شریعت میں تبدیلیاں کیں۔ ان میں سے چار کی ہیئت تکرار کی ہے۔ البتہ دو باتیں نئی ہیں جو یہ ہیں۔

1 قرآن نے زنا بالجبر کے وقوعہ میں عورت کے لیے سزا کی کوئی تصریح نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو کوئی سزا نہیں دی۔
2 قرآن نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔

گویا یہ کل ۲۷ "شرعی تبدیلیاں" ہیں۔ ان کی وضاحت درج ذیل نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

شرعی ترمیمات کی کل تعداد کا نقشہ

نمبر شمار	تفصیل	تاریخ اسلام سے بمعہ نمبر	دین آسان سے بمعہ نمبر	شاہکار رسالت سے بمعہ نمبر
	نماز			
①	جنازے کی نماز میں چار تکبیر پر اجماع کرایا	۴۰	X	X
②	صبح کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا اضافہ	۳۸	X	۱۴
③	جمعہ کے خطبہ سے قبل ایک اذان کا اضافہ (حضرت عثمان)	X	۱۵	X
④	نماز تراویح۔ جماعت کا التزام کیا۔	۳۹	۹	۱۳
⑤	مصارف زکوٰۃ میں تالیف قلوب کی مد ختم کی	X	۱۲	۵
⑥	تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔	۳۷	۱۴/۱	۱۲/۱
	زکوٰۃ			
⑦	عشور مقرر کیا۔	۳۵	--	۱۱
⑧	دریا کی پیداوار پر محصول لگایا	۳۶	۱۴/۲	۱۲/۲
⑨	بنی تغلب کے عیسائیوں کے کہنے پر جزیے کی بجائے زکوٰۃ مقرر کی	۴۳	X	X
	حدود و تعزیرات			
⑩	قحط کے زمانہ میں چوری کی حد موقوف کی اور جنگ کے دوران ملتوی کی۔	--	---	۴
⑪	شراب کی تعزیر ۴۰ کوڑے کے بجائے ۸۰ کوڑے مقرر کی۔	۴۲	۳	۳
⑫	حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو سنگسار کرنے کا اعلان کیا	--	۸	--
⑬	غیر شادی شدہ کی سزا سے جلاوطنی کی سزا کو موقوف			

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کیا۔	--	۱۳	--
⑭ ہجو گو کے لیے سزا مقرر کی	۳۳	۲	--
⑮ زنا بالجبر کے مقدمہ میں عورت کو شرعی حد سے مستثنیٰ قرار دیا۔	--	--	۱۵

مناکحات

⑯ ایک مجلس کی تین طلاق کو طلاق مغلظہ قرار دیا۔	۴۱	۷	۱
⑰ کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگا دی۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بموجب شاہ صاحب) (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بموجب پرویز صاحب)	--	۱۶	۷

اموال

⑱ عراق کی زمینوں کو قومی تحویل میں لیا	--	۶	۹
⑲ ام ولد کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا	--	۴	۳
⑳ یہ اعلان کیا کہ کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا	--	۱۱	--
㉑ کسی مسلمان کی غیر منقولہ جائیداد کو غیر مسلموں میں تقسیم کر کے حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر کیا۔	--	--	۲
㉒ وظائف کا معیار اسلامی خدمات کے لحاظ سے مقرر کیا۔	--	--	۱۰
㉓ غزوہ تبوک میں قیدی کا فدیہ ایک دینار تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک کے لیے مختلف شرحیں مقرر کیں۔	--	۵	--
㉔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج کی صورت میں مختلف اجناس کی شرح مقرر نہیں کی۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کی۔	--	۱۰	--
㉕ قاتل کو مقتول کے ورثہ سے محروم کیا۔	--	--	۱۶

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

متفرقات

(۲۶) حج کے طواف سے رمل کو ختم کیا۔	--	--	۶
(۲۷) غزلوں میں عورتوں کا نام لینے یا ذکر کرنے کی ممانعت کی اور سزا کا اعلان کیا۔	۳۴	۱	-
میزان	۱۱	۱۶	۱۶

نقشہ بالا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درج ذیل ۱۴ امور ایسے ہیں جنہیں کسی ایک ہی نے بیان کیا۔ نمبر ۱، ۳، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ = ۱۴

اور درج ذیل ۸ امور پر کسی بھی دو کا اتفاق ہے۔

نمبر ۲، ۵، ۷، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۵ = ۸

اور مندرجہ ذیل ۵ امور تینوں نے بیان کیے ہیں۔

(۴) نماز تراویح کی جماعت (۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ (۸) دریائی پیداوار پر زکوٰۃ (۱۱) شراب کی تعزیر میں اضافہ (۱۵) تین طلاق بیک مجلس کو تین شمار کرنا۔

مندرجہ بالا شرعی ترمیمات کا جائزہ

اب ہم ان تمام مندرجہ امور کا نئی ترتیب سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) تدبیری امور

تدبیری امور سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی امر کے متعلق شرعی حکم موجود ہے۔ لیکن دور نبوی میں اس کے اطلاق کا موقعہ نہ آیا۔ بلکہ بعد میں آیا تو اس پر شرعی حکم کا اطلاق کر دیا گیا۔ مثلاً۔

۱۔ گھوڑوں پر زکوٰۃ: عرب میں اونٹ، بھیڑ بکری، گائے وغیرہ تو تجارتی اغراض کے تحت پالے جاتے اور بکثرت پائے جاتے تھے۔ لہٰذا ان پر رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ عائد کر دی۔ گھوڑے عرب میں بہت کم یاب تھے جو تجارتی بنیادوں پر نہیں بلکہ صرف رئیسانہ ٹھاٹھ کی نمائش کے طور پر ہی پالے جاتے تھے۔ جنگ بدر کے تین سو تیرہ مجاہدین کی سواریوں کا تناسب حفیظ جالندھری مصنف شاہنامہ اسلام کے درج ذیل شعر سے خوب واضح ہوتا ہے۔

یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے، نہاتے، غسل فرماتے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

قرآن کریم نے جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے گھوڑے پالنے کی ترغیب دلائی۔ اور ایسے گھوڑے جو جہاد کی غرض سے پالے جائیں یا صرف کسی شخص کے ذاتی استعمال میں آنے والے جانور یا اشیاء بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ [1] لیکن جب دور فاروقی میں اسلامی مملکت کی حدود ان ممالک تک پہنچ گئیں جہاں گھوڑے تجارتی بنیادوں پر پالے جاتے اور کثیر مقدار میں پائے جاتے تھے تو آپ نے ایسے گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ عائد کر دی۔ اسی اصول کے مطابق جن ممالک میں بھینسیں تجارتی اغراض کے تحت پالی جاتی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اور یہ کام عین سنت نبوی کے مطابق ہوگا۔ حالانکہ دور نبوی میں ایسی زکوٰۃ کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ کیونکہ عرب میں بھینسوں کا وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا بھی تو بہت قلیل مقدار میں تھا۔

۲۔ دریائی پیداوار پر زکوٰۃ : بالکل یہی صورت حال دریائی پیداوار پر زکوٰۃ عائد کرنے کی ہے۔ زمینی پیداوار پر زکوٰۃ آیات قرآنی (۶:۱۴۲) اور سنت نبوی دونوں سے ثابت ہے۔ اب عرب میں نہ دریا ہیں نہ دریا کی پیداوار۔ لہٰذا رسول اللہ کس چیز پر زکوٰۃ عائد کرتے۔ حکم یہ ہے کہ پیداوار پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ تو جہاں کہیں دریا' سمندر ہوں گے وہاں دریائی یا سمندری پیداوار ہوگی اس پر زکوٰۃ عائد کرنا عین اتباع کتاب وسنت ہوگا نہ کہ شرعی ترمیم۔

۳۔ عشور : اسی طرح ایک مسئلہ عشور کا ہے۔ جسے آج کی زبان میں کسٹم ڈیوٹی کہتے ہیں۔ اس کا معنی محصول چنگی غلط ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کسٹم ڈیوٹی بطور ایک عام ٹیکس کے نہیں بلکہ صرف ان غیر مسلم تاجروں پر لگائی تھی جو عرب میں یا اسلامی مملکت میں مال درآمد کرتے تھے۔ اور صرف اس لیے لگائی تھی کہ غیر مسلم ممالک نے پہلے مسلمان تاجروں سے اس قسم کا ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا تھا جس کے جواب میں علیٰ سواء کے اصول کے مطابق غیر مسلم تاجروں پر بھی یہ ٹیکس لگا دیا تھا یہ مسئلہ تدبیر مملکت سے متعلق رکھتا ہے نہ کہ شریعت سے۔ پھر اس سے کوئی شرعی حکم بھی مجروح نہیں ہوتا تو اسے "شرعی ترمیم" کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ رہا اس کی شرح کا مسئلہ تو ہر حکومت اس معاملہ میں آزاد ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ شرعی تو ہے نہیں جس کی شرح معین ہوتی ہے۔

۴۔ نو مسلم کی جائیداد غیر منقولہ : اسی طرح اگر کوئی مسلمان حکومت کسی نو مسلم کی غیر منقولہ جائیداد کو کسی مصلحت کی بناء پر غیر مسلموں کو دے کر اس کا کفاف وظیفہ کی شکل میں اس نو مسلم کو دے دے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے کونسا شرعی حکم مجروح ہوتا ہے جو اسے شرعی ترمیم کا نام دیا جائے۔ یہ ایک تدبیری مسئلہ ہے اور تدبیر ہمیشہ پیش آمدہ معاملات کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے اور ایسی تدابیر میں مختلف ادوار میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ایسا اختلاف کسی شرعی امر پر ذرہ بھر بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔

---

[1] مزید تفصیل کیلئے دیکھئے تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث مشکوۃ۔ ج ۲ ص ۵ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

۵۔ خراج کی شرح: خراج کی صورت میں مختلف اجناس کی شرح متعین کرنا بھی تدبیر ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اب قبلہ شاہ صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ شرح مقرر نہیں کی تھی۔ شاہ صاحب کو یہ تو بتانا چاہیئے تھا کہ دور نبوی میں خراجی زمینیں کہاں اور کون کون سی تھیں اور ان میں کیا کچھ فصلیں پیدا ہوتی تھیں جو آپ نے شرح متعین نہ فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعہ تو تب ہی آسکتا تھا جب ایسی خراجی زمینیں اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آتیں جن میں مختلف قسم کی اجناس بھی پیدا ہوتیں اور یہ دور دور فاروقی ہی ہے۔ دور نبوی یا صدیقی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ شرحیں بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ تدبیر سے تعلق رکھتا ہے۔

۶۔ زکوٰۃ کے برابر جزیہ: بنی تغلب کے مطالبہ پر جزیہ کی شرح کو زکوٰۃ کے برابر کر دینا بھی تدبیری امر ہے۔ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ضرور غیر متبدل ہے۔ لیکن جزیہ کا نصاب اور شرح غیر متبدل نہیں ہے۔ صدر مملکت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ایک ہی شہر کے بعض لوگوں سے عام شرح سے زیادہ جزیہ وصول کرے اور بعض کمزور و نادار بچوں یا عورتوں سے جزیہ کلیتاً ساقط کر دے۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اگر اسے اعتماد حاصل ہو جائے تو ذمیوں سے فوجی خدمت کے بدلہ ان سے جزیہ ساقط کر دے اور یہ بھی کہ اس کی شرح کو حالات کے مطابق زکوٰۃ کی شرح سے زیادہ یا برابر یا کم کر دے۔

۷۔ خطبہ جمعہ اور دوسری اذان: اذان کا مسئلہ اس لحاظ سے تدبیری ہے کہ اذان کے متعلق دور نبوی میں باقاعدہ مجلس مشاورت قائم ہوئی تھی اور شرعی اس لحاظ سے ہے کہ بالآخر اذان کے کلمات بذریعہ الہام ہی طے ہوئے تھے۔ اب جمعہ کی اذان کی خصوصیت یہ ہے اس اذان کے بعد مسجد میں جا کر خطبہ جمعہ سننا فرض اور دوسرا کوئی بھی کام کاج کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جیسا کہ شاہ صاحب نے وضاحت کر بھی دی ہے۔ جب دور عثمانی میں مدینہ کی آبادی دور دور تک پھیل گئی اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ دور رہنے والے لوگ اگر اذان سن کر چلیں تو ان کے مسجد پہنچنے تک خطبہ جمعہ، نماز جمعہ ختم ہی نہ ہو جائے اور لوگ بلا ارادہ ہی ایک گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔ لہٰذا ایک اہم دینی ضرورت کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ سے پہلے لوگوں کو بروقت متنبہ کرنے کے لیے ایک اذان کا اضافہ کیا۔ البتہ اس کے الفاظ وہی رہے جو الہامی تھے۔ ان میں کوئی ردو بدل نہیں کیا گیا۔

۲ امدادی امور

امدادی امور سے ہمارا مطلب ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق اصولی طور پر واضح احکام موجود ہیں اور انہیں واضح احکام کی تعمیل کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا جائے۔ مثلاً:

۸/۱ عربی غلام: اسلام غلامی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اب ہر وہ اقدام جو غلامی کو کم کرنے میں مد ثابت ہو گا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

شرعی ترمیم نہیں بلکہ امدادی امر ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان کہ "آئندہ کوئی عرب غلام نہیں بن سکتا" اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

۲/۹ نماز جنازہ کی چار تکبیریں: اسی طرح اسلام تفرقہ وانتشار کو شرک وکفر قرار دیتا اور شریعت کو تھامے رکھنے اور متحد رہنے کی سخت تاکید کرتا ہے۔ اب ہر وہ بات جو مسلمانوں سے کسی اختلاف کو دور کر کے ان میں اتحاد کی فضا قائم کرے۔ وہ شرعی ترمیم نہیں بلکہ کتاب وسنت کا اتباع ہوگا مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (یہ بھی واضح رہے کہ صحابہ کرام کے اجماعی فیصلے بذات خود شرعی حجت ہوتے ہیں۔ ان پر شرعی ترمیم کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا) اس اجتماع صحابہ میں جو بات زیر بحث آئی وہ یہ تھی کہ رسول اللہ کی زندگی کا آخری عمل کیا تھا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ آپ نے سب سے آخر میں جو نماز جنازہ پڑھائی اس میں چار تکبیریں ہوئیں تو چار تکبیروں پر سب صحابہ نے اجماع کر لیا۔ اس اجماع کی بنیاد اتباع سنت ہی تھی۔

۳/۱۰ نماز تراویح کی جماعت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں عشاء کے بعد مسجد گئے تو دیکھا کہ بہت سے لوگ فرداً فرداً یا مختلف چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں نماز تراویح ادا کر رہے ہیں۔ آپ نے اس انتشار کو ختم کر کے اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لیے ایک ہی جماعت کا حکم دے دیا اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کر دیا۔ تاہم آپ نے یہ حکم نہیں دیا کہ رمضان کا پورا مہینہ اس جماعت تراویح کا التزام کیا جائے۔ آپ کا حکم صرف یہ تھا کہ مسجد میں کئی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہونے سے یہ بہتر ہے کہ جماعت ایک ہی ہو اور یہ بات سنت رسول کے عین مطابق تھی۔ کیونکہ جن تین ایام میں رسول اللہ نے نماز تراویح پڑھائی تھی تو ایک ہی جماعت ہوتی تھی۔ رسول اللہ امام ہوتے تھے اور باقی تمام نماز تراویح ادا کرنے والے صحابہ مقتدی ہوتے تھے۔

رمضان کا پورا مہینہ نماز تراویح کا التزام دراصل مسلمانوں کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ خصوصاً حفاظ کرام کو یہ لالچ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ پورا قرآن التزام کے ساتھ سنا سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قطعاً یہ حکم نہ تھا کہ بلاناغہ پورا رمضان نماز تراویح کی جماعت ہوا کرے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم پر صحابہ کا اجماع بھی نہ ہوا۔ حتیٰ کہ خود حضرت عمر بھی شامل نہ ہوتے تھے۔ بخاری کی جس روایت میں آپ کا یہ حکم مذکور ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ دوسرے روز پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور ایک ہی جماعت دیکھ کر خوش ہوئے اور نیز فرمایا اگر یہ لوگ جس وقت نماز پڑھ رہے ہیں سو جاتے۔ اور جب سوتے ہیں اس وقت یہ نماز پڑھتے تو زیادہ بہتر تھا اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ پچھلی رات نماز تراویح ادا فرماتے تھے..... اور باجماعت نماز میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ موطا امام مالکؒ کی روایت کے مطابق آپ نے جب نماز تراویح کی جماعت کا حکم دیا تو گیارہ رکعت

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(یعنی وتر سمیت) کا ہی حکم دیا تھا۔ موطا ہی میں یزید بن رومان کا یہ اثر بھی موجود ہے کہ دور فاروقی میں بعض صحابہ ۲۳ رکعت (بمعہ وتر) نماز تراویح پڑھتے تھے۔ یہ صحابہ کا اپنا طرزِ عمل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نہ تھا۔ سنت نبوی سے ۱۱ رکعت ہی ثابت ہیں۔

۴/۱۱ ہجو کی سزا: اسلام کسی دوسرے کی تحقیر' تذلیل' اور تمسخر وغیرہ کو کبیرہ گناہ قرار دیتا ہے۔ کسی کی ہجو کرنا بھی اسی قسم کا جرم ہے۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سزا مقرر کردی۔ اب قبلہ جعفر شاہ صاحب اسے "شرعی تبدیلی" قرار دیتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ خود اسلام اور رسول اللہ کی ہجو کی گئی تو آپ نے کوئی سزا مقرر نہ کی بلکہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جواب دینے کو کہا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پوزیشن میں تھے۔ کہ کافر ہجو گویوں کو سزا دے سکتے؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خود شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سزا اس لیے مقرر کی تھی کہ اس سے پرانی رنجشیں تازہ ہوتی ہیں اور پرانی رنجشوں کو بھول جانا اور عفو ودرگزر سے کام لینا شریعت کی نگاہ میں نہایت مستحسن فعل ہے۔ پھر حضرت عمر کا یہ اقدام "شرعی ترمیم" کیونکر بن گیا؟

۵/۱۲ غزل میں عورت کا نام: اسلام فحاشی کا سخت دشمن ہے۔ اور ان تمام محرکات کا بھی جن سے فحاشی کو کسی نہ کسی طرح فروغ حاصل ہوتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اگر غزلوں میں عورتوں کا نام ذکر کرنے پر سزا مقرر کی تو ان کا یہ اقدام کتاب وسنت کے عین مطابق تھا۔ اب قبلہ جعفر شاہ صاحب کو اعتراض یہ ہے کہ کعب بن مالک کے قصیدہ نعتیہ "بانت سعاد" کی تشبیب ایک عورت "سعاد" سے ہی شروع ہوتی ہے اور اسے سب سے بہتر نعتِ نبوی میں شمار کیا جاتا ہے۔ تو عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی بات پر کیوں سزا مقرر کردی جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کچھ بھی نہ کہنے سے ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غالباً پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔ قبلہ شاہ صاحب نے اس کا کوئی ایسا حوالہ درج نہیں فرمایا کہ اس کی تحقیق کی جاسکتی۔ اگر بغرضِ تسلیم یہ ثابت ہو بھی جائے کہ یہ قصیدہ آپ کے سامنے پڑھا گیا اور آپ نے سکوت فرمایا۔ اس کی نہ تحسین فرمائی نہ مذمت تو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل مستحسن ہی قرار پائے گا کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام قرآن کریم کی اصولی تعلیم کا موید ہے۔

مغالطے

مغالطے سے مراد ایسے امور ہیں جن کی ابتداء کو غلط طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقتاً ان کی ابتدا دور نبوی میں ہی ثابت ہے۔ ایسے امور کو یا تو قبلہ شاہ صاحب اور پرویز صاحب کی لاعلمی پر محمول کیا جاسکتا ہے یا تجاہل عارفانہ اور مغالطہ آفرینی پر۔

۱/۱۳ صبح کی نماز میں الفاظ الصلوٰۃ خیر من النوم": حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ نہیں بلکہ یہ الفاظ دور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نبوی میں بھی کہے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

1 حضرت ابو محذورہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اذان کہتا تھا اور فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد میں کہتا "الصلٰوۃ خیر من النوم" (نسائی' کتاب الاذان' باب التثویب فی اذان الفجر)

2 انہی محذورہ سے موطا امام مالک میں ایک روایت یوں ہے:

"میں لڑکا تھا۔ میں نے حسنین کے روز رسول اللہ کے سامنے فجر کی اذان دی۔ جب میں حی علی الفلاح پر پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اب "الصلوۃ خیر من النوم" کا کلمہ ملا دے۔" (موطا امام مالک مترجم' ص:۹۵' مطبوعہ اسلامی اکیڈمی' اُردو بازار' لاہور۔)

3 حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نماز صبح کی خبر کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو لوگوں نے کہا کہ آپ سو رہے ہیں۔ تو بلال رضی اللہ عنہ نے کہا الصلوۃ خیر من النوم اس کے بعد فجر کی اذان کے لیے یہ کلمہ مقرر کیا گیا اور ایسا ہی حکم باقی رہا۔" (حوالہ ایضاً)

اب جس روایت سے یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ الصلوۃ خیر من النوم کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑھائے تھے وہ یوں ہے:

"امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موذن نماز صبح کی خبر کرنے کو آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سوتا پا کر "الصلٰوۃ خیرٌ من النوم یا امیر المومنین" کہا۔ حضرت عمر ﷺ نے کہا اس کلمے کو صبح کی اذان میں کہا کرو۔" پھر ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ اس کلمہ کے کہنے کا اصل موقع صبح کی اذان کے اندر ہے نہ کہ اذان سے باہر کیونکہ اذان کے بعد کسی کے پاس جا کر یہ کلمہ کہنا (جیسا کہ بعض امراء وحکام کی آرزو ہوتی ہے) قطعاً درست نہیں اور یہ کلمہ دور نبوی میں صبح کی اذان میں ہی کہا جاتا تھا۔" (حوالہ ایضاً)

۲/۱۴ قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا: قحط کے زمانہ میں چوری کی حد ساقط کرنا حضرت عمر ﷺ کی "شرعی ترمیم" ہرگز نہیں۔ اس کی اصل سنت نبوی سے ملتی ہے۔ چنانچہ خود جعفر شاہ صاحب نے یہ روایت درج فرمائی ہے کہ "عباد بن شرجیل نے کسی کھیت سے کچھ غلہ لے لیا۔ کھیت والے نے عباد بن شرجیل کو مارا اور اس کا کپڑا بھی چھین لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو آکر بتایا تو آپ نے فرمایا:

«مَا عَلَّمْتَهُ إِذَا كَانَ جَاهِلاً وَلاَ اَطْعَمْتَهُ إِذَا كَانَ سَاغِبًا» "اگر یہ نادان تھا تو نے اسے تعلیم نہیں دی اور اگر یہ بھوکا تھا تو تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔"

حضور ﷺ نے اس چور کو کوئی سزا نہیں دلوائی۔ بلکہ خود کھیت والے نے اس کا کپڑا بھی واپس کیا اور (مار کے بدلے) بہت سا غلہ بھی دیا (اسلام دین آسان ص۳۵۹)

اب ہم نہیں سمجھتے کہ اگر اسی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانہ میں چوری کی حد موقوف کر دی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تو یہ "شرعی ترمیم" کیسے بن گئی؟

۳/۱۵ غیر شادی شدہ کی سزائے زنا: جناب جعفر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد تک غیر شادی شدہ کی سزا کے سو کوڑے کے ساتھ ملک بدری بھی تھی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ملک بدری کو روک دیا۔" (اسلام دین آسان ص۱۵)

قبلہ شاہ صاحب نے اس دعویٰ کے لیے کوئی حوالہ قلمبند نہیں فرمایا۔ اب ہم بخاری کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا دعویٰ برخود غلط ہے زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ:

«سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَأْمُرُ فِيْمَنْ زَنَا وَلَمْ يُحْصِنْ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ قَالَ ابْنُ الشِّهَابِ فَأَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّ عُمَرَ بْنُ الْخَطَّابَ غَرَّبَ ثُمَّ لَمْ تَزَلْ تِلْكَ السُّنَّةَ»(بخاري، كتاب المحاربين، بَاب البكران يجلدان وينفيان)

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ اس شخص کے لیے جو کنوارا ہو کر زنا کرے' سو کوڑے لگانے اور ایک سال کی جلاوطنی کا حکم دیتے تھے۔ (اسی سند سے) ابن شہاب نے کہا کہ مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلاوطن کیا۔ پھر یہی طریقہ جاری ہوگیا۔"

اب دیکھئے ایک طرف جعفر شاہ صاحب کی بے حوالہ روایت ہے کہ عمرؓ نے جلاوطنی کی سزا موقوف کردی دوسری طرف بخاری کی مستند اور باحوالہ حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرؓ نے جلاوطنی کی سزا دی۔ پھر بعد میں یہی دستور چل نکلا۔ اب ان میں سے آپ جو چاہے تسلیم کر لیجیے۔ دراصل کنوارے کی سزا سے جلاوطنی کو موقوف کرنا حنفیہ کا مسلک ہے جسے غلطی سے عمرؓ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

ام ولد کی فروخت پر پابندی: جہاں تک ام ولد کی خرید و فروخت پر پابندی کا تعلق ہے تو یہ پابندی عمرؓ نے نہیں لگائی تھی' بلکہ سنت نبوی سے [1] ہی یہ حکم ثابت ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ وَطِيءَ أَمَتَهُ فَوَلَدَتْ لَهُ فَهِيَ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرٍ»(احمد ابن ماجه بحواله نيل الأوطار ۲/ ۲۲۱)

"ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اپنی لونڈی سے مباشرت کی پھر اس سے اس کا بچہ پیدا ہوگیا تو وہ لونڈی اس شخص کے مرنے کے بعد آزاد ہوگئی۔"

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ذَكَرْتُ أُمَّ إِبْرَاهِيْمَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ اِعْتَقَهَا وَلَدُهَا»(دارقطني بحواله أيضا)

"ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ام ابراہیم (ماریہ قبطیہ) کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا بچہ اس کی آزادی کا سبب بن گیا۔"

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان کرم فرماؤں کی معلومات کا منتہی شبلی نعمانی کی تصنیف ہے اس سے آگے تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

«عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ نَهٰى عَنْ بَيْعِ أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ وَقَالَ لَا يُبَعْنَ وَلَا يُوهَبْنَ وَلَا يُوْرَثْنَ يَسْتَمْتِعُ بِهَا السَّيِّدُ مَا دَامَ حَيًّا وَإِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ»
(مؤطا امام مالك، دارقطني بحواله أيضا)

"ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اولاد والی لونڈیوں کو بیچنے سے منع فرمایا اور کہا کہ نہ وہ بیچی جا سکتی ہیں۔ نہ ہبہ کی جا سکتی ہیں اور نہ ترکہ میں شمار ہو سکتی ہیں۔ جب تک ایسی لونڈی کا مالک زندہ ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب وہ مرجائے تو وہ لونڈی آزاد ہے۔"

۵/۱۷ زنا بالجبر اور عورت کی سزا: پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں زنا کی سزا تو موجود ہے لیکن زنا بالجبر کی سزا کے سلسلہ میں قرآن میں کوئی صراحت ہے نہیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فقہ فی القرآن کا کمال ہے۔ کہ آپ نے ایسی عورت کو سزا نہیں دی۔ (شہکار رسالت ص۹۵) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنت نبوی ہی کی پیروی کی تھی۔ ترمذی کی درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:

«أَنَّ امْرَأَةً خَرَجَتْ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ تُرِيْدُ الصَّلٰوةَ فَتَلَقَّاهَا رَجُلٌ فَجَلَّلَهَا فَقَضٰى حَاجَتَهُ مِنْهَا فَصَاحَتْ فَانْطَلَقَ وَمَرَّ بِهَا رَجُلٌ فَقَالَتْ إِنَّ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَعَلَ بِيْ كَذَا وَكَذَا وَمَرَّتْ بِعِصَابَةٍ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ . . . فَأَتَوْا بِهِ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَلَمَّا أَمَرَ بِهِ لِيُرْجَمَ قَامَ صَاحِبُهَا الَّذِيْ وَقَعَ عَلَيْهَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَنَا صَاحِبُهَا فَقَالَ لَهَا اِذْهَبِيْ فَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَكِ»(ترمذي أبواب الحدود، باب ما جاء في المرأة إذا استكرهت بالزنا)

دور نبوی ﷺ میں ایک عورت (صبح کی) نماز کے ارادہ سے نکلی۔ اسے ایک آدمی ملا جس نے اسے ننگا کیا پھر اس سے حاجت پوری کی وہ عورت چیخی تو وہ چلا گیا۔ ایک اور آدمی اس عورت کے پاس سے گزرا تو اس عورت نے کہا اس آدمی نے مجھ سے یہ یہ کام کیا ہے۔ پھر وہ مہاجرین کی ایک جماعت کے پاس سے گزری وہ اس آدمی کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے۔ جب آپ ﷺ نے اس مرد کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو اس عورت کے خاوند نے کہا یا رسول اللہ! میں اس کا خاوند ہوں۔ رسول اللہ نے اس عورت سے کہا چلی جاؤ اللہ نے تجھے معاف رکھا ہے۔

اسی مضمون کی حدیث سنن ابن ماجہ 'کتاب الحدود' اُردو ترجمہ مکتبہ سعودیہ کراچی 'ص:۳۱۱ پر موجود ہے۔

۶/۱۸ قاتل محروم الارث ہے: اسی طرح پرویز صاحب نے فرمایا کہ "قرآن کریم نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ "قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا" آپ نے دیکھا کہ اس فیصلے سے کتنے برے فتنے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے جس کی رو سے ہمارے ہاں جائیدادوں کی خاطر آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے یہ بھی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مستنبط ہوا کہ اسلامی حکومت قرآن کریم کے کسی مطلق حکم کو (یعنی جس میں کوئی شرط عائد نہ کی گئی ہو) مقید کر سکتی ہے۔ یعنی عندالضرورت اس پر شرائط عائد کر سکتی ہے۔" (ایضاً' ص:۹۵)

اب اگر پرویز صاحب حدیث کو ناقابل اعتنا سمجھ کر اس طرف توجہ ہی نہ فرمائیں تو ان پر حقیقت کیونکر منکشف ہو سکتی ہے جو یہ ہے کہ قاتل کا مقتول کے وارث نہ ہونے کا اصول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تفقہ فی القرآن کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنت رسول کی اتباع فرمائی تھی۔ اب درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے لطف کی بات یہ ہے کہ پہلی حدیث کے راوی بھی خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

«عَنْ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: لَيْسَ بِقَاتِلٍ مِيْرَاثٌ»(مؤطا امام مالك أحمد، ابن ماجه بحواله نيل الأوطار٦/ ١٩٤)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ کہتے تھے۔ "قاتل کے لیے مقتول کی میراث میں کوئی حصہ نہیں۔"

«عَنْ عُمَرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا»(أبوداؤد بحواله ايضا)

"عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "قاتل کو (مقتول کی وراثت سے) کچھ نہیں ملے گا۔"

«عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ»(ترمذي، ابن ماجه بحواله مشكوة باب الفرائض)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قاتل اپنے مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔"

اس مندرجہ حدیث کو نسائی بیہقی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ (مشکوۃ ترجمہ باب الفرائض فصل الثانی۔ حاشیہ پر حدیث مذکورہ بالا)

۱۹/۷ اسیروں کا فدیہ: قبلہ جعفر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "غزوہ تبوک میں حضور ﷺ نے ہر قیدی کا فدیہ ایک دینار مقرر فرمایا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔ اب دیکھئے کہ تبوک کی نہ جنگ ہوئی نہ کوئی کافر قیدی [1] بنایا گیا۔ پھر نہ معلوم قبلہ شاہ صاحب نے یہ بے حوالہ روایت کیوں درج فرما دی ہے۔ کہ تبوک کے قیدیوں کے لیے حضور نے ایک [2] دینار فدیہ مقرر کیا تھا؟

فدیہ لینے کا قصہ صرف اسارئ بدر کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی کوئی مخصوص رقم متعین نہ کی گئی تھی۔ بعض نادار اور پڑھے لکھے کافروں کا فدیہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض نادار اور ان پڑھ کافروں کو اس وعدہ پر بھی چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ آئندہ کافروں کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ حضرت عباس سے معمول سے بہت زیادہ رقم فدیہ کے طور پر لی گئی۔

---

[1] رحمۃ اللعالمین' ج:۲' ص:۲۰۲' از قاضی سلمان منصور پوری' مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

[2] یہ جنگ تبوک کے اسیروں اور ان کے فدیہ کی شرح کا قصہ بھی شبلی نعمانی کی تصنیف الفاروق سے بلا تحقیق درج کر دیا گیا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کیونکہ یہ بہت مالدار تھے۔ وقس علی ہذا۔ اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف ممالک میں فدیہ کی مختلف شرحیں مقرر فرمائیں تو اس سے کونسی سنت رسول یا شرعی حکم مجروح ہوا تھا؟ جس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر بھی "شرعی ترمیم" کا اطلاق ہو سکے۔

۸/۲۰ طواف اور رمل : پرویز صاحب کہتے ہیں کہ سنت رسول یہ تھی کہ طواف کے پہلے چکروں میں ذرا تیز چلا جائے۔ (رمل کیا جائے) اور یہ اس لیے تھا کہ کفار مکہ نے کہا کہ یثرب کی آب وہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا۔ تو آپ نے رمل اس لیے تجویز فرمایا کہ کافروں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ مسلمان ہرگز کمزور نہیں ہوئے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں کہا۔ کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نہ وہ حالات رہے' نہ وہ مصلحت نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا طنز اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہیئے۔" (شہکار رسالت ص۲۷۹)

پرویز صاحب نے جو کچھ فرمایا بجا فرمایا۔ لیکن حدیث کا آخری حصہ چھوڑ گئے جو یوں ہے:

«وَعَنْ عُمَرَ قَالَ: فِيمَ الرَّمْلَانِ وَالْكَشْفُ عَنِ الْمَنَاكِبِ، وَقَدْ اَطَّأَ اللهُ الْاِسْلَامَ وَنَفَى الْكُفْرَ وَاَهْلَهُ؟ وَمَعَ ذٰلِكَ لَا نَدَعُ شَيْئًا كُنَّا نَفْعَلُهُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ» (احمد ابوداؤد، ابن ماجه بحواله منتقي الاخبار، كتاب الحج، باب طواف القدوم والرمل...)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کندھے کھول کر اور کندھے ہلا کر تیز تیز چلنا کس لیے؟ اب تو اللہ نے اسلام کو پھیلا دیا اور کفر اور اہل کفر کو مٹا دیا ہے۔ بایں ہمہ ہم اس کام میں سے کچھ بھی نہ چھوڑیں گے' جسے ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں بجالاتے تھے۔"

اسی مضمون سے ایک دوسری ملتی جلتی حدیث کے راوی ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تھا:

«وَقَدْ اَهْلَكَهُمُ اللهُ تَعَالٰى ثُمَّ قَالَ شَيْءٌ صَنَعَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَلَا نُحِبُّ اَنْ نَتْرُكَهُ»

"اور اللہ نے کفار ومشرکین کو تو ہلاک کر دیا ہے پھر کہا ہر ایسی چیز جسے رسول اللہ ﷺ بجا لائے ہم نہیں چاہتے کہ اسے چھوڑ دیں۔"

یہ روایت احمد' بزار' حاکم بیہقی اور نسائی میں باختلاف الفاظ موجود ہے۔ (نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار' باب ایضاً)

اب دیکھئے ہمارے یہ دوست کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حالات کے بدلنے سے سنت رسول میں تبدیلی کر لیتے تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود یہ فرما رہے ہیں۔ کہ اگرچہ حالات بدل چکے ہیں۔ تاہم ہم ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتے جسے رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا تھا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ ان متضاد باتوں میں کس کی بات زیادہ قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اتباع سنت کا یہ حال تھا۔ کہ اگر وہ کسی کام کو بالکل بے کار اور عبث سمجھتے پھر بھی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے فی الواقع ایسا کہا تھا۔ تو اپنی عقل ودانش کو رد کر دیتے اور سنت رسول کی اتباع کرتے اور زبان سے اقرار بھی کرتے کہ اگرچہ مجھے یہ کام عبث معلوم ہوتا ہے۔ میں اسے صرف اس لیے سرانجام دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیا تھا چنانچہ حج کے دوران حجراسود کو مخاطب کرکے آپ نے فرمایا:

«عَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَيَقُوْلُ إِنِّيْ لَاَعْلَمُ إِنَّكَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا يَضُرُّ وَلَوْلَا أَنِّيْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُ مَا قَبَّلْتُكَ» (متفق علیه بحواله مشكوة، كتاب المناسك ،باب دخول مكه والطواف فصل ثالث)

''عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ حجراسود کو بوسہ دے رہے تھے اور کہتے تھے ''میں جانتا ہوں۔ تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔

۴ متوازی فیصلے

متوازی فیصلے سے ہماری مراد یہ ہے کہ رسول اللہ نے ایک سنت جاری فرمائی لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سنت کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا طریقہ اختیار فرمایا جو کہ قرآن کریم یا سنت نبوی سے ہی استنباط کیا گیا تھا مثلاً:

۴/۲۱ عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا: اس واقعہ کو منکرین حدیث بڑے شدومد سے پیش کرکے یہ ثابت کیا کرتے ہیں کہ سنت رسول ایک بدلنے والی چیز ہے۔ ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنت رسول کے خلاف کیسے زمینوں کو قومی تحویل میں لے سکتے تھے؟

ہم اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ شریعت صرف سنت رسول کا نام نہیں بلکہ کتاب وسنت کا نام ہے۔ رسول اللہ نے مجاہدین میں خیبر کی زمین تقسیم کی تھی تو وہ بھی ایک آیت کی رو سے ایسا کیا تھا کہ اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا باقی سب مجاہدین کا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ نے جو مفتوحہ زمینوں کو قومی ملکیت میں لیا تھا۔ تو وہ بھی ایک آیت کے ٹکڑے وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ (۱۰:۵۹) کی رو سے کیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل کو پرویز صاحب نے بھی شاہکار رسالت ص۶۸۔۶۹ پر ''قرآن سے استنباط نتائج'' کی ذیلی سرخی کے تحت دے دی ہے۔ لہٰذا ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قرآنی استنباط کو چونکہ تمام صحابہ نے درست تسلیم کر لیا تھا لہٰذا یہ فیصلہ بھی حجت شرعیہ کے مقام پر آ گیا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ حالات کے تقاضا کے ماتحت اور آیت قرآنی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمین مجاہدین میں تقسیم کی اور حالات کے ماتحت اور ایک آیت قرآنی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمینیں قومی تحویل میں لے لیں۔ لہٰذا آئندہ بھی ہر اسلامی حکومت ان دونوں فیصلوں میں سے جو بھی اسے سازگار ہو اختیار کر سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"شرعی ترمیم" کا اطلاق اس لیے نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک متوازی صورت ہے جو قرآن کریم ہی سے مستنبط ہے اور چونکہ اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ یعنی تمام صحابہ نے آپ کے قرآنی استنباط کو درست تسلیم کر لیا تھا۔ لہٰذا یہ شرعی حجت اور ایک متوازی صورت بن گئی۔

۴/۲۲ شراب کی تعزیر میں اضافہ: اس فیصلہ کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ کہ یہ فیصلہ آرڈی نینس کی صورت میں نافذ کیا گیا۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت وقتی اور عارضی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ مجلس شوریٰ میں بالا جماع طے پایا تھا کہ شرابی کو ۴۰ کے بجائے ۸۰ کوڑے لگائے جائیں۔ دلیل یہ تھی کہ اکثر شرابی بدمست ہو کر تہمت تراشیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس فیصلہ کی حیثیت شرعی حجت کی بن جاتی ہے۔ تو جس طرح مفتوحہ زمین مجاہدین میں تقسیم کر دینا بھی شرعی فیصلہ ہے اور قومی تحویل میں لے لینا بھی۔ اسی طرح مجرم کے حالات کے تقاضا کے مطابق اور جرم کی نوعیت کے پیش نظر ۴۰ کوڑے لگانا بھی شرعی فیصلہ ہے اور ۸۰ کوڑے لگانا بھی۔ اسی لیے حضرت عثمان نے مختلف اوقات میں ان دونوں پر عمل کیا تھا۔

⑤ درست اجتہادات

درست فیصلوں سے ہماری مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایسے فیصلے ہیں۔ جو حالات کے مطابق درست بھی تھے اور ان سے کوئی شرعی حکم مجروح بھی نہیں ہوتا مثلاً۔

۳/۲۳ کتابیہ عورت سے نکاح: کتابیہ عورت سے نکاح کا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ تاہم یہ اجازت ہی ہے۔ حکم نہیں اور ایسی اجازت کو خلیفہ وقت وقتی مصالح کی خاطر مطلوبہ عرصہ کے لیے ختم بھی کر سکتا ہے اور ایسے فیصلہ کی حیثیت محض وقتی فیصلے یا آرڈی نینس کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آرڈی نینس کے نفاذ کی وجہ سے جس میں جعفر شاہ صاحب اور پرویز صاحب دونوں نے وضاحت فرما دی ہے کہ "اس نکاح کی اجازت کی وجہ سے کتابیہ عورتوں سے نکاح کا رواج پڑ گیا۔ جس سے نئے نئے فتنے ابھرنے کا اندیشہ ہو گیا تھا" اندریں صورت حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ یا آرڈی نینس درست معلوم ہوتا ہے۔ تاہم جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ گورنر عراق کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلی بات جو پوچھی وہ یہ تھی کہ یہ شرعی حکم ہے یا آپ کی ذاتی رائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ حذیفہ بن یمان نے کہا۔ آپ کی ذاتی رائے کی پابندی ہم پر کوئی ضروری نہیں۔ چنانچہ اس ممانعت کے باوجود لوگوں نے کثرت سے شادیاں کیں۔

البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی کس خلیفہ راشد نے لگائی؟ اس سلسلہ میں جعفر شاہ صاحب کے بیانات متضاد ہیں۔ اسلام دین آسان کے صفحہ نمبر ۱۶ پر آپ فرماتے ہیں کہ یہ پابندی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لگائی تھی۔ مگر مقالات کے ص ۹۹ پر آپ فرماتے ہیں کہ:

"مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں کتابیہ کو نکاح میں لانے سے روک دیا یہ فقط ایک وقتی آرڈی نینس تھا۔"

اب چونکہ پرویز صاحب بھی اس پابندی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہی منسوب کرتے ہیں (شہکار رسالت ص ۲۷۹) لہٰذا یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے غالباً شرعی ترمیم کرنے والے خلفائے راشدین کی تعداد میں اضافہ کی خاطر اس پابندی نکاح کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ یہ ایک وقتی فیصلہ تھا شریعت کا فیصلہ اپنی جگہ پر اٹل اور قائم ودائم ہے۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ازروئے قرآن اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ یہ بھی اجازت ہے حکم نہیں اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان اور اہل کتاب ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے پھریں۔ یا ایک دوسرے سے بلا تکلف کھانے پینے کی اشیاء کا لین دین کیا کریں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عند الضرورت مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کا کھانا حلال ہے۔ اسی اصول کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی بستیوں سے اہل کتاب کے ذبیحہ خانے بند کرا دیے اور فرمایا کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ مسلمانوں کے اپنے ذبیحہ خانے بھی کفایت کر سکتے ہیں۔

۵/۲۴ زکوٰۃ کے مصارف اور تالیف قلوب: قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے۔ جن میں ایک مصرف تو تالیف کے لیے خرچ کرنا بھی موجود ہے۔ لیکن قرآن کریم کے ان بتائے ہوئے آٹھ مصارف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ آٹھ مدات کسی دور میں موجود نہ ہوں تو بہ تکلف یہ آٹھ مدات پوری کرو۔ مثلاً اگر عاملین زکوٰۃ میں سے کوئی یہ خدمت فی سبیل اللہ سرانجام دینا چاہے تو یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اسے بھی اس کا حصہ دے کے چھوڑو۔ یا کسی وقت کسی مقام پر فقراء ومساکین کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ تو اس آیت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پہلے فقراء و مساکین پیدا کرو۔ پھر انہیں ان کا حصہ دو۔ نہ ہی اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ پہلے تمام زکوٰۃ کے مال کو پورے آٹھ حصوں میں تقسیم کرکے ہر مد میں برابر تقسیم کردو۔ بلکہ اس تقسیم میں بھی پیش آمدہ حالات کو سامنے رکھ کر مال کو تقسیم کیا جائے گا قرآن کریم کے اس حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر یہ آٹھ مدات یا ان میں سے جتنی مدات موجود ہوں ان میں سے کسی کو محروم نہ رکھنا چاہیئے۔ ان مدات میں زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔

دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اسلام لانا مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ معاشرتی تکلیفوں کے علاوہ معاشی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بالخصوص ہجرت کی صورت میں تو ساری جائیداد سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا ان حالات میں تالیف قلوب کی ایک مد رکھی گئی جس سے نو مسلموں کو معاشی پریشانیوں سے نجات دلائی جاتی تھی۔ دور فاروقی میں یہ صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اس دور میں اسلام لانا مصائب کا باعث

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نہیں بلکہ عزو افتخار کا باعث بن گیا تھا اور نو مسلموں کو بھی فوراً پہلے مسلمانوں کے سے پورے حقوق فوراً حاصل ہو جاتے تھے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کی خاطر اس مد کو ختم کر کے یہ حصہ بھی دوسری قابل احتیاج مدات کی طرف منتقل کر دیا اور آپ کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے سنت نبوی کے مطابق بھی تھا کہ آپ اپنے پانچویں حصے میں سے ایک حصہ اپنے سارے ذوالقربیٰ میں تقسیم نہ فرماتے تھے۔ بلکہ صرف بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو چھوڑ دیتے تھے اور تقسیم بھی اس طرح نہیں کہ سب کو برابر دے دیتے۔ بلکہ ان میں سے ضرورت مندوں کی ضرورت کا لحاظ رکھ کر انہیں دیا کرتے تھے۔

⑥ اجتہادی غلطیاں

اجتہادی غلطیوں سے ہماری مراد آپ کے ایسے فیصلے ہیں جو آپ نے نافذ تو کر دیے لیکن بعد میں آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا مثلاً۔

۶/۲۵ وظائف میں اسلامی خدمات کا لحاظ : نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں امت کے ضرورت مند افراد کو ان کی ضرورت کے مطابق وظائف دیے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ وظائف کی مقدار کا تعین اسلام کی خدمت کے مدارج کے مطابق ہونا چاہیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی یہ رائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیش کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہم ان لوگوں کی ضروریات کا ہی خیال رکھیں گے اور ان کی اسلامی خدمات کا معاوضہ ان کو اللہ کے ہاں سے ملے گا پھر جب عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا۔ تو آپ نے فوراً اپنی رائے پر عمل درآمد شروع کر دیا اور وظائف کی تعیین کچھ اس طرح کی۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ حضور ﷺ سے قرابت کی بناء پر حضرت عباس، حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو پانچ پانچ ہزار، دفاعی جنگوں میں شریک ہونے والے مجاہدین کو چار چار ہزار، فتح مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والوں کو تین تین ہزار اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کے لیے دو ہزار درہم مقرر کئے۔ باقی لوگوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا اور وظیفہ سے کوئی محروم نہ رہا۔ (اسلام میں عدل اجتماعی سید قطب شہید صفحہ ۴۷۴-۴۷۵)

اسی معاشی پالیسی کے غلط اثرات آپ کی زندگی میں ہی نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جب آپ نے طبقاتی تقسیم کا آغاز اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیا تب جا کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور آپ نے ارادہ کیا کہ اگر اگلے سال تک زندہ رہا تو اس پالیسی کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پالیسی کے مطابق کر دوں گا مگر افسوس ہے کہ اگلے سال کے آنے سے پہلے ہی آپ کی شہادت واقع ہو گئی چنانچہ یہی پالیسی حضرت عثمان کے زمانہ میں جاری رہی اور طبقاتی تفاوت بڑھتا گیا۔ بہرحال یہ فیصلہ بھی تدبیری قسم کا ہی تھا جس سے اور واضح شرعی حکم مجروح نہیں ہوتا تھا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

۶/۲۶ ۔ ۶/۲۷ تطلیق ثلاثہ اور حلالہ : حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مسلمانوں میں یہ وبا عام دیکھی کہ وہ سنت رسول کے طریقہ کے خلاف بیک مجلس تین طلاق دیتے ہیں تو آپ نے ایسے لوگوں کو ان کی اس حرکت کی سزا یہ دی کہ ایسی تین طلاق کو قانوناً تین طلاق ہی شمار کر کے اسے طلاق رجعی کے بجائے طلاق بائنہ قرار دے دیا۔ اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ سیاسی نوعیت کا تھا تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کچھ باک نہیں ہے۔ کہ آپ کا یہ فیصلہ شرعی تبدیلی یا شرعی ترمیم" نہیں بلکہ براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف تھا۔ آپ اپنے اس فیصلہ کے حق میں یہ دلیل دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے طلاق کے سلسلہ میں آسانی رکھی تھی۔ مگر لوگوں نے کتاب اللہ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اب یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے۔ نیز فرماتے تھے کہ مَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔ یہ لوگ جو بیک وقت مجلس تین طلاق دینے میں اللہ تعالیٰ سے مطلق نہیں ڈرتے کیونکہ شرعی طریقہ کے مطابق طلاق نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ کسی طرح کی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عقل دانش اور سیاسی تدبر سے کسے انکار ہو سکتا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ بہرحال عام انسان ہی تھے نبی نہ تھے کہ ان کا ہر اجتہاد درست اور قابل احتجاج ہو۔ آپ کے اس فیصلہ کی غلطی کا اس سے زیادہ واضح اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ اس فیصلہ پر صحابہ کا اجماع نہ ہو سکا اور بڑے بڑے صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن عباس' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہم آپ کے اس فیصلہ کے خلاف تھے (اعلام الموقعین اردو' ص:۷۹۹' لابن القیم' مطبوعہ اہلحدیث اکادمی' اُردو بازار' لاہور)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ اس آرڈی نینس سے ڈر کر لوگ اپنے اس غیر شرعی فعل سے باز آجائیں گے۔ یہ کام تو ہو نہ سکا کیونکہ یہ فیصلہ محض سیاسی نوعیت کا تھا اور اس کی شرعی بنیادیں نہایت کمزور تھیں۔ اس کے برعکس اس فیصلہ سے ایک اور بڑا بگاڑ پیدا ہوگیا اور وہ یہ تھا کہ اب لوگ حلالہ کرنے اور کرانے کی راہیں اختیار کرنے لگے۔ جس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک نیا آرڈی نینس جاری کرنا پڑا جس میں آپ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے دونوں کے لیے "رجم" کی سزا کا اعلان کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آرڈی نینس کے ماتحت کسی محلل یا محلل لہ' کو رجم کیا بھی تھا یا نہیں۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ حلالہ والا آرڈی نینس تطلیق ثلاثہ والے آرڈی نینس کا ہی تتمہ یا دوسرا رخ تھا۔

انسان فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو طلاق کا طریقہ بتایا وہ اس فطرت کا لحاظ رکھ کر بتایا تھا۔ ایک ہی مجلس میں تین طلاق اسی جلد باز فطرت کا نتیجہ ہے اور جب ایسا ہی واقعہ دور نبوی میں ہوا تو آپ نے اسے ایک ہی طلاق شمار کیا۔ پھر دوبارہ یہ واقعہ ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

فرمایا کہ "میری زندگی میں کتاب اللہ سے کھیلنے لگے ہو؟" تاہم طلاق ایک ہی طلاق شمار کی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ محلل اور محلل لہ' دونوں ملعون ہیں۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تعزیراتی فیصلہ بھلا انسانی فطرت کو کیسے بدل سکتا تھا؟ نتیجتاً حلالہ کے واقعات رونما ہونے لگے جس کیلئے دوسرا آرڈی نینس جاری کرنا پڑا۔

بعد ازاں امام ابو حنیفہؒ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے مطابق فتوی دیا جو یہ تھا کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے والا سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تاہم تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ بعد کے ادوار میں لوگ گناہ کبیرہ کے ارتکاب والی بات بھی بھول گئے اور حنفیوں میں بالخصوص ایک مجلس میں تین طلاق کا دستور چل نکلا۔ اب چونکہ یہ فتویٰ فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اس کے مفاسد بے شمار ہیں لہٰذا احناف کا ایک کثیر طبقہ امام صاحب کے اس فتوی سے متفق نہیں ہے۔ وہ فقہ مالکیہ کے مطابق اسے ایک ہی طلاق قرار دیتے ہیں۔ رہے اہل حدیث تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو۔ خواہ وہ مفید تھا یا غیر مفید۔ ایک وقتی اور عارضی فیصلہ سمجھتے ہیں۔ جو شریعت کے حکم پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال کے مطابق درست طریقہ کار آج بھی وہی ہے جو سنت رسول سے ثابت ہے دور فاروقی میں بھی سنت رسول کے مطابق طریقہ کار ہی درست تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کی غلطی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد میں آپ کو اس فیصلہ پر بہت ندامت ہوئی۔ امام ابن قیم اپنی تصنیف اغاثة اللهفان کے ص ۳۳۶ پر حدیث کی معتبر کتاب مسند اسماعیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

«قَالَ عُمَرُ: مَا نَدِمْتُ عَلٰى شَيْءٍ نَدَامَتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ أَنْ لَا أَكُوْنَ حرمت الطلاق ..... الخ»

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے تین باتوں پر شدید ندامت ہوئی (جن میں سے پہلا یہی طلاق والا مسئلہ ہے) کاش کہ میں طلاق (رجعی) کو حرام نہ کرتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اعتراف کا ذکر جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے بھی اپنی تصنیف مقام سنت کے ص ۹۷ پر اور مقالات کے ص ۱۲۴ پر کیا ہے۔

نگہ بازگشت: ایسے ۲۷ امور جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی تبدیلیاں کیں' کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ان میں سے۔

۱۔ ۷ امور ایسے ہیں جو تدبیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو مطابق شریعت ہیں۔ باقی بھی کم از کم شریعت کے منافی نہیں اور وہ ۷ امور یہ ہیں۔ گھوڑوں پر اور دریائی پیداوار پر زکوٰۃ' عشور' نو مسلم کی غیر منقولہ جائیداد کے عوض کفاف۔ خراج کی مختلف ممالک میں مختلف شرحیں جزیہ کو زکوٰۃ کے برابر مقرر کرنا اور حضرت عثمان کا جمعہ کے خطبہ میں حاضری کے لیے ایک اذان کا اضافہ۔

۲۔ اور درج ذیل ۵ امور ایسے ہیں۔ جو شریعت کے کسی واضح حکم کی تائید کرتے ہیں مثلاً "آئندہ کوئی عرب غلام نہیں ہو سکتا" غلامی کو کم کرنے کے لیے ایک موثر قدم ہے۔ انتشار واختلاف ختم کرنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کے لیے جنازہ کی چار تکبیروں پر اجماع یا تراویح کی جماعت' تمسخر کو روکنے کے لیے ہجو کی سزا مقرر کرنا اور فحاشی کے سدباب کے طور پر غزلوں میں عورتوں کا نام لینے پر سزا کا اعلان۔

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ۲ فیصلے متوازی فیصلوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مفتوحہ زمین کو قومی تحویل میں لینا۔ شرابی کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کرنا۔

۴۔ اور ۲ فیصلے شرعی اجازت کو وقتی طور پر محدود کرتے ہیں کتابیہ سے نکاح پر پابندی اور زکوٰۃ کے مصارف سے عدم ضرورت کی بناء پر تالیف قلوب کی مد کا اخراج۔

۵۔ وظائف میں اسلامی خدمات کا لحاظ رکھنا اگرچہ تدبیری مسئلہ ہے۔ تاہم اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں اپنی رائے کو درست نہ پایا۔ تاہم اس سے کسی شرعی حکم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ گویا مندرجہ بالا ۱۷ امور ایسے ہیں جن پر شرعی تبدیلی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۶۔ تطلیقِ ثلاثہ والا صرف ایک مسئلہ ایسا ہے جو خلاف سنت ہے۔ ہم اسے خلاف سنت کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے کرم فرما اسے "شرعی تبدیلی" کا نام دیتے ہیں۔ اسی مسئلہ کے نتیجہ کے طور پر آپ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے کی سزا رجم مقرر کی اور یہی وجہ ہے۔ جس پر آخر میں آپ کو شدید ندامت بھی ہوئی اور غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔

۷۔ اب بقایا آٹھ امور ایسے ہیں۔ جن کی ابتدا تو دور نبوی میں ہوئی لیکن ان حضرات نے اپنی لاعلمی یا تجاہل عارفانہ یا مغالطہ آفرینی کی وجہ سے ان امور کی ابتدا کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے اور وہ آٹھ امور یہ ہے۔

صبح کی نماز میں الصلوۃ خیر من النوم کا اضافہ۔ قحط میں چوری کی سزا موقوف کرنا۔ غیر شادی شدہ کی سزا سے جلا وطنی کو موقوف کرنا۔ ام ولد کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کرنا۔ زنا بالجبر کی صورت میں عورت پر سے سزا موقوف کرنا۔ طواف میں سے رمل کو موقوف کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اصول کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا اور جنگ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدیہ مقرر کرنا۔

نتائج:

۱۔ قبلہ جعفر شاہ صاحب نے ۱۶ عدد شرعی تبدیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش فرمایا ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حالات کے تقاضوں کے تحت کتاب و سنت کے احکام میں تبدیلی کر سکتے ہیں تو۔

(الف) خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں میں تبدیلی کیوں نہیں کی جا سکتی؟

(ب) دوسری اسلامی حکومتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے تحت کتاب و سنت کی نئی تاویل یعنی تبدیلی کر لیا کریں۔

اب دیکھئے اگر قبلہ شاہ صاحب کے اس پیش کردہ نتیجہ کو خود حضرت عمر ہی تسلیم نہ کریں تو دوسرے کیونکہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھ لیا تھا کہ اب رمل کی ضرورت باقی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نہیں رہی۔ اس کے باوجود آپ نے رمل کیا اور کہتے جاتے تھے کہ ہم ایسی کوئی چیز چھوڑنے کو تیار نہیں جسے نبی ﷺ بجالائے تھے۔ اسی طرح آپ نے علیٰ وجہ البصیرت حجر اسود کو یوں مخاطب کیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نہ نقصان اس سمجھ کے باوجود آپ نے حجر اسود کو چومنے کا عبث کام کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا "اگر نبی ﷺ نے تمہیں نہ چوما ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا"

① بتایئے سنت رسول سے اِستمساک واعتصام کی کوئی اس سے بہتر مثال مل سکتی ہے؟ ہم نے صرف ان دو واقعات سے استشہاد کیا ہے۔ جن کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے۔ ورنہ سنت رسول کی پیروی سے متعلق آپ کی بیسیوں روایات موجود ہیں۔

② اگر بفرضِ تسلیم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنت رسول میں تبدیلیاں کرنا بھی چاہتے تو صحابہ کرام کی موجودگی میں وہ کر بھی نہ سکتے تھے۔ آپ نے تطلیق ثلاثہ کا نفاذ کیا تو صحابہ کبار نے آپ سے اختلاف کیا اور بالآخر آپ کو ندامت ہوئی۔ آپ نے حلالہ کی سزا رجم کا اعلان کیا۔ لیکن کسی کو بھی یہ سزا نہ دے سکے۔ حالانکہ تطلیق ثلاثہ کا لازمی نتیجہ حلالہ کا فروغ ہے۔ آپ نے نمازِ تراویح کی جماعت مقرر کی۔ تو اکثر صحابہ نے یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھنا شروع کر دی۔ آپ نے کتابیہ عورت سے نکاح پر پابندی لگائی حالانکہ بظاہر یہ ایک مستحسن اقدام تھا۔ لیکن صحابہ نے قرآنی اجازت کے مقابلہ میں آپ کی اس پابندی کو قطعاً قبول نہ کیا اور عراق کے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی عورتوں سے کثرت سے شادیاں کیں۔

③ بدلتے ہوئے حالات کے تحت صرف ایسی تبدیلی ہی گوارا ہو سکتی تھی جس کی شریعت میں گنجائش موجود ہو اور اس پر صحابہ کا اجماع ہو جائے جیسے مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لینا یا خطبہ جمعہ کے لیے ایک اذان کا اضافہ یا شرابی کی سزا میں اضافہ وغیرہ۔

④ اختلافی مسائل کا اختلاف اجماع صحابہ سے ختم کرایا جاتا تھا جیسے نماز جنازہ کی چار تکبیریں یا غسل جنابت کی ایک اختلافی شکل۔ وغیرہ وغیرہ۔

⑤ اولیاتِ عمرؓ خواہ وہ نصف صد ہیں یا کم وبیش صرف تدبیری اور امدادی امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی شرعی امر میں جہاں کوئی گنجائش بھی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی کسی دوسری اسلامی حکومت کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خود بھی اس امر کا اعتراف تھا۔ اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے پاسبان تھے۔

❀ ❀ ❀

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

حصہ ششم

طلوعِ اسلام کا اسلام

فہرست ابواب

① طلوع اسلام کا ایمان بالغیب

② طلوع اسلام اور ارکانِ اسلام

③ وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرنے کا طریق (مفہوم القرآن پر ایک نظر)

④ فکرِ پرویز پر عجمی شیوخ کی اثر اندازی

⑤ داعی انقلاب کا ذاتی کردار (ایک گھریلو شہادت)

⑥ پرویز صاحب کے لٹریچر کی خصوصیات

⑦ طلوع اسلام سے چند بنیادی سوالات

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب : اوّل

طلوع اسلام کا ایمان بالغیب

"اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو قرآن میں جہاں کہیں بھی مخاطب فرمایا تو یایھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہی کہہ کر پکارا ہے۔ یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا نہیں کہا۔ ایمان کا مادہ امن ہے اور اسلام کا سلم بمعنی سلامتی گویا ان ہر دو باتوں میں امن وسلامتی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ تاہم ایمان اور اسلام میں مندرجہ ذیل باتوں میں فرق ہے۔

① ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور اسلام کا اعضاء وجوارح سے۔ بالفاظ دیگر ایمان کا تعلق عقائد سے ہے اور اسلام کا کردار واعمال سے۔

② ایمان وعقائد بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ جن پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہ بنیاد یا ایمان جس قدر مضبوط اور راسخ ہوگا۔ اسلام کی عمارت بھی اسی لحاظ سے مضبوط اور بلند وبالا ہوگی۔ نیز اگر عقائد درست ہوں گے تو عمارت بھی سیدھی اور درست ہوگی۔ اگر عقائد غلط یا ٹیڑھے ہوں گے تو عمارت بھی کمزور اور ٹیڑھی ہوگی۔

③ ایمان کا تعلق امور غیب سے ہوتا ہے۔ اور اسلام کا ظاہری اعمال سے۔ ان دونوں کا آپس میں تعلق یہ ہے کہ عقائد کی درستی اور پختگی کا صحیح اندازہ اس کے ظاہری اعمال سے ہوتا ہے۔ گویا معیار یہ ٹھہرا کہ کسی انسان کے ظاہری افعال واعمال کس قدر کتاب وسنت کے مطابق ہیں؟ ہم اس سے یہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے عقائد ونظریات کس حد تک درست اور دل میں راسخ ہیں۔

④ چونکہ عمارت کی بنیاد پہلے رکھی جاتی ہے۔ عمارت بعد میں اس بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا پہلے ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس ایمان (یا امن) کے بیج سے پیدا ہونے والا درخت ہمیشہ سلامتی کے برگ وبار لاتا ہے۔

البتہ اس بنیاد اور عمارت یا بیج اور درخت کی مثالوں کا ایمان اور اسلام سے ایک پہلو سے فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عمارت کی بنیاد اگر کمزور ہے تو عمارت ہمیشہ کمزور ہی رہے گی۔ اسی طرح بیج اگر نرم قسم کا تھا تو درخت بھی اسی قسم کا ہوگا۔ لیکن ایمان اور اسلام کا معاملہ یوں ہے ایمان اگر ابتداءً کمزور بھی ہو تو بھی اسلام یا ارکان کی بجا آوری سے ایمان ساتھ ساتھ پختہ ہوتا جاتا ہے گویا عبادات بھی مقصود بالذات

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نہیں۔ ان سے مقصد انسان کی ایسی اصلاح ہوتی ہے جن سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو اور ان کے معاملات عدل اور احسان کی مستقل اقدار کے مطابق طے پائیں۔ اس لیے عبادات بھی درحقیقت حقوق العباد کی حسن کارانہ انداز سے ادائیگی کا ذریعہ ہیں۔ "قرآن میں حقوق العباد کا ذکر تو آیا ہے لیکن حقوق اللہ کا کہیں ذکر نہیں آیا..... ایک جگہ خدا کے حق کا ذکر ہے لیکن وہ حق بھی دراصل بندوں ہی کا حق ہے۔ سورہ انعام میں ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے باغات بھی اور کھیتوں میں پھل اور فصلیں پیدا کی ہیں۔ تم اس پیداوار کو اپنے کام میں لاؤ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (۱۴۲:۶) اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کردو۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس چیز کو اس (خدا) کا حق کہا گیا ہے یہ وہی ہے جسے دوسرے مقامات پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ حقوق اللہ حقوق العباد سے الگ کچھ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت میں جو ثنویت تھی کہ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا قیصر کو تو اسی تصور کو ہمارے یہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن اسلام میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔" (طلوع اسلام' مئی ۱۹۶۵ء ص ۳۴-۳۵)

چلئے اب خدا کی عبادت سے بھی چھٹی ملی کیونکہ جب اللہ کا بندوں پر کوئی حق ہی نہیں تو عبادت کیسی؟ بندوں کے معاملات حسن کارانہ انداز سے ٹھیک کرلو۔ تو خدا کی عبادت بس اسی میں ہی شامل ہو گئی۔

عبادات کا مفہوم: بعد میں پرویز صاحب کو غالباً یہ خیال آگیا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ "میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے" اور میں عبادت کی کلیتاً نفی کر رہا ہوں تو اس آیت کی توجیہہ آپ نے یوں فرمائی کہ:

"جب ہم قرآن کی وہ آیت سنتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں" تو اس سے ہمارے اس عقیدہ (مذکورہ بالا عقیدہ) کو اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ خدا کے سامنے اپنا کوئی پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لیے اس نے ہمیں پیدا کر کے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ ہم اس کی عبادت کرتے رہیں۔ خدا کے لیے یہ تصور صحیح نہیں۔ وہ اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔" (طلوع اسلام' ستمبر ۱۹۶۲ء' پرویز صاحب کا درس قرآن بعنوان شرک)

اس اقتباس میں لفظ پروگرام کا مطلب سمجھے آپ اس سے مراد انسان کا ارتقائی پروگرام اور کائنات کی تکمیل کا پروگرام ہے۔ اس مقام پر آپ اس پروگرام میں انسان کی رفاقت سے محض اس لیے انکار کر رہے ہیں کہ کہیں عبادتِ خدا کا دھندا نہ گلے پڑ جائے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے خدا کے اس ارتقائی پروگرام کا نظریہ مغربی مفکرین نے پیش کیا اور پرویز صاحب بدل وجان اس پر ایمان لا چکے ہیں۔ [1]

---

[1] مزید تفصیل آگے "فکر پرویز پر عجمی شیوخ کی اثر اندازی" میں آئے گی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا کی عبادت کا یہ تصور صحیح نہیں تو صحیح تصور ہے کیا؟ اس ایمان اور اسلام جہاں بنیاد اور عمارت ہیں۔ وہاں ایک دوسرے کے رفیق اور ایک دوسرے کو پختہ اور استوار بھی کرتے رہتے ہیں۔ تاہم چونکہ آغاز ایمان ہی سے ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں داخل ہونے والوں کو یا ایہا الذین امنوا کہہ کر پکارا گیا ہے۔

اب اگلا مسئلہ یہ ہے کہ اس بنیاد یا ایمان کے اجزاء کیا ہیں۔ تو قرآن کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ چھ باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ چھ کی چھ باتیں امور غیب سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے ہم عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ سکیں اور وہ چھ باتیں یہ ہیں:

(۱) اللہ پر ایمان (۲) اس کے فرشتوں پر ایمان (۳) اسکے رسولوں پر ایمان (۴) اس کی کتابوں پر ایمان (۵) یوم آخرت پر ایمان (۶) اس بات پر ایمان کہ تقدیر اچھی ہو یا بری سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

اور جو شخص ان چھ باتوں پر یقین رکھے یا ایمان بالغیب لائے گا وہ مومن ہوگا۔

ایمان بالغیب اور مومن کی پرویزی تعریف: لیکن پرویز صاحب نے اس ایمان بالغیب کے مسئلہ کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اس کے مطابق آپ کو صرف ایک ہی بات پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے۔ آپ نے جو "جدید قرآنی اصطلاحات وضع فرمائی ہیں۔ ان کے مطابق ایمان بالغیب کی تعریف یہ ہے۔

"ایمان بالغیب۔ خدا کے نظام ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھنا (ن۔ ر ص۸۸)۔

اب اس لحاظ سے مومن وہ ہونا چاہیئے جو نظام ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لے آئے لیکن اس میں آپ کچھ فرق بیان فرماتے ہیں کہتے ہیں۔

"قرآن کی رو سے مومن کہتے ہی اسے ہیں جو نوع انسان کی نشوونما کا سامان کرے (وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ)" (ن۔ ر ص۱۶۴)

یعنی آپ اسلام کے صرف ایک رکن زکوٰۃ پر اس انداز سے عمل فرمایئے۔ جس طرح پرویز صاحب چاہتے ہیں تو بس آپ پکے مومن ہیں۔ اس کے بعد آپ کو ایمان بالغیب کے مذکورہ بالا اجزاء پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

۱۔ اللہ پر ایمان بالغیب

اللہ پر ایمان بالغیب کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی ازلی ابدی ہے۔ کل کائنات کا خالق ومالک اور رزاق ہے۔ وہی کائنات کی ہر چیز کا انتظام فرمانے والا ہے اور کائنات میں ہر قسم کا تغیر وتبدل اسی کی مشیت سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے کائنات میں ہر آن حوادث ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ علیم وحکیم وخبیر ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ اور اس کی ہر حرکت اور فعل کا اسے علم ہے وہ صفات کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کی ذات عرش پر ہے۔ اگرچہ ہم اس کی کیفیت معلوم نہیں کر سکتے۔ وہ انسان اور اسی طرح اقوام

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کے اچھے اعمال پر خوش ہوتا ہے اور برے کاموں سے ناراض ہوتا ہے وہ غفور رحیم بھی ہے اور عزیز ذوانتقام بھی۔

طلوع اسلام اور مسئلہ استویٰ علی العرش : ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جہمیہ اور معتزلہ نے خدا سے متعلق ارسطو کا تجریدی تصور پیش کر کے بقول امام ابو حنیفہؒ اللہ تعالیٰ کو معدوم اور محض لاشئے بنا دیا۔ وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کا عرش پر قرار پکڑنے کے قائل تھے اور نہ ہی اللہ کے ہاتھ اور چہرہ وغیرہ کو تسلیم کرنے کے وہ خدا سے متعلق جہت یا سمت مقرر کرنے کو کفر اور شرک سمجھتے تھے۔ اور آج معتزلہ کی تقلید میں وہی تصور طلوع اسلام پیش کر رہا ہے چنانچہ پرویز صاحب فرماتے ہیں۔

غور فرمایئے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور (کہ وہ عرش پر ہے کیا اندازہ پیش کر رہا ہے اللہ تعالیٰ جو کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے۔ مکان و زمان کی تمام نسبتوں سے منزہ و مبرا اور جہت [1] و سمت کے تمام تصورات سے بلند و بالا ہے۔ اسے آسمان نو پر کسی خاص مقام میں متعین کر دینا قرآن کے تصورات الوہیت کے کس قدر منافی ہے۔" (معراج انسانیت ص ۳۶۷)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"مذہب نے جس خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی انسان کے رزق کی ضمانت [2] نہیں دے سکتا۔" (سلیم کے نام چودواں خط' ص:۲۲۶)

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

"اگر آج سائنس کی کوئی ایجاد اس بات کا امکان بھی پیدا کر دے کہ کوئی شخص روشنی کی رفتار سے مریخ یا چاند کے کروں تک پہنچ جائے۔ پھر چند ثانیوں میں وہ واپس بھی آجائے تو پھر بھی میں حضور اکرم ﷺ کے معراج جسمانی کو قبول نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میرے دعویٰ کی بنیاد ہی دوسری ہے اور وہ یہ ہے کہ جسمانی معراج سے یہ تصور کرنا لازم آتا ہے کہ خدا کسی خاص مقام پر موجود ہے اور میرے نزدیک خدا کے متعلق یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ (معارف القرآن' ج:۲' ص:۲۴۱)

---

[1] جہت اور سمت کوئی بھی مقرر نہیں کرتا۔ کیونکہ آسمان پوری زمین کو اور عرش سب آسمانوں کو محیط ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ ان سب سے بڑا اور سب کو محیط ہے۔ اب اگر تو آسمان کی سمت متعین ہو سکتی ہے تو پھر اللہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ آسمان اوپر ہے۔ اسی طرح اللہ ان سب آسمانوں اور عرش سے بھی اوپر ہے۔ اور یہی اعلیٰ کا معنی ہے۔

[2] طلوع اسلام کے نزدیک اللہ واقعی رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ البتہ قرآنی معاشرہ ضرور دے سکتا ہے اور ان کے ہاں اللہ سے مراد قرآنی معاشرہ ہوتا ہے تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اپنے دعویٰ کی تردید : گویا قرآن کی بنیادی تعلیم کے مطابق آپ کا دعویٰ یہ ہوا کہ خدا کسی خاص مقام پر یا اوپر نہیں ہے۔ اب دیکھئے درج ذیل آیات کے معنی یا مفہوم میں اپنے اس بنیادی دعویٰ کو کس طرح بھول جاتے ہیں۔

﴿ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝ ﴾ (السجدۃ ۳۲/ ۵)

"اللہ اپنے امر (اسکیم) کی ابتدا آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے پھر وہ اسکیم اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال ہوتی ہے۔"

غور فرمایئے اگر اللہ اوپر نہیں تو یہ امر (سکیم) اس کی طرف بلند کیوں ہوتی ہے؟ پھر ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"اس حقیقت کو سورہ فاطر میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے الیہ یصعد الکلِمُ الطیب ہر خوشگوار نقشہ یا نظریہ قانون ربوبیت کے مطابق اس کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وَالعملُ الصالح یرفعہٗ اور اس کی یہ بلند پروازی عمل صالح کے سہارے پر ہوتی ہے۔" (ایضاً ص ۶)

اب سوال یہ ہے کہ یہ امر یا سکیم یا خوشگوار نقشے یا عمل صالح آخر اوپر کو کیوں بلند ہوتے یا کرتے ہیں؟ اگر خدا کسی خاص مقام پر نہیں اور ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے۔ تو یہ بلند ہونے کا عمل کیا معنی رکھتا ہے؟

ہو سکتا ہے ان آیات کا ترجمہ یا مفہوم پیش کرتے وقت قرآن کی بنیادی تعلیم بھول گئے ہوں۔ اب ہم ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَلٰی وجہ البصیرت بھی "قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو درست نہیں سمجھتے۔ وہ نفس انسانی کے ارتقاء کی منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ (۸۴:۱۹) تاکہ تم درجہ بدرجہ اوپر چڑھتے چلے جاؤ۔ اس نے اس سے بھی واضح الفاظ میں بتا دیا کہ صراط مستقیم تمہارے نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو "ذی معارج" (۷۰:۳) ہے "یعنی سیڑھیوں والا خدا" سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۴۳)

اب دیکھئے آپ نے مندرجہ بالا تینوں اقتباسات میں قرآن کی بنیادی تعلیم کے برعکس قرآن کی عام تعلیم بیان فرما کر خود ہی اپنی بیان کردہ بنیادی تعلیم کی تردید فرما دی۔ جب آپ کا اپنا یہ حال ہے تو دوسرے لوگ قرآن کی اس بنیادی اور عام تعلیم کا فرق کیسے ملحوظ رکھ سکتے ہیں؟

صفات خداوندی : اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق معتزلہ کا نظریہ سخت پیچیدہ تھا۔ وہ صفات سے متعلق قرآن کریم کی آیات کی تاویل بھی فلسفیانہ قسم کی کر لیتے تھے۔ فی الحقیقت وہ صفات خداوندی کے یکسر منکر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تھے۔ وہ کہتے تھے کہ صفات چونکہ حادث ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات بھی تسلیم کر لینے سے تعدد قدماء کا تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ اور یہ شرک ہے مسئلہ خلق قران بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

مگر موجودہ دور کے قرآنی مفکرین اس معاملہ میں معتزلین سے کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ پرویز صاحب جملہ صفات خداوندی میں سے صرف تین صفات کا ذکر اکثر کرتے ہیں۔ اور وہ ہیں رب العالمین' رزاقیت' اور خالقیت یہ وہی صفات ہیں جن کا تعلق براہ راست ان کے قرآنی نظام ربوبیت سے ہے۔ پھران صفات سے متعلق بھی انکا نظریہ اسلامی نظریہ سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب خدا نے بنی نوع انسان کے جسم میں اپنی روح پھونکی تو بس اب انسان خود بھی صفات خداوندی کا مظہر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"آدمی نام ہے روح خداوندی کے مظہر کا یعنی خدا کی صفات کا حامل یہ صفات وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ تمام صفات ہر فرزند آدم کے اندر بطور ممکنات موجود ہیں۔ ان صفات کو بارز یا مشہود بنانا آدمیت ہے۔" (سلیم کے نام ۱۴واں خط' ص:۲۵۶)

اس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر اس طرح کرتے ہیں:

"چونکہ خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لیے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرت عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے کسی غیر کی محکومیت نہیں۔" (معراج انسانیت صفحہ ۴۲۰)

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب: پھر جب انسان اپنے اندر ان صفات کو منعکس کر لیتا ہے تو اس کا اپنی ذات پر ایمان لانا ہی دراصل خدا پر ایمان ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"قرآن نے صفات خداوندی کو اس قدر تفصیل اور وضاحت اور حسن وخوبی کے ساتھ اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ انسان انہی صفات کو اپنی ذات کی نشوونما کے لیے اپنے سامنے رکھے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ (قرآن کے الفاظ میں) خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یا اس کا قرب حاصل کرتا جاتا ہے۔ خدا کی صفات کو بطور معیار اپنے سامنے رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان لانا) [1] کہلاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا اور

---

[1] اللہ پر ایمان کی بات ہو تو محترم پرویز صاحب پہلے تو مخاطب کو Subjective GoD اور Objective God کی بحث میں الجھا دیتے ہیں۔ یعنی امیر کا خدا اور غریب کا اور ظالم کا اور مظلوم کا اور اس کا اور اس کا اور کبھی یہ بتاتے ہیں کہ خدا نے اپنی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہا نہ ہی اس کی معرفت کے مکلف ہیں۔ انسان زمان ومکان سے محدود' خدا زمان ومکان سے ماورا اور انسان بھلا اسے کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ اور کبھی ایمان باللہ کا مطلب اپنی ذات پر ایمان لانا بتاتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

انسان کا بنیادی تعلق کیا ہے۔ اور اس کے لیے صفات خداوندی کا اپنی حقیقی اور بلا آمیزش شکل میں سامنے ہونا کس قدر ضروری ہے۔ خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ انسان کا اپنی ذات کے وجود پر ایمان لانا ہے۔" (من ویزدان ص ۴۴۷)

خدا اور انسان کا تعلق: سمجھ لیا آپ نے خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہاں عبد اور معبود یا خالق و مخلوق کی بات نہیں۔ یہاں ہمسری کے دعوے ہیں۔ ہر انسان دراصل پوشیدہ طور پر خدا ہی ہے۔ جس قدر وہ صفات خداوندی کو اپنے اندر سموتا اور انہیں مشہود کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی قدر وہ خود بھی خدا بنتا جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر اسی نظریہ کی تائید میں ایک انگریز مفکر باردیو کا اقتباس پیش فرماتے ہیں:

"اس کے بعد باردیو لکھتا ہے کہ انسان کی ذات کی انفرادیت خود اس فرد سے بلند درجے کی ہوتی ہے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ لکھتا ہے کہ خدا اور انسان کا تعلق سبب اور مسبب کا نہیں' یہ بھی نہیں کہ ایک خاص ہے اور دوسرا عام۔ نہ ہی ان کا تعلق مقصد اور ذریعہ کا ہے اور نہ ہی غلام اور آقا کا۔ ہم اس تعلق کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ خدا بے شک (End) ہے۔ لیکن انسانی ذات اس کے حصول کا فقط ذریعہ (Means) نہیں۔ علم الٰہیات کا یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنی حمد وستائش اور جبرو کبریائی کی تعریف اور توصیف کے لیے پیدا کیا' انسانیت کی ذلت ہے۔ نہیں یہ خود خدا کی شان کے شایان بھی نہیں۔ اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ کہ جو عقیدہ انسان کے لیے وجہ ذلت ہو وہ خدا کے لیے بھی باعث ذلت ہوتا ہے۔" (قرآنی نظام ربوبیت ص ۶۱)

خدا کی عبادت: اس اقتباس نے قرآن کریم کی بے شمار آیات کا ابطال کر دیا ہے۔ عابد و معبود' آقا و غلام' حاکم و محکوم کے سب رشتے ختم ہوئے کیونکہ خدا اور بندے کے درمیان ایسا تعلق انسان کی توہین ہے اور خدا کے بھی شایان شان نہیں۔ اگر اب بھی پرویز صاحب کے عقائد و نظریات میں کوئی شبہ باقی رہ گیا ہو تو درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

اللہ کی عبادت کے پرویزی مفہوم

عبادت کا مفہوم: عام طور پر عبادات کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن قرانی تصور حیات سے سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں۔

عبادت کا مفہوم نمبر:۱ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا عملی مفہوم پرویز صاحب یوں بیان فرماتے ہیں۔

"افراد معاشرہ اس نظام ربوبیت کی اطاعت کے اس وقت تک مکلف ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی عملی مفہوم ہے۔" (ن۔ ر ص ۱۷۴)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

عبادت کا مفہوم نمبر: ۲ اور مفہوم القرآن میں آپ نے اسی آیت کا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے:

"عالمگیر انسانیت کے نشوونما دینے والے! ہم تیرے اسی قانون ربوبیت کو اپنا ضابطہ حیات بناتے ہیں اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہمیں اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو بھرپور اور متناسب بنا سکیں۔ اور پھر انہیں تیرے ہی بتائے ہوئے طریق کار کے مطابق صرف کریں۔" (مفہوم القرآن) ص ۱۱)۔

عبادت کا مفہوم نمبر: ۳ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہ مفہوم ذرا لمبا ضرور ہے مگر اتنا ہی دلچسپ بھی ہے اس سے آپ کے تفسیری انداز پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے فرماتے ہیں:

"وہ (قرآن) کہتا ہے کہ جن (دیہاتی لوگ) وانس (شہری لوگ) اپنی پیدائش کے مقصد کو اسی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱:۵۶) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام افراد نظام خداوندی کے ساتھ منسلک ہو جائیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں نظام خداوندی کا کچھ اپنا فائدہ ہے۔ بالکل نہیں اس سے یہ نظام اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا۔ مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ (۵۱:۵۷) نظام معاشرہ کچھ لینے کے لیے وجود میں نہیں آتا۔ خود ان کی پرورش اور قوت کا انتظام کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ (۵۱:۵۸) اللہ کا نظام رزق دینے والا اور بڑی قوت کا مالک ہے وہ کھانے کو دیتا ہے اور کھانے کے لیے لیتا نہیں (وَھُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ (۶:۱۴) وہ افراد سے عبودیت (یعنی اپنی صلاحیتوں کو نظام کے مقرر کردہ ضوابط کے مطابق صرف کرنے) کا مطالبہ اس لیے کرتا ہے کہ اس سے خود افراد کی ذات بھرپور جوانیوں تک پہنچ کر کامل اعتدال کر سکتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی عملی مفہوم ہے۔ (ن۔ ر ص ۱۸۵)

ان اقتباسات کو بار بار پڑھیے یوں نہ گزر جائیے پھر بتائیے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا عملی مفہوم کیا ہے اور کیسے ہے؟ نیز ان سب اقتباسات کو ملا کر بتائیے کہ توحید کسے کہتے ہیں۔ اور عبادت کا صحیح تصور کیا ہے؟

توحید اور شرک

اب مسئلہ رہ گیا توحید اور شرک کا عبادات الٰہی اگر خالصتاً اسی کے لیے ہوں تو توحید اور اگر ان میں کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا جائے تو وہ شرک ہوتا ہے۔ اب توحید اور شرک کا پرویزی فلسفہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

توحید کا مفہوم نمبر ۱ : "چونکہ انسان' صفات خداوندی (روح خداوندی) کا حامل ہے۔ اس لیے اس کی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تکمیل آدمیت کے لیے نمونہ صرف خدا کی صفات ہو سکتی ہے۔ اور صفات خداوندی ہر فرد انسانیہ کے لیے نمونہ ہوں گی۔ تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک ہی نمونہ (Pattern) ہوں گی۔ کیونکہ ہر انسان ان ہی صفات کا حامل ہے۔ اسے "توحید" کہتے ہیں۔ یعنی زندگی کے لیے صرف ایک نمونہ اور ایک نصب العین ہونا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" (سلیم کے نام ۲۰ واں خط' ص:۳۵۷)

ایک توحید تو صوفیہ کی ہے جسے وہ وحدت الوجود کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے خدا کا حصہ ہے وہ اسی نظریہ کو توحید خالص یا خواص کی توحید کہتے ہیں

اب یہ پرویزی توحید کا تیسرا نظریہ سامنے آگیا۔ جس میں توحید کو خالص کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ از خود ہی خالص ہے ہر انسان کے سامنے ایک نمونہ تو اسی وقت بن گیا۔ جب نفخ روح خداوندی عمل میں آگیا۔ اب اگر کوئی شخص اپنی ذات پر ایمان نہیں لاتا۔ یا وہ صفات خداوندی کا نمونہ سامنے نہیں رکھتا۔ جو کہ ناممکن ہے کیونکہ نمونہ تو وہ خود ہے تو وہ کافر ہے۔ اور جو شخص کوئی اور نمونہ سامنے رکھے گا تو وہ مشرک ہو جائے گا۔ نمونے کی وحدت ہی اصل توحید ہے۔

توحید کا مفہوم : اب توحید کی ایک دوسری تعریف بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"وہ انقلاب جس میں معاشی نظام انسانیت بھی اس خدا کے ہاتھ میں (یعنی اس کے قانون کے مطابق قائم) ہوگا جس کے ہاتھ میں کائناتی نظام ہے۔ (وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹:۶۷) اسی کے معنی توحید ہیں۔ (ن۔ ر ص۲۸۵)

اللہ کے مختلف معانی

اللہ تعالیٰ کے متعلق جس قسم کے تصورات پرویز صاحب رکھتے ہیں اس کا اندازہ کسی حد تک آپ کو ہو چکا ہوگا۔ اب مزید وضاحت کے لیے ہم پرویز صاحب کے اپنے الفاظ میں آپ کو اللہ کے مختلف معانی بتاتے جائیں گے۔

۱۔ اللہ بمعنی صفات خداوندی : فرماتے ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (الأعراف۷/ ۱۸۰) "صفات خداوندی میں حسن کارانہ توازن ہے۔"

۲۔ اللہ بمعنی اللہ کا قانون :

﴿ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الأنفال۸/ ٦٤) "تمہارے لیے اس ٹکراؤ میں جو مفاد پرست جماعتوں سے ہونے والا ہے اللہ کا قانون اور اس جماعت کی رفاقت کافی ہے۔"

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ (البینة۹۸/ ۸) "انہوں نے قانون خداوندی سے موافقت پیدا کر لی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اور قانون ان کا رفیق و یاور بن گیا۔"

۳۔ اللہ بمعنی اللہ کا نظام :

﴿ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۶۹)

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نا سمجھی سے اس نظام کو خدا کا نظام سمجھنے لگ جاؤ۔" (ایضاً ص ۱۲۵)

﴿ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿٥٨﴾ ﴾ (الذاریات۵۱/ ۵۸)

"اللہ کا نظام رزق دینے والا اور بڑی قوتوں کا مالک ہے۔"

۴۔ اللہ بمعنی نظام ربوبیت :

﴿ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۶۸)

"نظام ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے۔"

۵۔ اللہ بمعنی چہ؟ :

﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢﴾ ﴾ (الفاتحۃ۱/ ۱)

"زندگی کا ہر حسین نقشہ اور کائنات کا ہر تعمیری گوشہ خالق کائنات کے ہر عظیم القدر نظام ربوبیت کی ایسی زندہ شہادت ہے جو ہر چشم بصیرت سے بے ساختہ داد تحسین لیتی ہے۔"

اب اس آیت سے اللہ کا مفہوم آپ خود تلاش کر لیجیے۔

یہ تو تھے لفظ "اللہ" کے مختلف مفہوم [1] لیکن ابھی اللہ سے مراد لینے کا کام باقی ہے۔

۱۔ اللہ سے مراد قرآنی معاشرہ : "مذہب نے جس خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی انسان کے رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کے رزاق ہونے کے دعوی کے باوجود اس کی خدائی میں کروڑوں بندے بھوکے سوتے اور لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں اس بلند آہنگ اعلان کے باوجود کہ۔

﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ (ھود۱۱/ ۶)

"زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔"

آج آدھی دنیا کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ لہٰذا انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے پیدا کردہ "خدا" پر ایمان لانے اور اس سے دعاؤں پر توکل کرنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو

---

[1] ان مختلف مفاہیم میں اگر کوئی بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے تو وہ یہ ہے کہ خدا بہرحال کوئی حی وقیوم اور مقتدر ہستی نہیں ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

انسانوں کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانین خداوندی کی رو سے قائم ہو تمام افراد کی ضروریات زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔" (سلیم کے نام چودھواں خط ص۲۲۶)

۲- اللہ + رسول = مرکز ملت یا مرکز ملت = اللہ + رسول : اور اگر اللہ کے ساتھ رسول بھی شامل ہو جائے تو اللہ اور رسول سے مراد ہے مرکز ملت۔ یعنی

"اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد ہے مرکز ملت یا سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت جو مسلمانوں کے لیے حسب اقتضآت زمانہ قانون بنائے گی تاکہ عام مسلمان اسے اللہ رسول سمجھ کر ان قوانین واحکام کی اطاعت کریں۔" (معراج انسانیت' ج:۴' میں دیکھئے بحث مرکز ملت)

اللہ = مرکز ملت یا مرکز ملت = اللہ : اور کبھی یہ مرکز ملت رسول کو پرے ہٹا کر اللہ کے جملہ اختیارات سنبھال لیتا ہے۔ مثلاً گناہوں کو بخشنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ رسول کا قطعاً نہیں۔ مگر یہ مرکز ملت لوگوں کے گناہ بھی معاف کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب فرماتے ہیں۔

"اگر کسی فرد سے لغزش ہو جائے تو مسجد کے گوشے میں استغفراللہ کہنے سے معافی نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس فرد کو خود چل کر مرکزی اتھارٹی کے پاس آنا ہوگا اور معذرت پیش کرنا ہوگی۔" (طلوع اسلام کنونشن میں ڈاکٹر صاحب کا خطاب بعنوان پاکستان کا مسئلہ۔ طلوع اسلام جولائی ۱۹۶۲ء)

یہ تھے اللہ کے مختلف مفہوم اور مرادیں اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ کون کونسے اللہ پر ایمان بالغیب کا قرآن تقاضا کرتا ہے اور آیا اسے ایمان بالغیب کہنا درست بھی ہے یا نہیں؟

۲۔ فرشتوں پر ایمان

۲۔ ایمان بالغیب کی دوسری کڑی فرشتوں پر ایمان ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ لاتعداد مخلوق ہے جو تدبیر امور کائنات پر مامور ہے۔ وہ خدا کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے۔ خدا اپنا پیغام یعنی وحی بھی انہی کے ذریعہ اپنے انبیاء پر نازل فرماتا ہے۔ فرشتے اپنی شکل وصورت بدل سکتے ہیں۔ ان میں کچھ فرشتے دو پروں والے ہیں۔ کچھ تین پروں والے کچھ چار پروں والے اور بعض فرشتوں کے پر اس سے بھی زیادہ ہیں۔ فرشتے آسمانوں سے زمین پر اترتے ہیں اور پھر زمین سے آسمانوں کی طرف چڑھتے رہتے ہیں اور اس طرح تدبیر امور کائنات کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ انسانی شکل میں نبیوں اور غیر نبیوں کے پاس آکر اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ جاندار اشیاء کی روح قبض کرنے کے لیے بھی فرشتہ مقرر ہے۔ انسانوں کے اعمال بھی فرشتے ہی قلمبند کرتے ہیں جنگ بدر میں فرشتوں ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کو فرشتوں ہی نے الٹ مارا تھا۔ فرشتوں سے متعلق یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قرآن سے صراحتاً ثابت ہیں۔

لیکن پرویز صاحب تو نہ فرشتوں کے خارجی وجود کے قائل ہیں اور نہ ہی ذاتی تشخص کے۔ لہٰذا فرشتوں پر ایمان بالغیب کے مسئلہ نے بھی انہیں خاصا پریشان کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ان کی تحریفات و تاویلات دلچسپی سے خالی نہیں اب ہم آپ کو یہ بتائیں گے کہ وہ فرشتوں سے کیا کیا "مرادیں" لیتے ہیں۔

۱۔ ملائکہ سے مراد خارجی قوائے فطرت : "ملائکہ سے مراد مفہوم وہ قوتیں ہیں جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو چلانے کے لیے مامور ہیں۔ یعنی قوائے فطرت اس لیے قانون خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑی ہوئی ہیں کہ ان سے انسان کام لے سکے اسی لیے قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں انسان کے تابع فرمان بنا دی گئی ہیں۔" (ابلیس و آدم ص ۱۴۴)

اب سوال یہ ہے کہ اگر ملائکہ سے مراد فطرت کی قوتیں لیا جائے تو یہ فطرت کی قوتیں ہرگز انسان کے تابع فرمان نہیں ہیں۔ طوفان بادو باران سے سینکڑوں انسان مر جاتے ہیں۔ مکانات منہدم ہو جاتے ہیں۔ چھتیں اڑ جاتی ہیں آفتاب ارضی و سماوی سے تیار شدہ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کیا انسان کا ان فطرت کی قوتوں پر اس وقت کوئی بس چلتا ہے؟ پھر انسان ایسے "ملائکہ" کا مسجود کیسے ہوا؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ ان کائنات کی قوتوں کا تو کوئی دہریہ بھی منکر نہیں ہوتا۔ پھر ایسے "ملائکہ" پر ایمان بالغیب لانے کا کیا مطلب ہوا؟

حاملین عرش ملائکہ کی وضاحت : قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے (۶۹:۷) اب اس کی تشریح پرویز صاحب کی زبان سے سنئے:

"عرش وہ مرکز حکومت خداوندی ہے جہاں کائنات کی تدبیر امور ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ تدبیر امور ملائکہ کی وساطت سے سرانجام پاتی ہے۔ اس لیے ملائکہ عرش الٰہی کے اٹھانے والے اور کمربستہ اس کے گرد گھومنے والے ہیں۔" (ایضاً ص ۱۴۷)

اب دیکھئے اس تشریح پر پرویز صاحب نے قرآن کریم کے دو مختلف مقامات کی آیات کو گڈمڈ کر کے پیش کر دیا ہے۔ آٹھ فرشتوں کے عرش الٰہی کے اٹھانے کا ذکر سورہ الحاقہ (۶۹) کی ساتویں آیت میں ہے اور "گھومنے والے" فرشتوں کا ذکر سورہ الزمر (۳۹) کی آخری آیت نمبر ۷۵ میں ہے۔ اور یہ گھومنے والے حافین کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ جو ویسے بھی غلط ہے اس کا صحیح ترجمہ گھیرا ڈالے ہوئے ہے نہ کہ گھومنے والے۔ علاوہ ازیں گھیرا ڈالنا یا گھومنا الگ عمل ہے اور عرش کو اٹھانا الگ عمل ہے۔ جو عرش کو اٹھائے ہوں وہ گھوم نہیں سکتے اور جو گھوم رہے ہوں گے وہ اٹھانے والے نہیں ہوں گے جو کچھ بھی ہو ان دونوں آیات سے

فرشتوں کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص دونوں باتیں ثابت ہو رہی ہیں۔ جو آپ کے پہلے نظریہ "قوائے فطرت" کے برعکس ہیں۔

۲۔ ملائکہ سے مراد داخلی قوتیں : "لہٰذا یہ ملائکہ ہماری اپنی داخلی قوتیں ہیں۔ یعنی ہمارے اعمال کے اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ (ایضاً ص۱۶۲)

اب دیکھئے اس مختصر سے اقتباس میں پرویز صاحب نے بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل فرما دیا۔ مثلاً:

① ہماری داخلی قوتیں۔ قوت باصرہ۔ لامسہ' ذائقہ سامعہ' دافعہ حافظہ وغیرہ یا جو کچھ بھی ہیں۔ اگر یہی قوتیں ملائکہ ہیں تو پھر ان پر ایمان بالغیب لانے کا قرآنی مطالبہ ہی غلط قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ ان داخلی قوتوں کو تو کافر اور دہریئے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

② آپ کی پہلی تعریف کے مطابق ملائکہ سے مراد خارجی قوتیں تھا۔ اب اس تعریف کے لحاظ سے ملائکہ سے مراد انسان کی داخلی قوتیں بن گیا۔

③ اب ان داخلی قوتوں سے بھی مراد یہ ہے کہ "ہمارے اعمال کے اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ گویا ملائکہ کی تیسری تعریف "ہماری ذات پر مرتب ہونے والے اثرات" ہیں۔

④ قیامت کا مفہوم آپ نے یہ بتایا کہ جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں تو قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کسان اگر بیج بوتا ہے تو جب اس سے کونپل نکل آئے یا زیادہ سے زیادہ فصل پک کر تیار ہو جائے اور اس کے عمل کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آگیا تو گویا قرآن کی رو سے اس کی قیامت آگئی۔ اس تصریح سے آپ کے قیامت پر ایمان لانے کے تصور پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

۳۔ ملائکہ سے مراد طبعی تغیرات : "ان مقامات سے ظاہر ہے کہ جو طبعی تغیرات انسان کے جسم میں رونما ہوتے ہیں اور جن کا آخری نتیجہ انسان کی طبعی موت ہوتی ہے۔ انہیں بھی ملائکہ کی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔" (ایضاً ص۱۵۹)

اب دیکھئے یہ طبعی تغیرات بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کسی عمل کے نتیجہ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے کھانا کھانے سے بھوک مٹ جاتی ہے۔ سیر اور ورزش سے جسم مضبوط اور صحت بحال رہتی ہے۔ دوسرے طبعی تغیرات وہ جن میں انسان کے عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جیسے اس کا بچہ سے بڑا ہونا' جوان ہونا' پھر بوڑھا ہونا' پھر مرجانا۔ یہ سب امور ایسے ہیں جن کا ایمان بالغیب سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ طبعی ہیں۔ اور واقع ہو کے رہیں گے پھر ان طبعی تغیرات کو ملائکہ سے تعبیر کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ ان طبعی تغیرات کو تو دہریئے بھی تسلیم کرتے ہیں پھر "ایسے ملائکہ" پر ایمان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadoos Foundation)

بالغیب لانے کا کیا مطلب؟

۴۔ ملائکہ سے مراد نفسیاتی محرکات : "ان مقامات (یعنی بدر کے موقعہ پر تین ہزار ملائکہ کا نزول یا ایسی ہی دوسری آیات) پر غور کیجیے۔ ملائکہ کی مدد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں۔" (ایضاً ص۱۵۵)

اب دیکھئے اس اقتباس میں بھی پرویز صاحب نفسیاتی محرکات کو داخلی قسم کی کوئی شے قرار دے کر فریب دینے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ جب معاملہ داخلی قسم کا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اسی انداز میں پیش فرماتے ہیں۔ جیسے مومنوں کے لیے فرمایا ﴿ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ ﴾ (۴۰:۹) اور کافروں کے لیے فرمایا ﴿ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۲:۵۹) لیکن یہ میدان بدر کا معاملہ داخلی قسم کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ خارجی امداد یا محرکات تھے۔ جیسے اگر ایک انسان دوسرے کو گالی دے تو وہ سیخ پا ہو جاتا ہے یا کوئی کسی دوسرے کا خوف رفع کر دے تو وہ مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس مصیبت کو رفع کرنے کا مشکور بھی ہوتا ہے۔ یہی صورت حال بدر میں پیش آئی تھی۔ اب اگر اس سے وہی مطلب لیا جائے تو پرویز صاحب فرما رہے ہیں تو تین سو تیرہ مجاہدین کے لیے تین ہزار یا پانچ ہزار ملائکہ کی مدد کی کیا صورت بن سکتی ہے؟

رحمت اور عذاب کے فرشتے : "اگر ایک طرف ملائکہ' ایمان واستقامت کی بناء پر اللہ کی رحمتوں کی نور افشانی کرتے ہیں تو دوسری طرف کفرو سرکشی کے لیے عذاب خداوندی کے حامل بھی ہوتے ہیں "عذاب خدواندی" سے مفہوم یہ ہے غلط قوموں کی روش کے تباہ کن نتائج۔ لہٰذا اس باب میں ملائکہ سے مراد وہ قومیں ہیں جو قانون خداوندی کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں۔" (ایضاً ص۱۵۸)

اب دیکھئے لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے اور لوط علیہ السلام کو بستی سے نکل جانے کو کہا۔ جب وہ نکل گئے تو ان فرشتوں نے قوم لوط کی بستی کو لواطت کے جرم میں الٹ مارا۔ اب اگر محض قوانین خداوندی اور علت ومعلول کا سہارا لیا جائے تو ہر لوطی قوم کا یہی انجام ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ قوانین خداوندی میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان میں یہی عمل قوم لوط موجود ہے اور اسے قانونی جواز کی سند بھی حاصل ہے۔ اب قوانین خداوندی کے مطابق ان قوتوں (ملائکہ) کو یقیناً ان کے اعمال کا نتیجہ ویسا ہی مرتب کرنا چاہیئے تھا جیسا کہ قوم لوط کے اعمال کا مرتب ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا۔ جس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ اعمال کو مرتب کرنے والی ہستی کوئی باشعور ہستی ہے۔ جو اپنی مشیت کے مطابق ہی نتائج مرتب کرتی ہے۔ جو اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کی پابند نہیں ہے اور نہ ہی ملائکہ بے جان بے شعور قوتیں ہیں۔ جو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لگے بندھے نتائج مرتب کریں۔ وہ فرشتے جاندار اور باشعور ہستیاں ہیں اور وہ قانون خداوندی کی نہیں۔ بلکہ خداوند کے حکم کی اطاعت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہی فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس آتے ہیں تو رحمت کے فرشتے ہوتے ہیں اور وہی فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب کے فرشتے بن جاتے ہیں۔

دو' دو تین' تین۔ چار' چار پروں والے فرشتے : "دو' تین' چار پروں سے اپنی قوت کے اعتبار سے ملائکہ کے مختلف مدارج وطبقات کا ذکر مقصود ہے۔" (ایضاً ص ۱۶۷)

گویا پرویز صاحب کے نزدیک جیسے کوئی بجلی کی موٹر ۲ ہارس پاور کی ہوتی ہے کوئی تین ہارس پاور کی اور کوئی چار کی' یہی صورت حال فرشتوں کی بھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قوت اور مدارج یہ دونوں عربی زبان کے لفظ ہیں اور قرآن میں انہی معروف معانی میں استعمال بھی ہوتے ہیں پھر آخر فرشتوں کے لیے قوت اور درجہ کی بجائے اجنحۃ (بازو۔ پر) کے لفظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

علاوہ ازیں چڑیا کے بھی دو پر ہوتے ہیں اور چیل کے بھی۔ لیکن ان دونوں کے دو دو پر ہونے کے باوجود قوت میں بڑا فرق ہے۔ اور مختلف مدارج کا معاملہ تو پرویز صاحب ہی بہتر جانتے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہر انسان کے دو دو ہی بازو ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی قوت میں فرق ہوتا ہے اور مدارج میں بھی۔ مدارج کا انحصار بازوؤں پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہوتا ہے۔

سو یہ ہے فرشتوں پر ایمان بالغیب' اصل مسئلہ یہ تھا کہ آیا فرشتے کوئی الگ مخلوق ہیں یا نہیں اور ان کا کوئی خارجی تشخص ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ مسئلہ مافوق العادت (Supper Natural) ہے۔ اس لیے آپ کو ہر مقام پر تاویلات کرنا پڑیں۔ آپ نے ملائکہ کی جتنی بھی تعبیریں پیش فرمائی ہیں۔ یہ سب انسانوں حتیٰ کہ کافروں اور دہریوں میں بھی مسلم ہیں۔ لہٰذا ان کا نہ ایمان بالغیب سے کوئی تعلق ہے اور نہ قرآن کے واضح ارشادات سے۔

۳۔ کتابوں پر ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کا تیسرا جزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تمام کتابوں پر ایمان لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی الہامی کتابوں اور اسی طرح قرآن مجید پر ایمان بالغیب لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ یقین رکھے کہ جو پیغام اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے ذریعے رسول تک پہنچایا ہے وہ فی الواقع اللہ ہی کا کلام یا پیغام ہے۔ نیز یہ کہ جس رسول (محمد ﷺ) پر پیغام نازل ہوا ہے۔ انہوں نے من وعن اس کو دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔

قرآن کے جملہ احکام واجب التعمیل ہیں۔ اس میں ایک حکم کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے رسول پر یہ کتاب اس لیے اتاری کہ وہ لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور اس قرآن کے مجمل احکام

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کی تشریح و تفسیر کرے اور احکام کی بجا آوری کے طور و طریق بھی لوگوں کو بتائے چنانچہ حامل قرآن نے قرآن کا وہی مفہوم امت کو بتایا ہے۔ جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے رسول کو دی۔

انکار سنت اور انکار قرآن لازم و ملزوم ہیں: اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں واقعی قرآن کو منزل من اللہ تسلیم کرتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے کلام الٰہی اور مکمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ نہ ہی اس میں آئندہ ردو بدل یا تحریف کا امکان ہے۔ مگر میں اس کی تعبیر و تاویل میں حامل قرآن تعبیر و تاویل اور تشریح کا پابند نہیں۔ بلکہ ہر ایک کو یہ حق ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کی حسب ضرورت یا حسب پسند تفسیر کرے تو درحقیقت اس نے قرآن کے بے شمار احکام کو پس پشت ڈال دیا۔ جن میں صرف اطاعت رسول اور اتباع رسول کو عین اللہ کی اور کتاب اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اور ایسا شخص جو قرآن کی بعض آیتوں پر ایمان لاتا اور انہیں واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ لیکن بعض آیتوں کو واجب التعمیل نہ سمجھ کر فی الحقیقت ان کا کفر کرتا ہے۔ لہٰذا کتاب اللہ کی وہی تاویل و تعبیر معتبر ہوگی جو رسول اللہ نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ پیش فرمائی اور صحابہ کرام نے اسے من و عن قبول کیا۔ کتاب اللہ کی تاویل و تعبیر اگر سنت رسول کے خلاف کی جائے گی تو وہ غیر معتبر اور مردود ہوگی۔ کیونکہ تشریح و تعبیر کا حق بھی اللہ نے ہی آپ کو دیا ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ بیان بھی ہماری طرف سے ہے یہی کتاب و سنت کا باہمی رشتہ ہے۔

کتاب اللہ پر ایمان کے سلسلہ میں ہم مزید تفاصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ کیونکہ یہ ساری کتاب ہی اسی موضوع کی تفصیلات ہیں۔ سردست ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج کل انکار سنت کے لازمی نتیجہ انکار قرآن کے سلسلہ میں طلوع اسلام سب سے پیش پیش ہے۔ بظاہر یہ حضرات خالص قرآن کی دعوت دیتے ہیں اور اس خالص دعوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس دعوت میں کوئی بات بھی سنت رسول کے مطابق نہیں۔ (اس کی کئی مثالیں آپ کو "طلوع اسلام کے نظریات اور خصوصیات کلام" کے عنوان کے تحت مل جائیں گی۔ پھر پرویز صاحب کا اپنی بصیرت کو قرآن سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اشتراکیت جیسے استبدادی معاشی نظام کو عین اسلام اور قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ قرار دیا ہے۔ اور اس نظام کو وہ قرآنی نظام ربوبیت کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

قرآنی نظام ربوبیت اور سارا قرآن: حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود قانون ربوبیت کے مطابق معاشرہ کا قیام ہے۔ پورا قرآن ان تفاصیل سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں ان نظریوں کے اصول و مبانی کا ذکر ہے۔ کہیں آفاقی کائنات کی مشینری کو مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔" (ق۔ ن ر ص ۱۰۷)۔

کیا قرآن مکمل کتاب ہے؟: اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی دو رنگی یہ ہے کہ اگر سنت کی ضرورت زیر بحث ہو تو یہ حضرات قرآن کو مکمل کتاب ثابت کرتے ہیں اور اس طرح کی آیات پیش کرتے ہیں "تبیانًا لکل شی (۸۹:۱۶) وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۵۹:۶) اور حافظ اسلم تو اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لکُمْ دِیْنَکُمْ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب دین مکمل ہو چکا تو احادیث کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی؟ احادیث کی حیثیت بس تاریخی اور ظنی ہے۔ جو بہت عرصہ بعد لکھی گئیں۔ اگر احادیث بھی دین کا حصہ تھیں تو یہ آدھا یا آدھے سے زیادہ دین جو احادیث میں مندرج ہے اس کے بغیر دور صحابہ میں دین کیسے [1] مکمل ہو گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب یہ حضرات حقائق اور عملی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں یہی مکمل کتاب نامکمل آنے لگتی ہے اس سلسلہ میں درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

"دوسری قابل غور حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کچھ احکام دیئے گئے ہیں۔ لیکن بیشتر امور میں اصولی ہدایات دی گئی ہیں۔ نظام خداوندی کا (رسول اللہ کا نہیں بلکہ نظام خداوندی کا مولف) فریضہ یہ ہے کہ وہ ان اصولوں کی (احکام کی نہیں بلکہ اصولوں کی) جزئیات حالات کے تقاضے کے مطابق جماعت مومنین کے مشورہ [2] سے خود مرتب کرے۔" (م۔ ح ص ۶۵)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

"اس تمام عرصہ میں توجہات کا مرکز حدیث ہی رہی۔ (یا فقہ جو احادیث کی روشنی میں مرتب کی جاتی رہی) اس لیے کہ قرآن کریم میں احکام بہت تھوڑے تھے۔ اور زندگی کی عملی ضروریات ان سے کہیں زیادہ۔" (ایضاً صفحہ ۶۹)

پھر اور مقام پر یوں کہتے ہیں:

"ہمارا ایمان ہے کہ قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی ہدایت قیامت تک نافذ العمل رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطہ ہدایت میں ہر قسم کے مسائل و معاملات کے لیے جزئی اور فرعی احکام نہیں دیئے جا سکتے تھے۔" (م۔ ح ص ۲۴۲)

ان اقتباسات سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

① قرآن ایک نامکمل کتاب ہے۔ جس میں احکام بہت تھوڑے ہیں اور ان تھوڑے سے احکام کی بھی جزئیات اور فروعات اس کتاب میں دی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔

② فقہ حدیث کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاتی رہی۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کا امام ابو حنیفہ کو منکرینِ حدیث کے زمرہ میں شمار کرنا غلط ہے۔ وہ فقیہہ تھے اور فقہ حدیث کو سامنے رکھ کر ہی مرتب کی جاتی رہی ہے۔

---

[1] ان تمام باتوں کا جواب ہم تفصیلی طور پر مناسب مقامات پر دے چکے ہیں۔

[2] کیا طلوع اسلام یہ بتانے کی زحمت گوارا کرے گا کہ رسول اللہ (یا اس دور کے نظام خداوندی) نے نماز زکوۃ اور حج کی جزئیات متعین کرنے کے لیے صحابہ (جماعت مومنین سے کب یا کتنی دفعہ مشورہ کیا تھا اور ان مجالس مشاورت میں کیا کیا جزئیات معین ہوئی تھیں اور کیسے ہوئی تھیں؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

③ امام ابو حنیفہ پر مقام حدیث میں ایک الگ مضمون بھی ہے جس میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ صرف قرآن کو سامنے رکھ کر فقہ مرتب کرتے تھے۔ مگر اقتباس بالا میں یہ فرماتے ہیں کہ فقہ احادیث کی روشنی میں مرتب کی جاتی رہی۔ "جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ قرآن اور حدیث دونوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاتی رہی ہے۔ اور طلوع اسلام کی مختلف عبارتوں سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن وہ موقعہ کی مناسبت سے کبھی صرف قرآن سے فقہ مرتب کرواتا ہے اور کبھی صرف حدیث سے۔

④ قرون اولیٰ کے مسلمان قرآن کے اس خلا کو سنت رسول سے پورا کرتے تھے۔ اور حالات زمانہ کا لحاظ صرف فقہ میں رکھتے تھے۔ جب کہ حالات زمانہ طلوع اسلام کے نزدیک اہم معاملہ ہے کہ وہ اس خلاء کو ایسے مرکز ملت سے پر کروانا چاہتا ہے جو پہلے سنت رسول پر ہاتھ صاف کرتا پھر سنت اور اجتہاد کی دونوں نشستوں پر براجمان ہوتا ہے۔

نامکمل دین؟ : پرویز صاحب "مرکز ملت" کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ذرا غور فرمایئے کہ دین کا یہ مفہوم انسان کے سامنے کیا تصور پیدا کرتا ہے؟ اگر خدا نے ان جزئیات (جو قرآن میں مذکور نہیں) کا تعین رسول اللہ پر چھوڑا تھا۔ تو رسول اللہ کے لیے کونسا امر مانع تھا۔ کہ وہ بھی تمام احکام کی جزئیات متعین نہ فرما سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بالعموم اہل فقہ آگے بڑھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کے اس قسم کے ناتمام احکام کی تکمیل ائمہ فقہ نے کر دی ہے۔ لہٰذا جن احکام کی جزئیات نہ قرآن میں ملیں نہ حدیث میں انہیں آئمہ فقہ کے فیصلوں سے حاصل کرنا چاہیئے اور اگر کوئی بات آئمہ فقہ کے ہاں سے بھی نہ ملے تو؟" (م۔ح ص۳۴۸)

یہ ہے وہ اہم سوال جس کو طلوع اسلام نے لاجواب سمجھ کر استفہامیہ انداز میں پیش کیا ہے حالانکہ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ صرف ایک ہستی تھی جس پر وحی نازل ہوئی تھی اور وہ فوت ہو چکے۔ لہٰذا نہ اب قرآن میں کمی بیشی ہو سکتی ہے نہ آپ کے سنن میں۔ اس لحاظ سے قرآن اور حدیث دونوں کے احکام و فرامین غیر متبدل ہونے چاہئیں۔ لیکن اہل فقہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ بہت ہیں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اجتہاد کا دروازہ آج بھی کھلا ہے جب کہ کتاب و سنت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور یہی فقہ کا میدان حالات زمانہ کے تقاضوں کا میدان ہے۔ اس میں آپ بڑے شوق سے حالات زمانہ کے تقاضوں کی طبع آزمائی فرمایئے اور اگر کبھی مرکز ملت معرض وجود میں آبھی جائے تو اس کا دائرہ کار بس یہی ہے کہ وہ کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر زمانہ کے حالات کے مطابق ذیلی تدابیر و قوانین وضع کرے۔ وہ رسول کی گدی پر کیسے براجمان ہو سکتا ہے جب کہ وحی بند ہو چکی ہے۔

قرآن فہمی کا پرویزی طریقہ : اگر قرآن کی الہامی یا نبوی تشریح و تعبیر کو درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص اس تشریح و تعبیر میں آزاد ہے اور یہی کچھ پرویز صاحب چاہتے ہیں۔ اب جس طرح وہ خود

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تشریح و تعبیر متعین کرتے ہیں اس کا طریقہ انہوں نے یہ بتایا کہ:

"قرآن کی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ احکام سے متعلق ہے۔ دوسرا علوم سے۔ احکام کا حصہ چونکہ قانون سے متعلق ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا مفہوم متعین ہو۔ قرآن کا دعوی ہے کہ وہ اپنا مفہوم خود متعین کرتا ہے اور تصریف آیات سے اس مفہوم کی وضاحت کر دیتا ہے۔ ان احکام کو قانون کی زبان اور حدود و شرائط کے ساتھ ایک ضابطہ کی شکل میں نافذ کرنا ہر دور کی اسلامی حکومت کا کام ہے۔ قرآن اس قانون کو انفرادی تفقہ پر نہیں چھوڑتا۔ بلکہ حکومت کے مرکز کے سپرد کرتا ہے۔ اور اس کی تعبیر ملت کے لیے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے۔ یہی قانون ان الفاظ کی صحیح تعبیر ہوگی۔ اس میں نہ صحیح اور غلط کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ ہی میری یا کسی اور کی تعبیر کا۔ باقی رہا۔ قرآن کا وہ حصہ جو علوم سے تعلق رکھتا ہے تو ظاہر ہے علم انسانی جوں جوں ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس حصے کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کے الفاظ میں یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کے لیے روشنی کا کام دیتا ہے۔ جوں جوں علم انسانی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ جن کا تعلق حقائق عالم سے ہے۔ اپنے وسیع سے وسیع تر معانی کھولتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا انسان قرآنی حقائق کا مفہوم اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے اس باب میں کسی شخص کا فہم قرآن نہ کسی اپنے ہم عصر کے لیے حجت ہو سکتا ہے نہ آنے والے دور کے انسانوں کے لیے سند یا حرف آخر۔ باقی رہا قرآن کا وہ مفہوم جسے حضور اکرم نے سمجھایا۔ سو اسے حضور ﷺ نے مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا۔ اور جو کچھ اس سلسلے میں حضور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کا نمونہ سابقہ صفحات میں سامنے آچکا ہے اسے کسی طرح بھی رسول اللہ ﷺ کا فہم قرآن نہیں کہا جا سکتا۔" (م۔ ح ص ۳۵۳۔ ص ۳۵۶)

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:

① آج تک کے منکرین حدیث نے جن احادیث پر اپنی عقل و بصیرت کی رو سے گرفت کی ہے میرے علم کی حد تک ان کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اب اگر صرف صحیح اور مرفوع احادیث کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد کم از کم دس ہزار ہے۔ گویا ہر سو احادیث میں سے نسبتاً ایک حدیث چونکہ منکرین حدیث کو راس نہیں آتی۔ لہٰذا یہ حضرات تمام تر ذخیرہ احادیث اور فہم نبوی سے انکار کو ہی پسند فرماتے ہیں۔ یہ ہے ان حضرات کا ایمان بالرسالت۔

② قرآن میں احکام کا حصہ بہت کم ہے۔ لہٰذا شریعت ساری کا بیشتر حصہ مرکز ملت ہی کا ذمہ ہے۔ پھر چونکہ یہ مرکز ملت ایک فرد نہیں بلکہ چند افراد کا مجموعہ ہوگا۔ لہٰذا اس کے فیصلہ میں غلط اور صحیح کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جنگ بدر کے اساریٰ کے متعلق مجلس مشاورت نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اس میں تو غلطی کا سوال پیدا ہو گیا تھا لیکن جو مرکز ملت پرویز صاحب قائم فرما رہے ہیں۔ یہ نبی سے بھی زیادہ معصوم اور مبرا عن الخطا ہوگا۔ کیونکہ یہاں غلطی کا سوال بھی پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر محدثین کی پوری جماعت بخاری کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہے تو اس میں تو غلطی کا احتمال ہے مگر مرکز ملت کے جماعتی فیصلہ میں غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ فیا للعجب۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ خلافت راشدہ کے بعد آج تک ایسا مرکز ملت قائم نہیں ہو سکا۔ جو قرآن کے احکام والے حصہ کی جزئیات کی تعیین کرے پھر جب احکام کی جزئیات ہی متعین نہ ہوں تو ان احکام پر عملدرآمد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ گویا اس دور تک جب تک کہ پھر کوئی نیا مرکز ملت قائم نہیں ہو جاتا پرویز صاحب قرآنی احکام کی تعمیل سے چھٹی عنایت فرما رہے ہیں اور ہمارے اس دعوی کی تصدیق پرویز صاحب اور آپ کی جماعت عملی زندگی سے بھی آزاد ہو جاتی۔

③ اور جو حصہ علوم سے متعلق ہے۔ اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ہر انسان اور ہر دور کا انسان آزاد ہے۔ اور کسی ایک کا فہم دوسرے کے لیے حجت بھی نہیں۔ نہ اپنے دور میں نہ مستقبل میں۔ لہٰذا آج تک کی لکھی ہوئی تمام تفسیریں اور ذخیرہ احادیث سب بے کار ہیں۔ پھر اس میں پرویز صاحب کا اپنا فہم قرآن اور آپ کا پورا لٹریچر بھی شامل ہے۔ جو کسی کے لیے بھی حجت نہیں۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ کا فہم قرآن' قرآنی بصیرت اور لٹریچر نہ آج اور نہ ہی مستقبل میں کسی کے لیے حجت ہے۔ تو آپ نے اتنی تکلیف کیوں فرمائی؟

اور اس سے بڑا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام کا حصہ تو اس لیے قابل عمل نہیں کہ ابھی کسی تشریف لانے والے مرکز ملت نے اس کی جزئیات متعین نہیں فرمائیں۔ اور علوم کا حصہ اس لیے بے کار ہے کہ ہر شخص اس کے فہم میں آزاد ہے اور رسول اللہ کی تعبیر و تشریح اس لیے ناقابل قبول ہے کہ اس میں چند احادیث آپ کی رائے میں رسول اللہ کا فہم نہیں ہو سکتیں تو بتایئے کہ اب امت کے لیے قرآن کا کونسا حصہ قابل عمل یا قابل قبول رہ گیا؟ اور کیا اس طرح امت میں کوئی اجتماعیت کی شکل باقی رہ جاتی ہے؟

اور اس سے اگلا سوال یہ ہے کہ مانا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ ہیں لیکن ان الفاظ کی حفاظت کا فائدہ کیا ہے جس کے مفہوم پر دو شخصوں کا آپس میں متفق ہونا بھی ضروری نہ ہو؟ کیا اس طرح اللہ تعالیٰ کی "ذکر کی حفاظت" پوری ہو جاتی ہے؟ اور کیا کتاب پر ایمان لانے کا یہی مطلب ہے کہ قرآن کے الفاظ پر ایمان لایا جائے جن کی کوئی تعبیر بھی قابل قبول یا قابل عمل نہ ہو؟ بہرحال طلوع اسلام کا کتاب اللہ پر ایمان بالغیب کچھ اسی قسم کا ہے۔ (نیز تیسرے حصہ میں دیکھئے۔ (تلاوت قرآن پاک)

۴۔ انبیاء پر ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کا چوتھا جزو انبیاء پر ایمان ہے۔ نبی وہ ہستی ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ اپنے ایک معتبر فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ اپنا پیغام وحی نازل کرتا ہے۔ اور یہ نبی انسان ہی ہوتا ہے نبی پر ایمان لانے کا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مطلب یہ ہے کہ انسان یہ یقین رکھے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فرشتہ بھیج کر اپنا پیغام نازل کیا ہے۔ تاکہ اس دعوت پر جو ایک نبی پیش کرتا ہے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتہ جبریل کے ذریعہ جو پیغام بھیجتا ہے اسے وحی کہتے ہیں۔ انبیاء کو بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات بھی عطا کیے جاتے ہیں جن کا مقصد کفار پر حجت قائم کرنا اور مومنین کے ایمان میں پختگی کا سبب بنتا ہے۔

اب پرویز صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔

وحی کی حقیقت اور نزول وحی : "اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمت کی تمام نسبتوں سے پاک ہے۔ اس لیے نزول وحی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی چیز سچ مچ اوپر کی سمت سے نیچے کی سمت [1] کو آتی ہے۔ خدا تو رگ جان سے بھی قریب ہے۔ اس لیے وحی کی خارجیت سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ (وحی) ذہن انسانی کی پیداوار نہیں اور نہ ہی اس میں صاحب وحی کے کسب وہنر کو کوئی دخل ہے۔" (آدم وابلیس، ص۲۶۱)

"اب دیکھئے پرویز صاحب کے تمام پیشرو اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر عرش پر ہونے کے قائل نہیں تھے۔ لہٰذا ان سب کے لیے نزول وحی کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے۔ سرسید صاحب نے اس وحی کے متعلق جو افکار پیش کیے تھے ان کا جائزہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ ان کے خیال میں اس وحی میں نبی کے قوائے باطنیہ کو گہرا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب ان سے کچھ اختلاف رکھتے ہیں تاہم اوپر سے نزول وحی کا قائل کوئی بھی نہیں۔ اب دیکھے اس قسم کے عقیدہ پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

1 اگر اللہ تعالیٰ رگ جان سے بھی قریب ہے تو درمیان میں فرشتہ کے واسطہ کی ضرورت کیسے پیش آسکتی ہے؟ لہٰذا اس واسطہ سے بھی ان حضرات کو کھل کر انکار کر دینا چاہیئے۔

2 اگر اللہ تعالیٰ رگ جان سے بھی قریب ہے تو وحی کی خارجیت کیسے ہو گئی؟ کیا رگ جان جسم سے خارج ہوتی ہے۔

3 وحی کے اتارنے کے لیے قرآن میں ہر مقام پر تنزیل اور اَنْزَلَ کا لفظ آیا ہے جس کا معنی اوپر سے نیچے آنا ہی ہے (نزول کا ضد صعود بھی ہے۔ عروج بھی جس کے معنی نیچے سے اوپر جانے یا چڑھنے کے ہیں) یہ الفاظ بھی اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر ہے۔

عقل اور وحی : "قرآن صرف اس قدر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے کہ ان ابدی حقائق کو معلوم کرنا جو فطرت انسانی کے ترجمان ہیں اور جن کے مطابق نظام اجتماعیہ قائم کرنے سے کاروان انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحی کی رو سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اتنے حصے کو آپ مافوق الفطرت کہہ لیجیے یا خارقِ عادت۔ اس کے بعد وہ دانش وبصیرت کو پوری آزادی دیتا ہے۔ کہ

---

[1] پرویز صاحب خود اپنی تصنیف تصوف کی حقیقت ص ۲۱ پر وحی کے خارج سے منزل اللہ ہونے کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔ "یہ (علم) اسے (نبی کو) خارج سے منزل من اللہ ملتا ہے۔"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

وہ ان حدود میں رہتے ہوئے جو وحی نے متعین کر دیئے ہیں اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل خود دریافت کرے پھر وحی کو بھی وہ بجبر واکراہ نہیں منواتا۔ اس لیے اس نے حامل وحی کی تحریک انقلاب کی تائید حسی معجزات سے نہیں کی۔" (ایضاً ص ۲۹۷)

اس اقتباس میں مذکورہ امور پر تفصیلی بحث ایک الگ مضمون "مفہوم القرآن پر ایک نظر" میں آرہی ہے۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت کا مقصد بنی نوع انسان کی ہدایت بیان فرمایا ہے اور اس کا طریق یہ تھا کہ اللہ نے انبیاء کو مبشرین ومنذرین بنا کر بھیجا۔ یعنی وہ احکام خداوندی کی تعمیل کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری دیتے تھے اور ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جہنم کے عذاب سے ڈراتے تھے۔ انبیاء کی تعلیم کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت اور شرک سے اجتناب ہوتا تھا۔ ایمان بالغیب کے تمام اجزاء کو پختہ کرنے کے بعد آخر میں معاشرتی احکام نازل ہوتے رہے۔ اس کے برعکس پرویز صاحب کے نزدیک انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"انبیاء کی ہدایت کا منشاء یہی تھا کہ معاشی خوشگواریوں میں بھی ترقی ہوتی رہے اور اس کے ساتھ انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں بھی پیدا نہ ہوں" (ن۔ ر ص ۱۵۶) بلکہ اس سے بڑھ کر یہ تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی قرآنی نظام ربوبیت کی تعلیم اور اس کا قیام تھا جیسا کہ تفصیلاً ہم پہلے قرآنی نظام ربوبیت کے عنوان کے تحت پیش کر چکے ہیں۔

سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام

یہ قصہ بھی ہم سرسید صاحب کے عقائد کے تحت تفصیل سے درج کر آئے ہیں۔ نہ سرسید حضرت آدم کو فرد واحد' تمام انسانوں کا باپ اور نبی مانتے تھے۔ نہ پرویز صاحب مانتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق آدم علیہ السلام "قصہ آدم وابلیس" کے ڈرامہ کا ایک کردار ہے جو نوع انسان کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم چونکہ حضرت آدم کو فرد واحد اور نبی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لہٰذا پرویز صاحب ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ۔

آدم علیہ السلام کے فرد واحد اور نبی ہونے کا اعتراف اور اس کی تاویل: قرآن کریم میں البتہ ایک مقام پر آدم کا لفظ اس انداز سے بھی آیا ہے جو "فرد واحد" کے مفہوم کا حامل ہے۔

﴿ ۞ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا ﴾ (آل عمران ۳/ ۳۳) "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت نوح کو چن لیا۔"

یہاں آدم کا ذکر نوح کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

خاص فرد ہے جو نبی تھا..... آیت مذکورہ میں چونکہ آدم کا ذکر نوح علیہ السلام کے ساتھ آیا ہے۔ اور دونوں کے لیے اصطفٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ یہ آدم نبی تھے۔

اگرچہ قرآن کریم میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہو سکتا ہے آدم کسی بنی آدم کا نام ہو" (آدم وابلیس ص۵۵۔۵۶)..... لہٰذا قصہ زیر نظر کے آدم کوئی نبی تھے تو انہیں ابلیس کبھی نہیں پھسلا سکتا تھا۔ اس لیے تصریحات قرآنی کے مطابق جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا۔ بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ جس کی ذریت سے مراد تمام نوع انسانی ہے نہ کہ کسی فرد واحد کی نسلی اولاد۔" (ایضاً ص۵۷)

اب دیکھئے کہ:

① حضرت آدم کے فرد واحد اور نبی ہونے کا ایک ثبوت تو پرویز صاحب نے خود بتا دیا جس سے انہیں محض ظن غالب حاصل ہوا ہے اور نص صریح انہیں کہیں نظر نہیں آئی۔ جو یہ ہے فتلقّٰی اٰدمُ مِنْ رَّبِّہٖ کلمات (۲:۳۷) یعنی آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے۔ اور یہ پروردگار سے سیکھنے کا کام صرف کسی نبی کا ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری نص صریح یہ ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت آدم سے فرماتے ہیں۔ فَاِمَّا یَاتِیَنَّکُمْ مِنِّیْ ھُدًی (۲:۳۸) تو جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے..... یہ اللہ کی طرف سے ہدایت بھی کسی نبی ہی کو پہنچتی ہے کسی دوسرے کو نہیں لیکن یہ آیات پرویز صاحب اس لیے نہیں دیکھتے کہ ان کے ارتقائی نظریہ میں یہ حائل ہوتی ہیں جو انہیں اپنے اسلاف سے ملا ہے۔ لہٰذا تاویل یہ کر ڈالی کہ یہ فرد واحد یا نبی ممکن ہے کہ اولاد آدم میں سے کوئی شخص آدم نامی ہو۔ یہ تاویل بھی باطل ہے کیونکہ جس مقام پر قرآن میں یہ تمثیلی داستان مذکور ہے۔ اسی مقام پر آدم کے فرد واحد اور نبی ہونے کے متعلق مذکورہ بالا نصوص موجود ہیں۔

۲۔ پرویز صاحب نے دوسری بات یہ پیش فرمائی کہ اگر یہ آدم نبی ہوتے تو ابلیس انہیں کبھی پھسلا نہیں سکتا تھا۔ یہ مفروضہ بھی غلط ہے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں آدمی ناحق مارا گیا۔ تو آپ نے کہا۔ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ۔ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ (۲۸:۱۵) تو اگر موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی اور رسول کو شیطان پھسلا سکتا ہے تو آدم کے لیے یہ بات کیسے ناممکن ہو گئی۔ نیز قرآن میں واضح الفاظ موجود ہیں فَدَلّٰھُمَا بِغُرُوْرٍ (شیطان نے ان دونوں (آدم وحوا) کو دھوکے سے مائل کر لیا)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ عصمت انبیاء کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ ان کی ایسی خطائیں اور لغزشیں ساتھ ہی ساتھ معاف کر دی جاتی ہیں۔ لہٰذا پرویز صاحب کے پیش کردہ نتائج قرآن کی روشنی میں غلط قرار پاتے ہیں۔ رہا حضرت آدم کی پیدائش نفخ روح' ابلیس اور اس کے مختلف پرویزی مفہوم' مکالمہ اور جنت سے خروج تو ان سب باتوں پر ہم مناسب مقامات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

خاتم النبیین ﷺ پر ایمان

حضرت آدم پر ایمان لانے کی بات انبیاء پر ایمان کا آغاز تھا اب سب سے آخری نبی پر ایمان لانے کا مطلب پرویز صاحب کی زبان سے سن لیجیے۔

"توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن رسول پر ایمان سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں کیونکہ اس کی ذات تو زمان ومکان کے حدود کی پابندی ہوتی ہے۔ اور ملت اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ابدیت سے ہم کنار ہے..... رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے۔ جو حضور ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی (فردوس گم گشتہ ص ۳۸۳)

گویا کتاب پر ایمان لانے کے بعد رسول پر ایمان لانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اسی طرح کتاب پر ایمان لانے کے بعد فرشتوں پر ایمان لانے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے بالخصوص اس صورت میں کہ انہیں کسی نے دیکھا تک نہیں۔ باقی رہا اللہ پر ایمان تو اس پر ایمان لانے سے پیشتر یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ اللہ ہے کیا اور اس سے مراد کیا کیا کچھ ہے؟ یہ تفصیل بھی ہم سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ بس ایک کتاب ہی کتاب ہے۔ جس پر ایمان لانے سے یہ سب مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اب اس کتاب پر جیسا ان حضرات کا ایمان ہے اس کی تفصیل اس پوری کتاب میں جا بجا مذکور ہے۔

مقام رسالت کیا ہے؟ اور اطاعت رسول کو قرآن نے کتنی اہمیت دی ہے۔ یہ سب تفاصیل ہم "مرکز ملت" کے باب میں ذکر کر آئے ہیں۔ لہٰذا اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے سردست اتنا ہی بتانا کافی ہے کہ پرویز صاحب رسول اللہ کو اس مقام سے صرف اس لیے ہٹانا چاہتے ہیں کہ خود اس مقام پر براجمان ہو سکیں اور یہ بات ہم خود نہیں کہتے بلکہ اس کے لیے طلوع اسلام کے اراکین کی ہی شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

زندہ رسول: بزم طلوع اسلام کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب طلوع اسلام کنونشن کو خطاب فرماتے ہیں۔ عنوان ہے "طلوع اسلام نے کیا دیا؟"

"عملی انتظام کی سہولت کے لیے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر "فیکم رسول" کے سلسلہ کو قائم رکھتی ہے اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد "فیکم رسول" سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے۔ اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے۔ (طلوع اسلام' ۹ جون ۱۹۵۹ء)

اب طلوع اسلام کے ایک اور معزز رکن محمد علی خان بلوچ بی اے آنرز (جو غالباً اس بزم سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں) فرماتے ہیں۔

پرویز صاحب کی رسالت: "غالباً ہماری طرح آپ حضرات میں بہت سوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اب

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کچھ عرصہ سے اس وجہ اشتراک کے پردہ میں کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں نوع انسانی کو قرآن کریم کی دعوت دی تھی۔ بزعم خویش آج کل اسی طرح گلبرگ لاہور کی کوٹھی نمبر ۲۵۔ بی میں جناب پرویز بھی قرآن کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب پرویز صاحب اپنی تحریروں میں عموماً اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کے بلند مقام پر فائز کر کے ان تمام آیات کو جو آنحضرت سے متعلق ہیں اپنی ذات پر منطبق فرما لیتے ہیں۔ پھر جو آیات قرآنی مخالفین اسلام اور کفار کے متعلق نازل ہوئی تھیں انہیں نہایت چابکدستی سے اپنے مخالفین پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کجا حضور ختمی المرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام اور کہاں جناب پرویز ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(حدیث دلگدازے ص ۲۰ مرتبہ محمد علی خاں بلوچ بی اے آنرز)

اس طرح پرویز صاحب رسول اکرم کے متبع اور پیروکار کے طور پر نہیں بلکہ حریف کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جو ایک طرف رسول اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کو واجب الاتباع نہیں سمجھتے بالفاظ دیگر حجیت حدیث کے منکر ہیں اور دوسری طرف مرکز ملت۔ جو آپ ہی ذات والا صفات سے عبارت ہے۔ کے اجتہادات کو شریعت کا جز قرار دیتے اور انہیں واجب الاتباع سمجھتے اور اس نظریہ کی تشہیر میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

نگہ بازگشت : اب تک ایمان بالغیب کے جن اجزاء پر بحث ہو چکی ان کا ماحصل یہ ہوا کہ۔

① رسالت پر ایمان کا مطلب کتاب یا قرآن پر ایمان ہے لہٰذا رسالت پر ایمان کا قصہ ختم ہوا۔

② کتاب پر ایمان کا مطلب محض اس کے الفاظ پر ایمان ہے کہ وہ من جانب اللہ ہیں رہا اس قرآن پر عمل تو وہ ناممکن ہے کیونکہ اس میں دو طرح کی آیات ہیں۔ آیات احکام جن کی جزئیات درست وہی ہو سکتی ہیں۔ جو مرکز ملت تشریف لا کر متعین کرے گا۔ رہا علوم کا حصہ تو اس کی شرح و تعبیر میں ہر شخص آزاد ہے۔ مگر ضروری بات یہ ہے کہ کسی ایک شخص کی شرح و تعبیر دوسرے کے لیے حجت نہیں۔ گویا یہ حصہ انفرادی اختلافات کی آماجگاہ ہے۔

③ فرشتوں پر ایمان کا مطلب انہیں کائنات کی خارجی یا انسان کی داخلی قوتیں سمجھنا ہے۔ یہ رسول کی داخلی قوت ہی تھی جس کے ذریعے سے قرآن اترا ہے۔

④ یہ قرآن اترا کہاں سے اور کیسے اترا؟ یہ معلوم نہیں کیونکہ اللہ اوپر نہیں ہے۔ آپ قانون خداوندی کو بھی اللہ کہہ سکتے ہیں۔ صفات خداوندی کو بھی خدا کے نظام کو بھی قرآنی معاشرہ کو بھی اور مرکز ملت کو بھی۔ البتہ مرکز ملت میں کبھی خدا کا رسول بھی شامل ہو جاتا ہے۔

۵۔ یوم آخرت پر ایمان

ایمان بالغیب کی پانچویں کڑی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور خدا کے حضور پیش ہونے پر ایمان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے جسے ایمان بالآخرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس دوبارہ زندگی کو قرآن نے آخرت' یوم الآخرت یوم الدین' قیامت' الساعۃ' یوم' القیامت یوم النشور' یوم الحشر کئی ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ یوم آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا کی زندگی میں اچھے یا برے اعمال وافعال سرانجام دیتا ہے۔ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر کے اس کے اعمال کا بدلہ اسے دیا جائے گا۔ اسی دنیا میں انسان کے نیک وبد اعمال کا فوری طور پر اچھا یا برا بدلہ دینا خدا کی مشیت کے خلاف ہے۔ پھر خدا چونکہ عادل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس دارالامتحان کے بعد ایک دارالجزاء بھی قائم ہو۔ اسی دارالجزاء کا نام یوم آخرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور کتاب کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتا دیا ہے کہ انہیں دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے کون سے اعمال اچھے ہیں اور کون سے برے۔ لہٰذا جو انسان ایسے باوثوق ذرائع سے خدا کے نازل شدہ پیغام کی اتباع نہیں کرتا۔ اس کو یقیناً سزا ملنی چاہیئے۔ اسی طرح جو انسان اس کے پیغام کی نافرمانی کی استطاعت رکھنے کے باوجود اس کا اتباع کرتا ہے۔ اس کو اس کی جزاء یا بہتر بدلہ بھی ضرور ملنا چاہیئے۔ یہی جزا و سزا کا عادلانہ نظام یوم آخرت کو قائم ہوگا۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر حیات بعد الممات پر ایمان نہ لایا جائے تو پہلی چار چیزوں پر یعنی ایمان بالغیب بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہی چیز انسان کی عملی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر ضمناً اس میں جنت اور دوزخ کا ذکر بھی آجاتا ہے۔

مزید تفصیلات جو ہمیں قرآن سے ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ صور میں دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ پہلے نفخہ پر یہ کائناتی نظام اس زمین سمیت اور اس پر رہنے والے سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس نفخہ کو الساعۃ "یا مخصوص گھڑی" کہا گیا ہے۔ اور یہ یک لخت ہی آن پہنچے گی۔ لوگوں میں کسی کو اس کے یک لخت آن پہنچنے کا گمان تک بھی نہ ہوگا۔ اور اللہ کے سوا کسی کو اس "الساعۃ" کا وقت معلوم نہیں۔ دوسرے نفخہ صور پر تمام مرے ہوئے انسان اپنی اپنی قبروں یا مدفن سے جی اٹھیں گے۔ پھر اللہ کے حضور حاضری کے لیے روانہ ہوں گے۔ اس دن کو قیامت' یوم الحشر' یوم النشور وغیرہ کہا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد یوم آخرت کا دور شروع ہوگا۔ اس دور میں لوگوں کا حساب وکتاب ہوگا۔ میزان اعمال ہوگا گواہیاں بھی حسب ضرورت قائم ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی۔ پھر لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔ یہ سب امور ایسے ہیں جو قرآن کی نصوص صریحہ سے ثابت ہیں۔

اب ان مذکورہ بالا امور کے پرویزی مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے۔ سب سے پہلے نفخہ اول واقع ہوگا جو یک دم اور اچانک واقع ہوگا جس سے تمام کائنات زیر وزبر ہو جائے گی اور اسی دن کو قرآن نے الساعۃ کہا ہے۔ اب پرویز صاحب جو اس الساعۃ سے مفہوم لیتے ہیں وہ یہ ہے۔

الساعۃ بمعنی یوم انقلاب ربوبیت :

﴿وَإِنَّ ٱلسَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَٱصْفَحِ ٱلصَّفْحَ "جس انقلاب کے لیے تم جدوجہد کر رہے ہو وہ تو آکر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ (الحجر ۱۵/ ۸۵) رہے گا سو تم ان لوگوں سے نہایت عمدگی سے دامن بچا کر نکل جاؤ۔" (ن۔ ر ص ۲۱۴)

گویا پرویز صاحب کے نزدیک الساعۃ سے مراد یوم انقلاب نظام ربوبیت ہے۔ نیز یہ "الساعۃ" ان کے خیال کے مطابق کئی بار آچکی ہے۔ ہر نبی پر یہی نظام ربوبیت نازل ہوتا رہا ہے اور وہ آخر یہ انقلاب بپا کرتے ہی ہوں گے۔ اور رسول اکرم ﷺ نے بھی کیا ہی تھا۔ پھر پرویز صاحب خود بھی اس نظام کے انقلاب کے امیدوار ہیں۔ اور ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ نظام ربوبیت نہ کبھی پہلے آج تک قائم ہوا اور نہ کبھی آئندہ قائم ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا اگر الساعۃ کا یہی مفہوم لیا جائے تو ایسی الساعۃ نہ کبھی پہلے آئی نہ ہی آئندہ آئے گی۔

قیامت کا مفہوم: "اصل سوالات تو یہ ہیں کہ قرآن کے نزدیک حیات کسے کہتے ہیں؟ موت کے کیا معنی ہیں؟ قیامت کا تصور کیا ہے؟ عذاب وثواب سے کیا مفہوم ہے؟ وقس علی ہذا مسلمان کو چونکہ اس زندگی سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اس لیے اس نے ان اہم سوالات کو قیامت پر ملتوی رکھا ہے اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئے گی۔ وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو اسکی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے اور اس جنت ودوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے۔ جس میں قوموں کے اعمال حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں۔" (قرآنی فیصلے ۳۳۲)

اس مختصر سے اقتباس میں پرویز صاحب نے دراصل قیامت اور اس دن کے میزان اعمال اور بدلہ میں جنت دوزخ میں ورود ہر چیز سے انکار کر دیا ہے پھر انہیں مسلمانوں سے یہ بھی شکایت ہے کہ یہ سب امور اسی دنیا سے متعلق کر کے کچھ بھی دیکھتے اور سمجھتے نہیں۔ پھر آپ مسلمانوں کو میزان اعمال کی حقیقت ان الفاظ میں سمجھاتے ہیں۔

میزان اعمال کب اور کیسے؟: قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دور (سرمایہ داری) گزر گیا۔ اب وہ زمانہ (نظام ربوبیت کا) آرہا ہے۔ جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی کی جائے گی۔ (وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۲۱:۴۷) اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی مزدور کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب زمیندار یا سرمایہ دار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا حصہ کتنا؟ (نظام ربوبیت' ص:۲۵۶)

اب چونکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ دور سرمایہ داری گزر گیا۔ لہٰذا آپ کو پرویز صاحب کی یہ بات تسلیم کر ہی لینی چاہیئے۔ یہ نہ پوچھئے کہ قرآن کی کون سی آیت کا یہ معنی یا مفہوم ہے؟ بہرحال یہ اعمال کا تول اور حساب وکتاب نظام ربوبیت کے دن ہوگا۔ اور اس میں حساب بھی صرف مزدور اور سرمایہ دار کا لیا جائے گا۔ باقی تاجر' چرواہے یا دیگر پیشہ وروں اور عورتوں سے کوئی حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

یوم الحشر یا یوم النشور کب ہو گا؟: قرآن کی رو سے تو یہ دوسرے نفخہ کا دن ہو گا۔ لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ۔

اس وقت تمام نوع انسانی (ذاتی مفاد کے پیچھے بھاگنے کی بجائے) خدا کی ربوبیت عامہ کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی۔ (یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ (۶:۸۳) (ن۔ ر ص ۲۳۱)

یہ یاد رہے کہ جب یہ انقلاب نظام ربوبیت بپا ہونے کو ہو گا تو اس کو بپا کرنے کے لیے تمام نوع انسانی اٹھ کھڑی ہو گی۔ انبیاء جس جماعت کے ذریعہ جہاد سے اسلامی انقلاب بپا کرتے رہے وہ تو چند ہزار آدمی ہوتے تھے لیکن اس انقلاب کے لیے کیا مسلم کیا کافر' کیا دہریے غرضیکہ تمام نوع انسانی اٹھ کھڑی ہو گی۔ بتایئے اگر ایسا ہو جائے تو کیا پھر بھی یہ انقلاب بپا نہ ہو گا؟

آخرت کے مختلف مفاہیم: یہ بحث نظام ربوبیت میں گزر چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ لفظ آخرت کا مفہوم مسلمانوں کے نزدیک صرف ایک ہے اور وہ ہے حیات بعد الممات کا دور۔ لیکن پرویز صاحب لفظ آخرت کے چھ مفہوم بتاتے ہیں۔ (۱) مستقبل کی زندگی (۲) کلی مفاد (۳) آنے والی نسلوں کا مفاد (۴) مرنے کے بعد کی زندگی (۵) آخر الامر (۶) حال اور مستقبل کی خوشگواریاں۔

آخرت اور جنت و دوزخ: آخرت کا چوتھا مطلب یعنی مرنے کے بعد کی زندگی۔ آپ صرف برائے وزن بیت استعمال فرمایا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس زندگی کی کیفیات اور جنت ودوزخ کے متعلق آپ فرمایا کرتے ہیں کہ اس زندگی کا ادراک ہم ان موجودہ مادی ذرائع سے نہیں کر سکتے۔ حالانکہ قرآن نے کی زندگی میں بیشتریہی کیفیات اور تفصیلات بیان کی ہیں اگر آپ اس وحی کی موجودگی میں اپنے آپ کو مادی ذرائع کی وجہ سے محتاج ادراک سمجھتے ہیں۔ تو پھر ایمان بالغیب آخر کب کام آئے گا؟ اور اصل وجہ اس چوتھے مطلب کو درخود اعتناء نہ سمجھنے کی یہ ہے کہ نظام ربوبیت کے سلسلہ میں یہ مفہوم کار آمد چیز نہیں بلکہ الٹا کچھ نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ جب کہ دوسرے پانچوں مفہوم جو آپ کے خود ساختہ ہیں اس نظام کے سلسلہ میں بہت کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اب اس بات کی پوری وضاحت درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمایئے۔

آخرت کی کامیابی کا معیار صرف دنیا کی خوشحالی ہے: "قرآن کی رو سے تربیت نفس صرف اس معاشرے میں ہو سکتا ہے۔ جس میں تمام افراد ربوبیت عامہ یا مفاد کلی کے لیے مصروف جدوجہد رہیں۔ اس (یعنی قران) کے نزدیک اعمال حسنہ کے زندہ نتائج دنیا کی خوشحالیوں اور خوشگواریوں کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا کی کامرانی نہیں وہ اعمال قیامت میں بھی کوئی وزن نہیں رکھتے۔ لہٰذا تربیت نفس (یا روحانی ترقی) کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کس حد تک حسین بن چکی ہے۔ (ن۔ ر ص ۱۹۴)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اس اقتباس سے یہ بالوضاحت معلوم ہو گیا کہ اگر کسی کی دنیا خوشگوار اور خوشحال ہے تو اس صورت میں اس کو آخرت میں فلاح و کامرانی کی توقع رکھنی چاہیئے [1] اگر دنیا میں تنگی ترشی رہی تو پھر آخرت بھی برباد ہوگی۔ پھر ایک دوسرے مقام پر اس کی قرآن سے یہ دلیل بھی دی ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷:۷۲) ہم سردست اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور پرویز صاحب کے دعوی اور دلیل میں کوئی ربط بھی ہے یا نہیں۔ ہم سردست یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس معیار اور دنیا و آخرت کے پہلے تین مفاہیم کی موجودگی میں چوتھے مفہوم (یعنی آخرت بمعنی حیات بعد الممات) کی کچھ اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟

جنت اور دوزخ کی حقیقت

پرویز صاحب جس طرح آخرت کو اس دنیا میں لے آتے ہیں۔ اسی طرح جنت اور جہنم کو بھی اسی دنیا میں لے آتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا ہم اب محض اقتباسات پر ہی اکتفا کریں گے۔

"جس طرح مسلمانوں نے اللہ کو عرش پر بٹھا رکھا ہے۔ اس طرح انہوں نے جنت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔" (سلیم کے نام گیارہواں خط' ص ۵۹-۱)

جنت کی زندگی : جنت کی زندگی میں بھوک' پیاس' لباس اور مکان کی تنگی نہیں ہوتی۔ غور کیجیے یہی چیزیں انسان کی بنیادی ضروریات زندگی ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جنت میں آدم اور اس کی بیوی سے کہا گیا تھا کہ جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ پیو یعنی جنت کی زندگی میں سامان خورد و نوش سے بالکل اطمینان ہوگا" (ن۔ ر ص ۵۶)۔

آدم کا جنت سے خروج : آدم ابلیس کے چکمے میں آ گیا۔ فرزندان آدم میں سے ہر ایک اپنی اپنی فکر میں لگ گیا وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ یہ بعد حسد اور کینے اور بغض اور عداوت میں تبدیل ہو گیا۔ رزق کی کشائش تنگی میں بدل گئی آدم بھوک برہنگی' بے سرو سامانی' خوف و ہراس کے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس طرح آدم جنت سے نکل گیا۔ (ن۔ ر ص ۲۳۶)۔

---

[1] کفار اور مشرکین کی بھی یہی دلیل ہوتی تھی کہ ہماری دنیا چونکہ خوشگوار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا خدا ہم سے خوش ہے۔ لہٰذا وہ آخرت میں بھی ہمیں خوشگواریاں ہی عطا کرے گا۔ نیز اس کی مزید تفصیل عجمی سازش کے تحت گزر چکی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

جہنم کی حقیقت : دیکھئے قرآن نے بتایا کہ جہنم وہ مقام ہے جس میں زندگی کی نشوونما رک جاتی ہے۔ وَلَا يُزَكِّيهِمْ (۲:۱۷۴) ان کے لیے مستقبل کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ ...... وَلَا يُزَكِّيهِمْ (۳:۷۷) جہنم کے لیے عربی لفظ جحیم آیا ہے۔ جحیم کے معنی روک دینے کے ہیں۔ یعنی اہل جہنم وہ ہیں جن کی نشوونما رک چکی ہو اور وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ رکھیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی ذات یا نفس (خودی یا انا) کی نشوونما (تزکیہ۔ تربیت) ہو جائے۔" (ن۔ ر ص۶۷)

جنت اسی دنیا میں : پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس پروگرام (ربوبیت) کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ (فَسوفَ تعلَمُونَ) یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت میں جاکر دیکھ لینا کہ کون جنت میں جاتا ہے اور کون جہنم میں۔ کہا یہ گیا کہ ذرا توقف کرو ہمارا پروگرام پورا ہو لینے دو تم ابھی دیکھ لوگے کہ جنت کس کے حصہ میں آتی ہے۔" (ن۔ ر ص۲۱۸)

اب دیکھئے کہ اگر یہ آخرت' جنت اور دوزخ اسی موجودہ دنیا میں ہیں تو ان پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ ایسی آخرت اور جنت ودوزخ تو ہر ایک کے مشاہدہ کی چیزیں ہیں انسے بھلا کون کافر مشرک یا دہریہ بھی انکار کر سکتا ہے؟

یہ ہے ایمان بالغیب کا پانچواں جز۔ اب دیکھ لیجیے کہ اس جز پر بھی طلوع اسلام کا ایمان کس طرح کا ہے؟

۶۔ تقدیر پر ایمان بالغیب

تقدیر پر ایمان' ایمان بالغیب کا چھٹا جزو ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو کوئی تکلیف یا راحت پہنچتی ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب اس جزو ایمان کو تسلیم نہیں [1] فرماتے اور کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلامی عقیدہ نہیں بلکہ اسے مجوسیوں نے اسلام میں داخل کیا تھا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

تقدیر کا عقیدہ مجوسیوں کا ہے : "اس طرح جب ایک دفعہ فرقہ بندی ہوگئی تو پھر اس کے بعد چل سو چل مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انہوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں کا جزو ایمان بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے ایمان میں وَالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تعالیٰ کا چھٹا جزو انہی کا داخل کیا ہوا ہے۔" (قرآنی فیصلے ص۱۹۰)

---

[1] پرویز صاحب ایمان بالغیب کے پانچ اجزاء پر جیسا ایمان لاتے ہیں وہ تو آپ دیکھ چکے۔ اب اگر وہ اس چھٹے جزو پر ایمان نہ لائیں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مسئلہ تقدیر پر مفصل بحث پہلے حصہ میں گزر چکی ہے۔ لہٰذا ہم سردست صرف اتنا ہی بتائیں گے کہ آیا یہ تقدیر کا عقیدہ مجوسیوں نے اسلام اور مسلمانوں میں داخل کیا تھا۔ یا قرآن نے خود بیان کیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ ﴾ (النساء ٤/ ٧٨)

"اور اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اگر انہیں کوئی گزند پہنچتا ہے تو (اے محمد آپ سے) کہتے ہیں تو یہ تکلیف تمہاری وجہ سے پہنچی ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ قوم کیسی بدھو ہے جو اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتی کہ خیر اور شر سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب بتایئے کہ یہ عقیدہ قرآن کا ہے یا مجوسیوں کا؟ اگر مجوسیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا اور قرآن نے بھی اس کی تائید کر دی تو کیا اس عقیدہ کو محض اس بناء پر تسلیم نہ کرنا درست ہو گا کہ یہ عقیدہ چونکہ مجوسیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں قرآن کی بھی یہ بات منظور نہیں؟

پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں "قل کل من عنداللہ" کا مفہوم یہ بتایا ہے۔

"انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔ اچھے کا اچھا برے کا برا لہٰذا اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ کل من عنداللہ (سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔)"
(مفہوم القرآن، جلد: ۱، صفحہ: ۲۰۴)

گویا ایک اعتبار سے پرویز صاحب نے جب خود بھی خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی تسلیم کر لیا ہے۔ تو پھر یہ عقیدہ مجوسیوں کی طرف سے کیسے اسلام میں داخل ہوا تھا؟ پرویز صاحب نے اللہ کی جگہ خدا کا قانون مکافات رکھ کر بات وہی بیان کر دی جو دوسرے مسلمان کہتے ہیں رہا ان کا یہ "ایک اعتبار" کا مسئلہ تو وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے قانون بنا دیئے ہیں جن کے تحت کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اب خدا خود بھی ان قوانین کا پابند ہو گیا ہے۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور نہ کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے خود ساختہ قوانین کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور ہے ان حضرات کے نزدیک معجزات سے انکار کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان قوانین فطرت میں کسی طرح کے استثناء کے قائل نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بے بسی: اب پرویز صاحب کا طرز استدلال ملاحظہ فرمایئے۔ ﴿ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۲:۲۰) کا مفہوم بیان فرماتے ہیں کہ:

"ہم نے ہر بات کے لیے اندازے اور پیمانے مقرر کر دیئے اور قوانین و ضوابط ٹھہرا دیئے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کائنات کی کوئی شے ان پیمانوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔" (مفہوم القرآن' ص:۷' ج:۱)

اب دیکھئے کہ اس آیت کا سیدھا سادا ترجمہ تو یہ ہے کہ "بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مگر پرویز صاحب نے چھ الفاظ کی آیت کا جو اتنا لمبا چوڑا مفہوم پیش فرمایا ہے اس میں کئی ایک مغالطے ہیں۔ مثلاً:

① "ہم نے ہر بات کے لیے اندازے اور پیمانے مقرر کر دیئے" قطع نظر اس بات کے کہ یہاں پرویز صاحب نے اللہ کا نام لینا گوارا نہیں کیا۔ اور اسکے بجائے لفظ "ہم" درج فرما دیا ہے" یہ ترجمہ یا مفہوم ﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ (۶۵:۳) کا تو ہو سکتا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ کا نہیں ہو سکتا۔ وہ حضرات جو عربی زبان سے کچھ تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ علی اور ل کے اس فرق کو بخوبی جانتے ہیں۔ اور ایک مفسر قرآن کو تو ضرور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

② اور قوانین وضوابط ٹھہرا دیئے ہیں کائنات کی کوئی شے ان سے باہر نہیں جا سکتی" یہ سب کچھ پرویز صاحب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔

③ "اور ان پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے" "ہمارا" کا مسئلہ چھوڑ دیجیے تو یہ آیت مذکورہ کا ترجمہ کہلا سکتا ہے۔ مگر اس میں آپ نے اشتباہ یہ پیدا کر دیا کہ آیا یہ کنٹرول قوانین وضوابط اور اندازوں اور پیمانوں پر ہے یا اشیاء پر؟ آیت مذکورہ میں یہ وضاحت ہے کہ یہ کنٹرول اشیاء پر ہے نہ کہ قوانین و ضوابط اور اندازوں اور پیمانوں پر۔ کیونکہ قَدَرَ عَلٰی کے ساتھ اشیاء کا ذکر ہے۔ پیمانوں کا نہیں۔

گویا جو آیت اللہ کے جملہ اشیائے کائنات پر کنٹرول اور اللہ کو قادر مطلق ثابت کر رہی تھی اسی آیت سے آپ نے بے جا اضافے کر کے اللہ تعالیٰ کو اپنے وضع کردہ قوانین کا پابند ثابت کر دکھایا ہے۔ اسے کہتے ہیں لفظی بازی گری اور صحیح معنوں میں قرآنی آیات کی تحریف معنوی۔ اب بتایئے کہ اگر پرویز صاحب جیسے مفسر قرآن موجود ہوں تو پھر اگر قرآن کے الفاظ کی حفاظت برقرار بھی رہے تو ایسی حفاظت کا فائدہ کیا ہے؟

آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے بسی: آخرت یعنی حیات بعد الممات میں اللہ تعالیٰ کا تمام انسانوں سے حساب کتاب لینا اور باز پرس کرنا مسلمانوں کا ایسا مسلمہ عقیدہ ہے جس پر قرآن کی بے شمار آیات شاہد ہیں۔ لیکن پرویز صاحب اس دن کے حساب وکتاب اور باز پرس کو بھی قانون مکافات کے حوالے کر کے اللہ تعالیٰ کو ایک ڈمی ثابت فرما رہے ہیں لکھتے ہیں کہ۔

"نتائج تو خدا کے قانون کے مطابق ہی مرتب ہوں گے۔ اسی کا نام "بازپرس" ہے۔ چنانچہ اسی گروہ (سرمایہ دار اور زمیندار۔ مولف) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (۳۷:۲۴) یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہمارا قانون مکافات ان سے پوچھے گا یہ اس کے احاطے سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹:۵۴) (ن۔ ر ص ۲۸۳-۲۸۴)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

غفور رحیم: اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس دنیا اور آخرت میں بھی اپنے قانون مکافات کے سامنے ایسا ہی بے بس ہے تو اس کے غفور رحیم ہونے کا کیا مطلب ہے یہ مطلب بھی پرویز صاحب کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۷۳)

پھر اگر تمہیں کھانے کو کچھ نہ ملے تو تم (جان بچانے کے لیے) ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو۔ ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہوں گے' قانون کے احترام کا محکم احساس تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری صلاحیتوں [1] کی نشوونما بدستور ہوتی رہے گی۔

اب دیکھئے اس آیت میں پرویز صاحب نے "قانون کے احترام کے محکم احساس" کا جو سہارا لیا ہے۔ تو کیا ایسا احساس قانون مکافات کا توڑ ثابت ہو سکتا ہے؟ آپ قانون کی قوت کی مثال سنکھیا کے اثر سے دیا کرتے ہیں یا پانی کے نشیب کی طرف بہنے سے۔ اب دیکھئے ایک انسان یہ محکم احساس رکھتا ہے کہ سنکھیا ہلاک کر ڈالتا ہے۔ لیکن کوئی دوسرا شخص اسے کھانے میں ڈال کر کھلا دیتا ہے تو کیا کھانے والے کا قانون کے احترام کا محکم احساس اسے ہلاکت سے بچا لے گا؟ اسی طرح اگر کوئی آدمی یہ خوب جانتا ہے کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے لیکن وہ سیلاب کے بہاؤ کی زد میں آچکا ہے تو کیا قانون کے احترام کا محکم احساس اسے ہلاکت سے بچا لے گا؟ بہرحال اس آیت کے مفہوم میں پرویز صاحب کو مکافات کے قانون میں "قانون کے احترام کے محکم احساس" کا استثناء پیش کرنے کی ضرورت پیش آہی گئی۔

دیگر صفات خداوندی: پھر ان حضرات نے جس طرح اللہ تعالیٰ کو بخشنے اور رحم کرنے کی صفات سے عاری قرار دیا۔ اسی طرح اس کے ناراض یا کسی سے خوش اور راضی ہونے کو بھی تسلیم نہیں فرماتے۔ اور ان صفات کو بھی خدا کے قانون کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ یہ بے جان قوانین ہی راضی اور ناراض ہوا کرتے ہیں مثلاً۔

---

[1] رحیم کے متعلق پرویز صاحب کی تحقیقات جلیلہ یہ ہیں کہ اس کا مادہ چونکہ رحم ہے۔ لہٰذا رحیم کے معنی ہیں کہ ایسا قالب عطا کرنے والا جس میں نشوونما ہو سکے۔ جیسے جنین کی رحم مادر میں نشوونما ہوتی ہے۔ اب دیکھئے اس لحاظ سے صرف اللہ ہی رحیم ہو سکتا ہے حالانکہ مسلمان بھی آپس میں رحماء بینھم تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

﴿ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٣﴾ ﴾ (النساء ٤/ ٩٣) قانون خداوندی کی نگاہوں میں وہ معتوب ہوگا۔ اسے حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے گا اور سخت قسم کی سزا دی جائے گی۔" (مفہوم القرآن ج ا ص ۲۰۹)۔

دیکھا آپ نے ترجمہ کے بجائے مفہوم بیان کرنے کے کتنے فائدے ہیں۔ نہ معروف اور مجہول میں تمیز کرنے کی ضرورت نہ فاعل اور مفعول کی' اس آیت میں اللہ کے کسی پر ناراض ہونے کا مفہوم ہے۔ کسی کا قانون خداوندی میں معتوب ہونا' کسی پر اللہ کی لعنت کرنے کا مفہوم ہے۔ کسی کا حقوق شہریت سے محروم ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کا کسی کے لیے عذاب تیار کرنے کا مطلب ہے کسی کو سخت قسم کی سزا دیا جانا۔ یہ حقوق شہریت کہاں سے ٹپک پڑے اور یہ سزا دینے والے کون ہوں گے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں مفہوم بیان ہو رہا ہے کوئی معنی تھوڑے ہیں۔

(۲) سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۵:۸۰) "خدا کے قانون سے سرکشی برتنے کا نتیجہ اور کیا ہوگا۔ کہ ذلت اور خواری کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ (ایضاً ص ۲۶۷)۔

(۳) رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۵:۱۱۹) انہوں نے اپنے آپ کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ رکھا تو خدا کے قانون مکافات نے ثمرات وبرکات سے ہمکنار کر دیا۔" (ایضاً ص ۲۸۳)

اب دیکھئے ان تمام "مفاہیم" میں اللہ تعالیٰ ایک مختار اور صاحب صفات ہستی تو درکنار ایک زندہ ہستی بھی نظر آتی ہے؟ یہ ہے طلوع اسلام کا "ایمان باللہ" جسے وہ فی الواقع ایمان کا جزو سمجھتے ہیں۔

انسان کا اختیار اور مکافات عمل: طلوع اسلام اور اس کے اسلاف جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کو محض لاشئے بنا دیتے ہیں۔ تو دوسری طرف انسان کو مختار مطلق سمجھتے ہیں۔ یہی تقدیر کے متعلق ان حضرات کا عقیدہ ہے۔ جس کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ سردست صرف ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون مکافات کا معنی ہے "کسی عمل کا پورا پورا بدلہ" اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ۔

① ہر انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے محنت کی۔ دوسرے کی محنت اس کے کام نہیں آسکتی۔

② جو کچھ وہ کرے گا اور جتنا کرے گا۔ اسے اتنا ہی بدلہ ملے گا۔ اور ضرور ملے گا۔ کوئی کمی وبیشی نہ ہوگی۔ اور یہ قانون مکافات جیسے آخرت کے لیے ہے۔ ویسے ہی اس دنیا میں بھی نافذ ہے اب سوال یہ ہے کہ ایک کسان بڑا عمدہ بیج بالکل درست موسم میں اور بڑی زرخیز زمین میں بوتا ہے۔ اس کی رکھوالی بھی خوب کرتا ہے۔ پانی بھی بروقت دیتا رہتا ہے تاآنکہ اس کی فصل پکنے کے قریب ہو جاتی ہے۔ لیکن عین اس موقعہ پر یہ فصل کسی ارضی یا سماوی آفت سے تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔ اور ایسی صورتیں اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ اب بتایئے کہ اس کسان کو اپنی محنت کا کیا ثمرہ ملا؟ کیا خدا کا قانون مکافات عمل یہی ہے کہ کسی کے خون پسینے کی محنت کو یوں تباہ وبرباد کر کے رکھ دے؟ پھر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان خود کچھ محنت نہیں کرتا۔ لیکن دوسروں کی محنت کا ثمرہ اسے مل جاتا ہے۔ جیسا کہ طلوع اسلام نے خود ایک پمفلٹ شائع

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے" اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا خدا کا قانون مکافات عمل یہی ہے کہ کسی کی محنت کا ثمرہ کسی دوسرے یا دوسروں کے حوالے کر دے؟ طلوع اسلام اگر قلب سلیم اور عقل صحیح سے ان مثالوں پر غور کرے تو تقدیر کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو قانون الٰہی اس دنیا میں جاری وساری ہے۔ وہی قانون حیات بعد الممات میں بھی نافذ العمل ہو گا۔

مسئلہ تقدیر کا اصل حل: اس مسئلہ کا درست حل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حی وقیوم اور صاحب اختیار ہستی تسلیم کیا جائے۔ قانون مکافات واقعی صحیح' درست اور قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن ہی سے اس قانون میں استثنائی صورتیں بھی ثابت ہیں۔ اور یہی صورتیں اللہ تعالیٰ کو علی کل شئی قدیر بھی ثابت کرتی ہیں۔ اس سے انسان کو یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خیر وشر یا رنج وراحت سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اعمال کے نتائج کبھی کبھی مکافات عمل کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے الگ قوانین ہوتے ہیں اور یہ قوانین انسان کی عقل سے ماوراء ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب : دوم

طلوع اسلام اور ارکانِ اسلام

اس موضوع پر ہم پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر مجملاً ہی ذکر کیا جائے گا۔

اسلام اور کفر: اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے برضا و رغبت سر تسلیم خم کرنے اور ان احکام کی درست بجا آوری کا نام اسلام ہے۔ لیکن پرویز صاحب کے نزدیک چونکہ ان کے خود ساختہ نظام ربوبیت کو درست ثابت کرنا ہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی مہم ہے لہٰذا ان کے ہاں اسلام کی تعریف بھی بدل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"اسلام کے معنی ہیں اس نظام کا قیام جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے یعنی نظام ربوبیت کی تکمیل۔" (ن۔ ر ص ۱۴)

اب جب اسلام کی تعریف ہی بدل گئی تو لامحالہ کفر کی تعریف بھی بدل جائے گی۔ چنانچہ ان کے نزدیک کافر وہ لوگ ہیں جو نظام ربوبیت کو تسلیم نہ کریں۔ فرماتے ہیں۔

کافر کون ہیں؟:

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ﴾ (الکہف ۱۸/ ۱۰۵)

"یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون ربوبیت سے انکار کرتے اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں۔ سو ان کے پروگرام بظاہر بڑے خوش آئند نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے ٹھوس نتائج کبھی بھی مرغوب نہیں ہو سکتے۔ قیام انسانیت کے پروگرام میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔"

اسلام اور کفر کی تعریفات معلوم کرنے کے بعد اب ارکان اسلام کی طرف توجہ فرمایئے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ارکان اسلام

ارکان اسلام پانچ ہیں (۱) توحید (۲) صلوٰۃ (۳) زکوٰۃ (۴) صوم یا روزہ اور (۵) حج۔ ان ارکان کو عموماً عبادات بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔ توحید: توحید کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات اور حکم یا قانون میں کسی دوسرے کو شریک نہ سمجھا جائے۔ توحید کا تعلق عقیدہ سے بھی ہے اور اعمال سے بھی۔ لہٰذا توحید کا شمار ایمان بالغیب میں بھی اولین حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اقرار ارکان اسلام میں بھی پہلا جزء ہے لیکن پرویزی توحید کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ عقیدہ اور نظریاتی لحاظ سے بھی توحید کی کئی تعریفیں ہیں۔ مثلاً۔

1. سب انسان صفات خداوندی کا مظہر اور ایک جیسا ہی نمونہ ہیں۔ یہ نمونوں کی وحدت ہی توحید ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے طلوع اسلام کا ایمان بالغیب)
2. جس خدا کے ہاتھ میں معاشی نظام انسانیت کا قانون ہے اسی کے ہاتھ میں کائناتی نظام ہے یہ قانون کی وحدت ہی توحید ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے ایمان بالغیب)۔
3. جس طرح تمام عالم آفاق میں ایک ہی قانون جاری وساری ہے۔ اسی طرح تمام عالم انسانیت میں بھی ایک ہی قانون کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔ اسی کا نام توحید ہے۔" (قرآنی فیصلے ص۲۹۶)۔

۲۔ صلوٰۃ یا نماز: آپ صلوٰۃ کو نماز کہنے سے گریز فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ مجوسیوں کا ہے۔ آپ نماز کی بجائے قیام صلوٰۃ کی اصطلاح تجویز فرمایا کرتے ہیں۔ اس اصطلاح سے آپ کی مراد وہ اجتماعات موقتہ ہیں جو نظام ربوبیت کی یاد میں بپا کیے جاتے ہیں۔ یہ کتنے عرصہ بعد ہونے چاہئیں یا دن میں کتنی بار ہوں۔ یہ بات آپ نہیں بتایا کرتے۔ نیز فرماتے ہیں کہ نماز میں قیام رکوع' سجود اس لیے کیے جاتے ہیں کہ ان اجتماعات کرنے والوں کے سینوں میں جذبات کا تلاطم اٹھ رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو اظہار جذبات کے طور پر ایسے ایسے کام کرنا پڑتے ہیں۔ آپ نے مختلف مقامات پر صلوٰۃ کی جو مختلف تعریفات پیش فرمائی ہیں۔ ان کی تفصیل ہم "قرآنی نماز" میں پیش کر چکے ہیں۔

آپ زبانی طور پر تو اقرار فرماتے ہیں کہ میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھا کرتا ہوں۔ لیکن عملاً آپ اپنی جماعت سمیت نماز کی ادائیگی کو نہ ضروری سمجھتے ہیں نہ ہی بجالاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آخر نظام ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے ہر روز کئی کئی بار یاد دہانی ویسے بھی فضول سی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ پھر جب نظام ربوبیت ابھی قائم ہی نہیں ہوا تو پھر ایسے اجتماعات کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے۔ لہٰذا عملاً آپ اور آپ کی جماعت اس رکن اسلام سے بھی سبکدوش ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مضمون قرآنی نماز حصہ سوم)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

۲۔ ایتائے زکوٰۃ: زکوٰۃ کے متعلق آپ کے نظریات تین ہیں۔

① ایک اسلامی حکومت جو کچھ بھی مسلمانوں سے حسب ضرورت لے وہ زکوٰۃ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی وضاحت فرماتے ہیں کہ ہماری موجودہ حکومت اسلامی نہیں۔ لہٰذا زکوٰۃ باقی نہیں رہتی۔

② لوگ اپنا زائد از ضرورت سارا مال اسلامی حکومت کے حوالہ کر دیں۔ یہ بات بھی آپ کو کچھ اچھی نہیں لگتی۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ انفرادی ملکیت ثابت ہونے لگتی ہے۔

③ ایتائے زکوٰۃ کی تیسری تعریف یہ ہے کہ اسلامی حکومت لوگوں سے ہر قسم کی املاک لے کر انہیں انفرادی ملکیت سے محروم کر دے پھر وہ حکومت جو کچھ لوگوں کو ضروریات زندگی کے لیے دے گی وہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یہ بات آپ کو سب سے زیادہ بھلی لگتی ہے۔ کیونکہ اس سے آپ کے نظام ربوبیت کو سہارا ملتا ہے۔

یہ تو سب تعریفیں یا نظریات تھے۔ اب عملی میدان کی طرف آیئے۔ آج اسلامی حکومت نہیں لہٰذا زکوٰۃ بھی نہیں۔ پھر آج کل نظام ربوبیت بھی نہیں ایتائے زکوٰۃ بھی ممکن نہیں۔ گویا آپ اور آپ کی جماعت بہرحال اسلام کے تیسرے رکن زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی سبکدوش ہیں۔ اس لیے جب ضیاء الحق کے دور میں حکومت نے زکوٰۃ آرڈی نینس نافذ کیا تو آپ نے زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کے لیے جماعتی سطح پر تحریک چلائی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مضمون۔ قرآنی زکوٰۃ حصہ سوم)

۴۔ صوم یا روزہ: روزہ کے متعلق آپ کے لٹریچر سے بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ یا شائد کسی مستفسر نے روزہ کے متعلق کوئی سوال ہی نہ کیا ہو۔ یا آپ نے از خود کوئی سوال بنا کر جواب دینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔ لہٰذا روزہ کی تعریف اور اس سے متعلق جماعت کے عمل کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ جس طرح دوسرے ارکان اسلام سے آپ مختلف شرائط کی پابندی لگا کر سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ روزہ جیسے تکلیف دہ کام سے سبکدوشی حاصل کرنا آپ کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ ہمارے اس خیال کی تائید آپ کے ایک اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے۔ آپ جب نظام ربوبیت کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں تو لین دین قرضہ' میراث وغیرہ کے تمام احکام کو عبوری دور کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

"اگر غلامی ختم ہو جائے اور معاشرہ میں مسکینوں کا وجود بھی نہ رہے تو اس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس (قسم) کے بدلے میں کفارہ کیا ادا کرنا چاہیئے۔" (ن۔ ر ص۲۲۹)

اب دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارہ کی ایک تیسری صورت تین روزے رکھنا بھی بتائی ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ فَكَفَّارَتُهُۥٓ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَٰكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ ... "تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے۔ جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ (المائدہ ۵/ ۸۹) کپڑے دینا۔ یا ایک غلام آزاد کرنا اور جس کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین روزے رکھے۔"

اور روزے ہر صورت میں رکھے جا سکتے ہیں خواہ پرویز صاحب کا نظام ربوبیت قائم ہو یا نہ ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ کا مقررہ کردہ یہ کفارہ پسند نہیں آیا۔ اور آپ "مزید فیصلہ" اپنے مزعومہ "اسلامی نظام" کے سپرد فرما رہے ہیں۔

البتہ صدقہ فطر کا آپ نے صدقات وخیرات کے ضمن میں ذکر فرمایا۔ لہٰذا اس کا جواب بھی "قرآنی زکوٰۃ" کے ضمن میں ہم نے دے دیا ہے۔

۵۔ حج: قرآنی فیصلے میں ضمناً حج کا ذکر دو مقامات پر ملتا ہے۔ قربانی کے عنوان کے تحت یہ درج ہے کہ قربانی صرف حاجیوں کے لیے ضروری ہے۔ مقامی حضرات کے لیے ضروری نہیں کیونکہ اس سے قوم کی کثیر دولت ضائع ہو جاتی ہے۔ اور حج کے موقعہ پر قربانی اس لیے کی جاتی ہے کہ مختلف ممالک سے تشریف لائے ہوئے حجاج آپس میں قربانی کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی ضیافت کیا کریں ان افکار کا جائزہ ہم نے قربانی کے تحت پیش کر دیا ہے۔

دوسرا عنوان ملی تقاریب کا عنوان ہے۔ جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ احرام' طواف اور سعی وغیرہ جذبات کی تسکین کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ نماز کے دوران بھی رکوع وسجود وغیرہ کیے جاتے ہیں۔ رہا مناسک حج کو ایک دینی فریضہ' رکن اسلام اور خدا کی عبادت سمجھ کر بجالانے کا مسئلہ تو اس کا نہ یہاں ذکر ہے نہ وہاں"

کعبہ کی اہمیت: مسلمانوں کی وحدت واتحاد کا مرکز محسوس بیت اللہ یا کعبہ ہے جو مسلمانوں کا قبلہ بھی ہے۔ نماز میں منہ بھی اسی طرف کیا جاتا ہے' اور حج کا فریضہ بھی اسی مقام پر ادا ہوتا ہے۔ اس کعبہ کے متعلق پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ:

"مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد حرم کی پاسبانی ہے۔ سیاسی معاہدات نہیں واضح رہے کہ حرم کعبہ سے مراد [1] سعودی عرب کا دارالسلطنت نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے۔ جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔" (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۱ء)

یعنی جہاں سے بھی قرآنی قوانین نافذ ہوں گے وہ حرم کعبہ ہے اور یہ قرآنی قوانین وہ ہیں جن کی داغ بیل پرویز صاحب کی کوٹھی سے ڈالی جا رہی ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ مکہ نہ دور نبوی ﷺ میں دارالسلطنت تھا نہ خلافت راشدہ میں اور نہ ہی آج سعودی عرب کا دارالسلطنت ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

یہ تو حج کے متعلق طلوع اسلام کے نظریات اور زبانی دعوے ہیں۔ اب عملی میدان کی طرف آیئے خود پرویز صاحب ۸۲ سال کی عمر تک بقید حیات رہے لیکن حج کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ ہمارے لیے یہ تصور محال ہے کہ جو شخص کم از کم ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۵ء تک یعنی ۲۷ سال لاہور کی گلبرگ جیسی گراں ترین آبادی میں اپنی کوٹھی میں قیام پذیر رہا ہو وہ حج کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔

آپ نے ۱۹۸۲ء میں سفر حجاز کیا بھی تو قرآنی احباب کے مجبور کرنے پر۔ پھر اس سفر کا مقصد بھی حج نہیں۔ بلکہ مدینہ منورہ اور دیگر مقامات مقدسہ کی سیر اور تفریح طبع تھا۔ آپ وہاں سے بھی دل گرفتہ ہو کر واپس تشریف لائے۔ آپ کو سب سے زیادہ کوفت جس بات سے ہوئی وہ یہ تھی کہ نہ شہدائے احد کے مزارات وہاں موجود ہیں نہ ان کی تختیاں' جنت البقیع میں بھی ایسی ہی صورت حال ہے کہ وہاں بھی باہر لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے اور اندر ویران پتھر سے ہی نظر آتے ہیں۔ شہدائے احد اور دوسرے صحابہ کرام کے مزارات کے نشان تک معدوم کر دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ زندہ قوموں کے شعار ایسے نہیں ہوتے۔ سو یہ ہے اس پرویزی جماعت کی عملی زندگی جس میں نہ پنج وقتہ نماز ادا کرنے کی ضرورت نہ زکوٰۃ دینے کی نہ روزہ کی اور نہ حج کی۔ بایں ہمہ دعویٰ یہ ہے کہ صحیح قرآنی فکر کی حامل یہی جماعت ہے جو صرف مسلمانوں کو نہیں تمام بنی نوع انسان کو وحی الٰہی کی روشنی میں ہدایت کا راستہ دکھانے اور اسلامی انقلاب لانے کا عزم رکھتی ہے۔

ارکان اسلام سے چھٹی: اب یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام کے "اسلام" اور دوسرے عامۃ المسلمین کے اسلام میں کوئی قدر مشترک ہے؟ ایمانیات وعقائد کا جائزہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ ارکان کی یہ صورت ہے کہ توحید عقیدتاً آپ کی مسلمانوں سے الگ اور عملاً اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ نماز کی ضرورت اس لیے نہیں کہ ابھی مرکز ملت نے اس کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ آپ زبانی طور پر یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان جس طرح عبادات بجا لا رہے ہیں۔ اس عبوری دور میں ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ چیز فرقہ بندی کی بنیاد بنتی ہے۔ لیکن عملاً آپ بھرپور اعتراضات بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی موجودہ نماز کو بے کار عمل بھی سمجھتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائیگی سے طلوع اسلام بہر صورت مستثنیٰ ہی ہے۔ خواہ "نظام ربوبیت" قائم ہو یا نہ ہو۔ روزے ان حضرات پر گراں بار ہیں۔ لہٰذا ان کا بدل آپ مرکز ملت کے آئندہ فیصلے سے ڈھونڈتے ہیں۔ حج کی اہمیت یہ ہے کہ خود پرویز صاحب کو تازیست یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ ویسے وہ بھی کعبہ اس مقام کو سمجھتے ہیں جہاں مرکز ملت قیام پذیر ہو۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرما لیجیے کہ طلوع اسلام کا اسلام ہے کیا چیز؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے دعوی کے لحاظ سے حقیقی اسلام ان حضرات کے پاس ہی ہے۔

ارکان اسلام سے بیزاری کا تحریری ثبوت یہ ہے کہ آپ طلوع اسلام کے لٹریچر میں اکثر یہ فقرہ لکھا ہوا دیکھیں گے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلام دین نہ رہا۔ بلکہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی دین صرف پوجا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پاٹ کا نام رہ گیا۔ جو کہ دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ پوجا پاٹ سے بیزاری دراصل طلوع اسلام کی نماز' روزہ وغیرہ ارکان اسلام سے بیزاری کا ہی اظہار ہے۔ پھر طلوع اسلام کا یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ اسلام صرف ارکان اسلام (جسے وہ مذہب کا نام دیتا ہے) ہی کا نام ہے۔ کیونکہ اسلام تو عقائد (ایمان بالغیب کے جملہ اجزاء) ارکان اسلام (عبادات) معاملات' مناکحات او عقوبات کے اس مجموعہ کا نام ہے جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ پھر ان تمام احکامات پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل پیرا ہونے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش (جہاد) کر کے ان احکامات کو نظام کی شکل دینے اور عملاً نافذ کرنے کا نام دین اسلام ہے۔ یہی وہ دین اسلام ہے جو تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد تھا اور یہ دین حضرت آدم سے لے کر آج تک ایک ہی رہا ہے۔

طلوع اسلام کا دین اسلام : اب طلوع اسلام نے ارکان اسلام کو تو مذہب یا انفرادی پوجا پاٹ کا نام دے کر ان سے گلو خلاصی کرالی۔ حالانکہ یہ تمام ارکان صرف انفرادی ہی نہیں بلکہ اجتماعی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں اور اسلام کے باقی امور سے یوں انحراف کیا کہ دین کی تعریف ہی بدل ڈالی۔ اس کے نزدیک دین کی تعریف یہ ہے:

"قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے۔" (ن۔ ر ص۱۱۵)

ہم حیران ہیں کہ جب ربوبیت کا لفظ ہی قرآن میں موجود نہیں تو یہ الفاظ واضح کیسے ہوئے؟ پھر جب تک آپ کا مزعومہ نظام ربوبیت قائم نہ ہو اس وقت تک اسلام کے باقی اجزاء سے بھی چھٹی مل گئی۔ اب دین کا ایک دوسرا مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے:

"دین نام ہی قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔" (لغات القرآن زیر عنوان قدر)

یہ قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار تعداد میں کتنی ہیں۔ اور کون کون سی ہیں اور ان کے تحفظ کا طریقہ کیا ہے؟ یہ آپ نہیں بتایا کرتے۔ ہم جب ارکان اسلام کا نام لیتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ کہ یہ ارکان پانچ ہیں اور ان کے تحفظ کا طریقہ یہ ہے لیکن اگر پرویز صاحب نہ مستقل اقدار کی تعداد بتائیں جو قرآن میں مذکور ہیں اور نہ ان کے تحفظ کا طریقہ۔ تو دین قائم کیسے ہوگا؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: سوم

وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرنے کا طریق

(مفہوم القرآن پر ایک نظر)

طلوع اسلام اکثر اپنا مقصد و مسلک شائع کرتا رہتا ہے۔ جس کی پہلی شق یہ ہے کہ "تنہا عقل زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اس کو اپنی رہنمائی کے لیے وحی کی اسی طرح ضرورت ہے۔ جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت"

اب سوال یہ ہے کہ وحی الٰہی کے اس سورج سے عقل کی آنکھ روشنی کس طرح حاصل کرے؟ اس کا طریق آپ نے یہ اختیار کیا۔ کہ وحی الٰہی جو عربی زبان میں ہے۔ اس کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ مفہوم بیان کیا جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اپنے اس دعویٰ پر امام ابن قتیبہ کی کتاب قرطین (ج:۲، ص:۱۶۳) سے تین مثالیں بھی پیش فرمائی ہیں۔ جو یہ ہیں۔

﴿ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾ ﴾ (الأنفال۸/ ۵۸)

"اور اگر آپ ﷺ کو (معاہدہ کے بعد) اس قوم سے خیانت (عہد شکنی) کا ڈر ہو تو ان کا عہد انہیں کی طرف پھینک دو (اور برابر کا جواب دو)۔"

﴿ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ﴾ (الکہف۱۸/ ۱۱)

پھر ہم نے ان اصحاب کہف کو کئی سال تک غار میں سلائے رکھا۔

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ ﴾ (الفرقان۲۵/ ۷۳)

اور وہ لوگ کہ جب انہیں اپنے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو اندھے بہرے نہیں بن جاتے بلکہ غور و فکر سے سنتے ہیں۔

---

[1] لطف کی بات یہ ہے کہ اس مقام پر تو پرویز صاحب اس آیت کو ان آیات میں شمار کرتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مقام حدیث ص ۴ پر اسی آیت کا لفظی ترجمہ کر کے وحی الٰہی میں عقل کی مداخلت کا جواز مہیا فرما رہے ہیں۔ جس کی تفصیل ہم نے مناسب مقام پر دے دی ہے۔ ص 65

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب دیکھئے کہ مندرجہ بالا تینوں آیات جو پرویز صاحب نے امام مذکور کے حوالہ سے درج فرمائی ہیں۔ یہ تینوں محاورے ہیں۔ اور جب یہ آیات نازل ہوئیں تو صحابہ ان کا مطلب بخوبی سمجھ گئے تھے اور کسی صحابی نے بھی حضور اکرم ﷺ سے ان کے متعلق استفسار نہیں کیا۔ رہی ترجمہ کی بات تو کسی بھی زبان کے محاورہ کا دوسری زبان میں لفظی ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ مفہوم ہی بتایا جاتا ہے۔ "میرا سر چکر کھا رہا ہے" کا ترجمہ انگریزی میں (My Head is eating circle) سے نہیں کیا جاتا بلکہ (I am feeling giddy) سے کیا جائے گا۔

ہر زبان کی وسعت کے مقابلہ میں محاورات کی تعداد قلیل ہوا کرتی ہے۔ [1] محاورات کی موجودگی کی وجہ سے نہ تو یہ لازم آتا ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ہی چھوڑ دیا جائے اور نہ یہ کہ تمام تر زبان کو محاورات ہی کا مجموعہ تصور کر کے ہر ایک لفظ اور فقرے کا ایسا نرالا مفہوم بیان کر دیا جائے کہ اہل زبان بھی دیکھیں تو سر پیٹ کے رہ جائیں۔

اور چوتھی مثال جو آپ نے مشہور مستشرق گب کے حوالے سے پیش فرمائی ہے وہ قرآن کی فصاحت وبلاغت سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ ہے۔

﴿ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِۦ وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا ٱلْمَصِيرُ ﴿٤٣﴾ ﴾ (ق ۵۰/ ۴۳) "بلاشبہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے۔"

یہ آیت درج کرنے کے بعد مستشرق موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اور انگریزی میں ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے اس کے چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" (We) کی تکرار ہے اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی۔ (مقدمہ مفہوم القرآن' ص د)

مانا کہ قرآن کی زبان کی فصاحت بلاغت کا مقابلہ نہ عربی زبان کے دوسرے الفاظ سے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دوسری زبان سے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنا ایک اہم دینی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن تو عرب وعجم کے لیے واجب التعمیل ہے۔ لہٰذا اس کی یہ اعجازی حیثیت ترجمہ میں کیونکر حائل ہو سکتی ہے۔

پرویز صاحب نے مندرجہ بالا چار مثالیں پیش کر کے سارے قرآن کا مفہوم ہی بیان فرمانے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ پھر اس جواز کے حق کو جس آزادی کے ساتھ آپ نے استعمال فرمایا ہے وہ بھی قابل داد ہے۔ آپ اس مفہوم کی ادائیگی میں نہ ضمائر کا خیال رکھتے ہیں' نہ صیغوں کا اور نہ معروف ومجہول کا آیات کے مفہوم میں تقدیم وتاخیر' بعض الفاظ حتیٰ کہ جملوں کا مفہوم یا معنی گول کر جانا اور بعض مقامات پر بنیادی قسم

---

[1] قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہے۔ جب کہ قرآن میں استعمال شدہ محاوروں کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کے اضافے کر لینا ان سب باتوں کو جس وسیع پیمانہ پر آپ نے استعمال فرمایا ہے اس کے نمونے آپ کو اس باب میں مل جائیں گے۔

آپ کے اس بیان کردہ مفہوم کی مثالوں کے لیے ہم نے معجزات اور خوارق امور کا انتخاب کیا ہے اس سلسلہ میں پہلے ہم سرسید صاحب کی تاویلات کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس رابطہ سے ایک تو آپ کو فکر قرآنی کے تسلسل وارتقاء کا پتہ چل جائے گا۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ پرویز صاحب نے ترجمہ کے بجائے مفہوم بیان فرمانے کو کیوں زیادہ پسند فرمایا ہے۔

معجزات اور خرق عادت امور

اس سلسلہ میں ہم پہلے کالم میں قرآنی آیات درج کر رہے ہیں۔ اور کالم نمبر ۲ میں فتح محمد جالندھری صاحب کا ترجمہ (اس ترجمہ کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ ایک تو فتح محمد صاحب کا ترجمہ با محاورہ ہے دوسرے وہ کسی خاص مسلک سے بھی تعلق نہیں رکھتے) اور اس کے سامنے تیسرے کالم میں پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم۔ اس تقابل سے ہی آپ کو مفہوم کی بہت سی خوبیوں کا پتہ چل جائے گا۔ تاہم اگر کوئی خاص قابل ذکر بات رہ گئی تو آخر میں مختصر سا تبصرہ بھی پیش کر دیا جائے گا۔

۱۔ حضرت صالح علیہ السلام اور ناقۃ اللہ :

① قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ	اے قوم! خدا ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔	اس نے بھی اس سے یہی کہا کہ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی اطاعت کی جائے۔
② قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک معجزہ پہنچا ہے	تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح دلائل وقوانین آچکے ہیں۔
③ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً	یہی خدا کی اونٹنی تمہارے لیے معجزہ ہے	یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔
④ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ	تو اسے آزاد چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔	میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں کہ یہ چراگاہ میں پھرے۔
⑤ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ (۷:۷۳)	اور تم اسے بری نیت سے ہاتھ نہ لگانا۔	اگر تم نے اسے آزاد چرنے دیا تو یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ تم اپنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

عہد پر پابند ہو۔ (ص ۳۵۷)

اب دیکھئے مندرجہ بالا مفہوم میں آپ نے:

1 اللہ کا مفہوم قوانین خداوندی الٰہ کا مفہوم قوت اور بَیِّنَۃٌ کا مفہوم واضح دلائل وقوانین بتایا ہے۔ بینۃٌ واحد ہے۔ یعنی ایک نشانی یا ایک معجزہ۔ لیکن اس "معجزہ یا نشانی" کے ترجمہ کی خاطر اس کا مفہوم جمع کی صورت میں واضح دلائل وقوانین بتا دیا۔ تاکہ معجزہ کی بو نہ آنے پائے۔

2 آیت کے تیسرے ٹکڑے میں سے آپ ایۃٌ کا مفہوم یا ترجمہ گول کر گئے۔ اور مفہوم بتانے کے بھی تو فائدے ہیں کہ ناقۃ اللہ کسی کی بھی ملکیت نہیں رہی۔ تاہم آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اگر وہ کسی کی ملکیت بھی نہ تھی تو آکہاں سے گئی تھی؟

3 چوتھے ٹکڑے میں ذروا امر جمع حاضر کا صیغہ ہے۔ یعنی اسے تم چھوڑ دو۔ لیکن آپ مفہوم بیان فرما رہے ہیں میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں یعنی مضارع واحد متکلم میں۔

4 پانچویں ٹکڑے میں لا تمسوا نہی جمع حاضر کے صیغہ کو بلا وجہ اگر سے مشروط کر دیا ہے اب ایک دوسرے مقام سے اس ناقۃ اللہ کی بات سنئے۔

① قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ (صالح نے) کہا (دیکھو) یہ اونٹنی ہے — اس پر صالح نے کہا۔ یہ ایک اونٹنی ہے (تمہیں اس سے سروکار نہیں کہ یہ کس کی اونٹنی ہے) بس یہ ایک جانور ہے جسے اور جانوروں کی طرح بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی۔

② لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۶:۱۵۵) (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری — اسے پانی بھی چاہئے اور چارہ بھی ہم باریاں مقرر کر لیتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اونٹنی اپنی باری پر پانی پیا کرے گی اور تمہاری اونٹنیاں اپنی باری پر۔ (ص ۸۵۰)

اب دیکھئے آیت بالا میں پرویز صاحب "یوم" کا مفہوم بتانا گول کر گئے۔ اور اسے یوں بیان کر دیا کہ ہر جانور جس طرح چار پانچ منٹ میں اپنی باری پر پانی پی لیتا ہے۔ یہ بلا ملکیت اونٹنی اپنی باری پر اسی طرح پانی پیتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بلا ملکیت اونٹنی سے (جو خدا جانے کہاں سے آگئی تھی) صالح کو اس قدر کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کہ انہیں اس کے لیے اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ اس کے چارہ اور پانی پینے کی باری مقرر کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ حتیٰ کہ آپ نے قوم کے لوگوں کو حکماً کہہ دیا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ ورنہ تم پر عذاب الٰہی آئے گا۔ پھر جب اس قوم نے اس بلا ملکیت کی اونٹنی کو تکلیف

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پہنچائی تو فی الواقع ان پر عذاب آیا بھی تھا۔

۲۔ قوم لوط کی الٹائی ہوئی بستیاں :

① فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا	تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کو (الٹ کر) نیچے اوپر کر دیا	چنانچہ جب اس تباہی کا وقت آگیا تو اس بستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے گر کر پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔
② وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ (۱۱:۸۲-۸۳)	اور ان پر پتھر کی تہہ بہ تہہ (یعنی پے در پے) کنکریاں برسائیں ان پر تمہارے رب کے ہاں سے نشان کیے ہوئے تھے	بڑے بڑے کنکران پر بارش کی طرح برسنے لگے۔ پیہم اور مسلسل بارش کی طرح وہ پتھر خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر ان پر نازل ہونے شروع ہو گئے (ص ۵۱۰)

اب دیکھئے کہ:

1 آپ نے عالیھا سَا فلھا کا مفہوم یہ بیان فرمایا کہ تمام بلند وبالا عمارتیں نیچے گر کر پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر عمارتیں گریں تو ان کا اوپر کا حصہ تو پھر بھی بہرحال اوپر ہی رہے گا وہ سافلھا کیسے بن جائے گا؟

2 آپ نے مُسومۃً کا مفہوم بتایا ہے "موت کا پیغام بن کر" لیکن لغات القرآن (زیر عنوان س۔ و۔ م) میں آپ اس کے معنی خود ہی نشان زدہ بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

سَوَّمَ الْفَرسُ تَسْوِيْمًا گھوڑے پر نشان لگا دیا۔ لیکن سوَّم فلاناً کے معنی ہیں فلاں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس لیے سورہ الذاریات میں جہاں ہے کہ لِنُرسِلَ عَلَيْهِمْ حجارةً مِن طينٍ مسومةً (۵۱:۳۴) تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ پتھر خدا کے قانون مکافات کی رو سے اس مقصد کے لیے نشان زدہ (Enmarked) کر دیئے گئے تھے۔ یا یہ کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ (انہیں چلایا گیا تھا)۔

اس مقام پر بھی پرویز صاحب نے پہلا مطلب ٹھیک بیان کیا اور دوسرا غلط۔ وجہ یہ ہے پتھروں کے لیے فلاں کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ تاہم یہ مسئلہ لاینحل ہی رہا کہ مُسَوَّمَةً کا مفہوم "موت کا پیغام بن کر" کیسے متعین کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ قوم ثمود کی الٹائی گئی بستیاں:

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى (۵۳/۵۳)	اور اس نے الٹی ہوئی بستیوں کو دے پٹکا	جن اقوام نے بھی اس قسم کی روش اختیار کی "بری طرح تباہ ہو گئیں اور ان کی بستیاں ویران ہو گئیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(ص۱۳۴۶)

اب دیکھئے جہاں تک بری روش والی اقوام کے تباہ ہونے اور بستیاں ویران ہونے کا تعلق ہے وہ تو ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مُؤْتَفِكَت کا لغوی معنی کیا ہے۔ اور اھوی کا کیا؟ پرویز صاحب خود لغات القرآن ص۲۳۶ پر لکھتے ہیں کہ "الموتفکات (۹:۶۹) وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا۔" اور ص ۱۷۷۴ پر لکھتے ہیں کہ "ھوی یھوی" اوپر سے نیچے گرنا" اور ص۲۳۶ پر لکھتے ہیں کہ " وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ (۵۳/۵۳) اس نے تباہ شدہ بستیوں کو خالی کر دیا یا نیچے گرا دیا"

اب دیکھئے پرویز صاحب کا پہلا بیان کردہ معنی "الٹائی ہوئی بستیاں ہی درست ہو سکتا ہے" تباہ شدہ بستیاں" غلط ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو بستیاں پہلے ہی تباہ شدہ ہوں انہیں خالی کرنے کرانے کا مطلب کیا اور نیچے گرانے کا کیا؟ بات واضح تھی کہ فرشتوں نے ان بستیوں کو زمین سے اکھاڑ دیا اور اوپر بلندی سے الٹا کر زمین پر دے مارا تھا۔ اب اس خرق عادت کو پرویز صاحب کیسے تسلیم کر لیں؟ لہٰذا آپ لغوی معنوں سے مجبور ہو کر اگر کہیں صحیح معنی بتا بھی دیتے ہیں تو اپنے مخصوص نظریات کی بناء پر پھر بھول بھلیوں میں لے جاتے ہیں۔

۴۔ حضرت ابراہیم پر آگ کا ٹھنڈا ہونا:

① قَالُوا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○ (۶۸:۲۱)	کہنے لگے اگر تمہیں (اس سے اپنے معبودوں کا انتقام لینا اور) کچھ کرنا ہے تو اس کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو	انہوں نے عوام کو مشتعل کیا اور کہا اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو اٹھو اور اس شخص کو جس نے تمہارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے زندہ جلادو اور اس طرح اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کرو۔ (ص۱۴۱۷)
② قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (۶۹:۲۱)	ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)	وہ ابراہیم کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ کو یوں بھڑکا رہے تھے اور ہم ایسا انتظام کر رہے تھے کہ اس آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں اور وہ ابراہیم کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔ (ایضاً)

اب دیکھئے پہلی آیت میں آپ نے حَرِّقُوا کا مفہوم بتایا ہے "زندہ جلا دو" اور دوسری آیت میں نار کا مفہوم بتایا ہے "عداوت وانتقام کی آگ" اب سوال یہ ہے کہ کیا عداوت وانتقام کی آگ میں کسی کو زندہ جلایا جا سکتا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے کافروں کی عداوت وانتقام کی آگ کو حکم دیا تھا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔ اور تیسرا سوال یہ ہے کہ عداوت وانتقام کی آگ سرد تو پڑ سکتی ہے لیکن سلامتی والی کیسے بنتی ہے؟

۵۔ حضرت ابراہیم اور چار پرندے:

① وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى	اور جب ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے کہا کہ اے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔	" حضرت ابراہیم نے اللہ سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی مردہ قوم بھی از سرنو زندہ ہو جائے؟ اور اگر یہ ممکن ہے تو مجھے بتا دیجیے کہ اس کے لیے کیا طریق اختیار کیا جائے؟
② قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ	خدا نے فرمایا۔ کیا تو نے اس بات کو باور نہیں کیا۔	اللہ نے کہا پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارا اس پر ایمان ہے کہ مردہ قوم کو حیات نو مل سکتی ہے؟
③ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ	کہا کیوں نہیں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے	ابراہیم نے کہا اس پر تو میرا ایمان ہے۔ لیکن میں اس کا اطمینان چاہتا ہوں۔
④ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ	خدا نے فرمایا کہ چار پرندے پکڑ کر اپنے پاس منگوا لو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔	اللہ نے کہا تم چار پرندے لو۔ وہ شروع میں تم سے دور بھاگیں گے۔ انہیں اس طرح آہستہ آہستہ سدھاؤ کہ وہ تم سے مانوس ہو جائیں۔
⑤ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا	پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے	آخر الامر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ اگر تم انہیں الگ الگ مختلف پہاڑیوں پر چھوڑ دو اور انہیں آواز دو تو وہ اڑتے ہوئے تمہاری طرف آجائیں گے۔ بس یہی طریقہ ہے حق سے نامانوس لوگوں میں زندگی پیدا کرنے کا۔
⑥ وَاعْلَمْ	اور جان رکھو کہ	تم انہیں اپنے قریب لاؤ اور نظام خداوندی سے روشناس کراؤ۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑦ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲:۲۶۰) — خدا غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔ — یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت اور حکمت رکھتا ہے کہ اسے چھوڑ کر یہ کہیں نہ جا سکیں گے۔ (ص ۱۰۳)

اب دیکھئے کہ:

1 حضرت ابراہیم تو اللہ سے مردوں کے زندہ کرنے کی بات پوچھ رہے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب نے "مردہ قوموں" کی دوبارہ زندگی کے اسرار و رموز بیان کرنا شروع کر دیئے ہیں۔

2 مردہ قوموں کی دوبارہ زندگی کے لیے آپ نے جو ہدایات حضرت ابراہیم سے منسوب فرمائی ہیں۔ ان کی حضرت ابراہیم سے کوئی تخصیص نہیں۔ یہ تو تبلیغ کا طریقہ ہے جسے تمام انبیاء اپناتے رہے ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے اور بالخصوص حضرت ابراہیم کے دلی اطمینان کی اس میں کیا بات ہے؟

3 حق سے مانوس شدہ لوگوں کو ٹیسٹ کرنے کا یہ طریقہ بھی کیسا شاندار ہے۔ کہ پہلے نبی الگ الگ مختلف پہاڑیوں پر چھوڑ آیا کریں۔ پھر انہیں بلائیں تو وہ نبی کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آجائیں۔ کیا مردہ قوموں کی دوبارہ زندگی کا یہی طریقہ ہے؟ اور اسی طریقہ سے ہی مردہ قومیں دوبارہ زندہ ہوا کرتی ہیں؟

4 وَاعْلَمْ (تو جان لے) اور اللہ کا جو مفہوم بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ آپ خود ملاحظہ فرما لیجیے۔

۶۔ حضرت اسماعیل کی قربانی:

① قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ — جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ — جب وہ بیٹا بڑا ہوا اور ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا تو ایک دن باپ نے اس سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

② فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى — تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے — سو تم اس پر غور کر کے مجھے بتاؤ کہ تمہاری اس باب میں کیا رائے ہے۔

③ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ — انہوں نے کہا۔ ابا۔ آپ کو جو حکم ہوا ہے وہی کیجیے — بیٹے نے باپ سے کہا ابا جان۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے تو مجھے ذبح کر دیجیے۔

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ — خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیے گا۔ — آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ اس لیے کہ جب خدا ایسا چاہتا ہے تو پھر اس میں تذبذب و تامل کا کیا سوال ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

فَلَمَّآ اَسْلَمَا	جب دونوں نے حکم مان لیا	(ابراہیم اپنے خواب کے متعلق یہی سمجھے ہوئے تھا کہ خدا کا حکم ہے اس لیے وہ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گیا) چنانچہ جب باپ اور بیٹے دونوں نے (اس خواب کو خدا کا حکم سمجھ کر) اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔
وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ	اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا	اور باپ نے بیٹے کو ایک اونچی جگہ کن پٹی کے بل لٹا دیا۔
وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا	تو ہم نے ان کو پکارا اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا	تو ہم نے اس وقت اس خیال کو اس کے دل سے دور کر دیا اور اس سے کہا کہ ابراہیم' تم نے اس خواب کو حقیقت سمجھ کر اپنے بیٹے کو سچ مچ ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا۔ یہ ہمارا حکم نہیں تھا۔ یونہی تمہارا خواب تھا اس لیے ہم نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو بچالیا۔
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ	ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔	اس لیے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم انہیں اس قسم کے نقصانات سے بچا لیا کرتے ہیں۔
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ	بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔	یہ خدا کی طرف سے ایک واضح انعام تھا جو ابراہیم پر کیا گیا۔
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۱۰۷-۱۰۲:۳۷)	اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا	باقی رہا وہ بیٹا سو اسے ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے لیے بچا لیا۔ (ص ۱۰۴۴)

اب دیکھئے کہ:

www.wkrf.net (Tahafuz e Hadees Foundation)

1 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ اور بیٹا یعنی دونوں پیغمبر غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں بیٹے کو ذبح کرنے کی بات کو خدا کا حکم سمجھ لیا اور اسماعیل علیہ السلام اپنے ابا کی بات پر لگ گئے۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انا کذالک نجزی المحسنین ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو غلط فہمی کا شکار ہو جائیں اور بقول پرویز صاحب کیا ایسے غلط فہمی کا شکار ہونے والوں کو "قوانین خداوندی کے مطابق حسن کارانہ انداز میں زندگی بسر کرنے والے" کہا جا سکتا ہے۔

2 بلاءٌ مبین کا ترجمہ صریح آزمائش ہے نہ کہ "واضح انعام" اور یہ واضح انعام ایسا مفہوم ہے جس کی تائید آپ کی لغات القرآن بھی نہیں کرتی۔ لغات القرآن میں آپ بلاء اور ابتلاء کا معنی کسی کا حال معلوم کرنا یا کسی چیز کا اپنی اصلی حالت میں ظاہر کرنا۔ یا مضمر جوہروں کی محسوس شکل میں سامنے آجانا بتاتے ہیں۔" (لغات القرآن ص ۳۵۰) پھر کیا ان بیان شدہ معانی سے "انعام" کا مفہوم استنباط کیا جا سکتا ہے۔

3 وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ میں ب کا مفہوم "کے لیے" بیان کرنا اس مفسر قرآن کو ہی زیب دے سکتا ہے۔

۷۔ عصائے کلیمی اور دریا کا پھٹنا:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ	اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا	تم اس طرح گھر چکے تھے کہ ہماری رہنمائی میں تمہیں سمندر یا (دریا) میں خشک راستہ مل گیا۔
فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ (۲:۵۰)	تو تم کو نجات دی اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا۔	اور اس طرح ہم نے تمہیں فرعون کے لشکر کی دستبرد سے بچا لیا اور وہ اور اس کا لشکر سب غرق ہو گئے۔ (ص ۱۶)

اب دیکھئے آیت بالا میں فَرَقْنَا اور اغرقنا جمع متکلم کے صیغے اللہ نے استعمال فرمائے ہیں کہ ہم نے دریا کو پھاڑا۔ اور ال فرعون کو غرق کیا۔ اور آپ اس کا مفہوم یوں بیان کر رہے ہیں کہ درمیان میں نہ تو اللہ کا نام آئے نہ دریا کو پھاڑنے کے عمل کا اور اس واقعہ کی اعجازی حیثیت کی بو بھی نہ آنے پائے۔

ایک دوسرے مقام پر یہی واقعہ قرآن میں یوں مذکور ہوا ہے:

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ	اس وقت ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ دریا پر اپنی لاٹھی مارو۔	چنانچہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی جماعت کو (فلاں سمت سے) سمندر یا دریا کی طرف لے چلو اور وہاں انہیں اس راستے سے پار لے جاؤ جو خشک ہو چکا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadoos Foundation)

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (۲۶:۶۳)	تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا کہ گویا بڑا پہاڑ ہے	جب صبح نمودار ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں جماعتیں عظیم تودوں کی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہیں۔ بنی اسرائیل سمندر یا دریا کے اس پار اور فرعون کا لشکر اس طرف۔ (ص ۸۴۱)

اب دیکھئے کہ:

(۱) مندرجہ بالا مفہوم میں آپ عَصَا اور فانفلق دونوں لفظوں کا معنی یا مفہوم بتانا گول کر گئے یہ ہے وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرنے کا طریقہ۔

(۲) طود کا ترجمہ آپ نے بڑی جماعت کر دیا حالانکہ اس کا معنی بڑا تودہ ہے۔ چنانچہ خود پرویز صاحب لغات القرآن میں لکھتے ہیں: "قرآن میں کالطودِ العظیم (۲۶:۶۳) آیا ہے۔ یعنی بڑے تودہ یا ٹیلہ کی طرح۔" (لغات القرآن، ص:۱۰۹۴)

علاوہ ازیں بنی اسرائیل فرعونیوں کے مقابلہ میں قطعاً بڑی جماعت نہ تھی۔ بلکہ یہ لوگ فرعونیوں کی نظروں میں شِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ (۲۶:۵۴) یعنی معمولی اور حقیر سی جماعت تھے۔

(۳) اور یہ "جب صبح نمودار ہوئی" نیز ان دونوں جماعتوں کو بالمقابل کھڑا کرنے کا قصہ آپ کا دماغی کارنامہ تو کہلا سکتا ہے۔ وحی الٰہی کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر بنی اسرائیل بالمقابل کھڑا ہونے کی تاب رکھتے تو مصر سے نکلتے ہی کیوں؟ وہ نہتے کمزور اور فرعونی لشکر کی تعداد کے لحاظ سے بہت تھوڑے تھے۔

۸۔ عصائے کلیمی اور بارہ چشموں کا پھوٹنا:

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ	اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے (خدا سے) پانی مانگا۔ تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔	جب تمہیں پانی کی دقت ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام نے ہم سے اس کے لیے درخواست کی تو ہم نے اس کی رہنمائی اس مقام کی طرف کر دی جہاں بارہ چشمے مستور تھے۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا چٹان پر سے مٹی ہٹائی تو۔
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲:۶۰)	(انہوں نے لاٹھی ماری) تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے	اس میں سے ایک دو نہیں بارہ چشمے پھوٹ نکلے (ص ۲۱)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کچھ سمجھے آپ کہ:

1. قُلنَا کے معنی اس مقام کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔
2. اس آیت میں اضرب بعصاک الحجر کے الفاظ بالکل فالتو ہیں۔ لہٰذا ان کا ترجمہ یا مفہوم بتانے کی ضرورت نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ موسیٰ نے چٹان پر مٹی اپنے عصا سے ہٹائی ہو۔ یہ اسی عصا سے مٹی ہٹانے کا کرشمہ تھا کہ بارہ کے بارہ مستور چشمے پھوٹ نکلے۔ ورنہ اگر وہ کدال یا بیلچے سے ہٹاتے تو ممکن ہے کہ ان بارہ مستور چشموں میں سے صرف ایک دو ہی پھوٹتے۔

۹۔ عصائے کلیمی کیا چیز ہے؟:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَمُوسَى	اور موسیٰ علیہ السلام! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟	اے موسیٰ علیہ السلام! تم ان احکامات وہدایات پر قوت اور برکت ہر دو نقاط و نگاہ سے غور کرو اور بتاؤ کہ تم انہیں کیسا پاتے ہو؟
قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَى غَنَمِي	انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں	موسیٰ نے عرض کیا یا بار الہا! یہ احکام کیا ہیں؟ میرے لیے سفر زندگی کے لیے بہت بڑا سہارا ہیں۔ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھوڑتا ہوں۔
وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَى	اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں	ان کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق ان سے بصیرت ورہنمائی حاصل کروں گا۔
قَالَ أَلْقِهَا يَمُوسَى	فرمایا کہ موسیٰ! اسے ڈال دو۔	حکم ہوا کہ تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ اب انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔
فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى	تو انہوں نے اس کو ڈال دیا تو وہ ناگہاں سانپ بن کر دوڑنے لگا	اس کے بعد جب موسیٰ نے اس مہم پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان احکام کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا آسان کام نہیں۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ضابطہ نہیں ایک اژدہا ہے جو بڑی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تیزی سے دوڑ رہا ہے۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (۲۰:۷۱تا۲۱)

خدا نے فرمایا کہ اسے پکڑ لو اور ڈرنا مت ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے

خدا نے موسیٰ سے کہا۔ ان احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ ان سے فلاں فلاں کام لوں گا) ہم اسے ایسا ہی بنا دیں گے یہ اژدہا کی طرح ہلاکت آفرین ثابت ہو گا (باطل کے لیے) لیکن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے سہارا بن جائیں گے۔ (ص:۷۰۵)

مندرجہ بالا مفہوم پڑھنے کے بعد بتایئے کہ:

1 عصائے کلیمی واحد تھا یا جمع؟ پرویز صاحب کے بتائے ہوئے یہ احکام وہدایات تو جمع کا صیغہ ہیں۔ جب کہ قرآن نے عصا کے لیے تمام ضمائر واحد کے لیے استعمال کیے ہیں۔

2 اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ تم ان احکامات وہدایات کو کیسا پاتے ہو؟ اور موسیٰ علیہ السلام جواب دیتے ہیں کہ میں اس سے بنی اسرائیل کا ریوڑ جھنجھوڑوں گا اور یہ کروں گا اور وہ کروں گا اس سوال وجواب کی کوئی تک ہے؟ گویا سوال کا جواب موسیٰ علیہ السلام وہ دے رہے ہیں جو مستقبل میں کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اور اس کا جواب مستقبل کے پروگرام کی صورت میں دیا جا رہا ہے۔

3 اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ وہ عصا یک دم اژدہا بن گیا اور دوڑنے لگا۔ لیکن پرویز صاحب اسے محض ایک تصوراتی اژدہا قرار دے رہے ہیں اور اسی تصوراتی اژدہا سے موسیٰ اتنا ڈرے کہ اللہ تعالیٰ کو تسلی دینا پڑی کہ یہ خیالی اژدہا تو باطل کے لیے تھا۔ تم یوں ہی ڈر گئے تمہارے لیے یہ عصا وہی کچھ ہے جو تم کہہ رہے تھے۔ کہ یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ جب پرویز صاحب نے معراج انسانیت لکھی تھی تو اس وقت آپ اس عصائے کلیمی کو فی الواقع عصا ہی سمجھتے اور اس کا اژدہا بن جانے کے بھی قائل تھے لکھتے ہیں کہ:

"وہ دور ہی عجوبہ پرستی کا تھا نیز انسانی ذہن بھی پختہ نہ تھا۔ لہٰذا انہیں یہ معجزہ دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ فرعون کی خدائی کے باطل نظام کو درہم برہم کر دیں۔ اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکال کر خدا کی محکومیت کے تابع لے آئیں۔ اس کے لیے انہوں نے ہر طرح سے کوششیں کیں۔ فرعون کو دلائل وبراہین سے سمجھایا کہ وہ کتنی بڑی گمراہی پر ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

یہی کہتے رہے کہ ہمارے نزدیک تمہارے دعویٰ حق وباطل کے کذب وصدق کا معیار یہی ہے کہ تم ہمارے ساحرین سے بڑھ کر کرشمے دکھا سکتے ہو۔ یا نہیں' ظاہر ہے کہ کذب وصداقت کا یہ کوئی معیار نہیں تھا۔ اور حضرت موسیٰ یہ بھی جانتے تھے کہ ان لوگوں نے یہ بات کٹ حجتی کے طور پر محض اس لیے پیش کی ہے کہ انہیں خیال ہے کہ میں اس معرکہ میں شکست کھا جاؤں گا۔ لیکن بایں ہمہ وہ باذن خداوندی اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے تاکہ اس سے اتمام حجت ہو جائے اور کم از کم قوم فرعون کے عوام میں فرعون کے برسر حق ہونے کے دعویٰ باطل کی طرف سے تذبذب پیدا ہو جائے مقابلہ ہوا اور عصائے موسوی نے وہ کرشمہ دکھایا کہ خود ساحرین فرعون نے صداقت کے سامنے گردنیں جھکا دیں۔ اسے مذہبی اصطلاح میں معجزہ کہا جاتا ہے۔" (معراج انسانیت' ص:۷۰۳)

۱۰۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضاء:

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ	اور اپنا ہاتھ اپنی بغل سے لگالو۔ اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ بلکہ اپنی دعوت کو واضح اور روشن دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔
تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى (۲۰:۲۲)	وہ کسی عیب (بیماری) کے بغیر سفید (دمکتا چمکتا) نکلے گا۔ یہ دوسری نشانی (ہے) تو تمام مشکلات سے محفوظ و مصئون باہر نکل آئے گا۔ تیری یہ کامیابی تیری دعوت کی دوسری نشانی ہوگی (پہلی دشمن کی تباہی دوسری تمہاری جماعت کی سرفرازی۔ (ص۷۰۶)

اب دیکھئے کہ پرویزی لغت کے لحاظ سے عصا کا معنی احکامات وہدایات اور ید ک کا معنی ہے "اپنی دعوت" سوء کا معنی ہے "مشکلات" اور "بیضا" کا معنی ہے محفوظ و مصئون البتہ یہ سمجھ نہیں آسکی کہ "واضح اور روشن دلائل کے ساتھ" کس لفظ کا مفہوم ہے۔

نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ دشمن کی تباہی اور اپنی جماعت کی سرفرازی تو ایک ہی بات ہوتی ہے۔ پھر یہ دوسری نشانی کیسے ہوئی؟

علاوہ ازیں اسی بات کو قرآن نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا ہے:

وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۷:۱۰۸)	اور اپنا ہاتھ نکالا تو اسی دم دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سفید براق (تھا) پھر وہ ان روشن دلیلوں کو سامنے لایا جن کی رو سے بتایا گیا تھا کہ ان قوانین کی اطاعت سے زندگی کا ہر گوشہ کس طرح تابناک ہو جائے گا۔ یہ بصیرت افروز دلائل ہر دیدہ بینا کے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لیے چراغ راہ بن سکتے تھے۔

اس مفہوم سے معلوم ہوا کہ:

(۱) نَزَعَ کے معنی کھینچنا نہیں بلکہ سامنے لانا (۲) یَدَ کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ روشن دلائل (۳) بیضاء کے معنی سفید نہیں بلکہ چراغ راہ اور (۴) نَاظِرِین کے معنی دیکھنے والے نہیں بلکہ ہر دیدہ بینا ہوتا ہے۔ اب جو شخص اپنے پہلے سے قائم کردہ نظریات کا اس قدر پرستار ہو کہ قرآن کے ایک ایک لفظ کی تاویل کرنے سے بھی نہ چوکے' وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکتا ہے؟

۱۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ	تو قوم فرعون میں جو سردار تھے وہ کہنے لگے کہ یہ بڑا علامہ جادوگر ہے۔	اس پر فرعون کے سرداروں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ تو بڑا ماہر سحرکار نظر آتا ہے (جو اپنے زور بیان سے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے)
يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ	اس کا ارادہ یہ ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ بھلا تمہاری کیا صلاح ہے	اس کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ (اس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر) تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لے۔ سو کہو تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے۔
قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ- يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيْمٍ	انہوں نے (فرعون سے) کہا کہ فی الحال موسیٰ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو موقوف رکھیے اور شہروں میں نقیب روانہ کر دیجیے کہ تمام ماہر جادوگروں کو آپ کے پاس لے آئیں۔	انہوں نے کہا کہ تم موسیٰ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو سردست التوا میں رکھو اور اس اثناء میں نقیبوں کو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دو کہ وہاں کے سحرکار مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کر کے لائیں۔
وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ	اور جب جادوگر فرعون کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے اگر ہم جیت گئے تو ہمیں صلہ عطا کیا جائے گا؟	چنانچہ ان کے مذہبی پیشوا (ہامان اور اس کے ساتھی' پروہت) فرعون کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آ گئے تو ہمیں امید ہے کہ ہمیں اس کا بڑا صلہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ملے گا۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ	اس نے کہا ہاں اور (اس کے علاوہ) تم مقربین میں داخل کر لیے جاؤ گے۔	فرعون نے کہا بے شک تم کو صلہ بھی ملے گا۔ اور تم میرے مقربین میں ہو گے۔
قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّا اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ	جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا یا تو تم جادو کی چیز ڈالو یا ہم ڈالتے ہیں۔	انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ پہلے تم اپنے دلائل پیش کرو گے۔ یا ہم پہل کریں۔
قَالَ اَلْقُوْا فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ	(موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو۔ جب انہوں نے جادو کی چیزیں ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا (ان کی نظر بند کر دی اور لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنا بنا کر) انہیں ڈرا ڈرا دیا اور بہت بڑا جادو دکھایا	موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پہل کرو۔ سو جب انہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا تو ان کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو اس سے بھی ڈرایا (کہ تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا) اور اس طرح انہوں نے بڑے مکرو فریب کا جال بچھا کر رکھ دیا۔
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ	اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو	اور ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے کہا کہ تم اپنی تنذیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرو۔
فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۷:۱۰۹ تا ۱۱۷)	تو فوراً (اژدہا بن کر) جادوگروں کے بنائے ہوئے (سانپوں) کو نگلنے لگی۔	جب اس نے انہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریب بالکل ملیا میٹ ہو کر رہ گیا (ص ۳۶۷)

اب دیکھئے کہ:

1 درج بالا مفہوم میں پرویز صاحب نے ایک نبی اور جادوگروں کے مقابلہ کے بجائے اسی فی الواقع سحر کار یا سحر بیانی کا مقابلہ تسلیم کر لیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موسیٰ کے سحر کاروں کی سحر بیانی درجہ میں کم تھی اور موسیٰ کی زیادہ۔ اور یہی کچھ فرعونی بھی کہتے تھے۔

2 موسیٰ خود تو اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ میں بات بھی صاف طور پر نہیں کر سکتا (وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي ۱۳:۲۶) لہٰذا میرے بھائی ہارون کو بھی میری مدد کے لیے نبی بنا دے۔ لیکن پرویز صاحب حضرت موسیٰ کو بہت

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

بڑا سحر بیان قرار دے رہے ہیں۔ یہ بات قرآن کے سراسر خلاف ہے۔

3 آپ فرماتے ہیں کہ موسیٰ کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی ذرا سوچئے کہ جادو بیانی میں کچھ چمک ہوتی ہے؟ جادو بیان مقرر کی تقریر دل پر تو اثر کرتی ہے لیکن کیا کبھی ایسی تقریر نے لوگوں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کیا ہے؟

4 موسیٰ جب عصا ڈالتے تو وہ سانپ بن جاتا تھا۔ اس کے لیے قرآن نے تین مختلف مقامات پر تین الفاظ حیّۃ (۲۰/۲۰) ثُعبان (۷:۱۰۷) اور جَآنٌّ (۲۷:۱۰) استعمال فرمائے ہیں۔ اور تینوں کا معنی سانپ یا اژدہا ہے۔ لیکن پرویز صاحب ہر ہر مقام پر اس کا مفہوم "واضح دلائل" بیان فرماتے ہیں۔ یہ ایسی تحریف ہے جس کی تائید کوئی لغت کی کتاب (ماسوائے ان کی اپنی لغت کے) بھی نہیں کرتی۔

5 موسیٰ کے عصا کے اژدہا بن کر جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کے نگل جانے کے عمل کے لیے قرآن میں تین مقامات پر تَلْقَفُ کا لفظ آیا ہے (۷:۱۱۷، ۲۶:۴۵، ۲۰:۶۹) لیکن اس تکرار کے باوجود آپ اس کا مفہوم "ملیا میٹ" بیان فرما رہے ہیں حالانکہ خود لغات القرآن کے ص۱۳۹۷ پر لکھتے ہیں کہ "ساحرین کے جھوٹ موٹ کے سانپوں کو موسیٰ کا اژدہا جھٹ سے نگل گیا"

آپ مفہوم القرآن کے ص۳۶۶ پر لکھتے ہیں کہ:

"یہ (یعنی واضح یا محکم دلائل) ان الفاظ (عصا، ثعبان مبین۔ ید بیضاء) کے مجازی معنی ہیں۔ جنہیں (ہمارے نزدیک) استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔ ویسے عصا کے حقیقی معنی "لاٹھی" ثعبان مبین کے "نمایاں اژدہا" ید بیضاء کے "سفید چمکیلے ہاتھ" اور ساحر کے "جادوگر" ہیں۔

یعنی پرویز صاحب سمجھا یہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام الفاظ کو..... کسی بھی مقام پر اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں فرمایا۔ بلکہ کنائی معنوں میں استعمال فرمایا ہے۔ اور یہ بات صرف پرویز صاحب ہی سمجھ سکتے ہیں گویا آپ نے اپنی نظریہ پرستی کی پچ میں آکر اللہ تعالیٰ پر بھی الزام لگا دیا۔ قاتلھم اللہ انی یوفکون ○

قرآن میں بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ جب موسیٰ کا عصا سانپ بن گیا۔ تو آپ اس سے ڈر گئے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ اب اگر ان تمام الفاظ کا معنی "محکم یا واضح دلائل" ہی ہو تو ایسے دلائل سے ڈرنے کا کیا مطلب؟

سو یہ ہے وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرنے کا طریقہ۔ جو آپ کے مسلک کی سب سے پہلی شق ہے۔

۱۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ	مریم علیہا السلام نے کہا۔ پروردگار! میرے ہاں بچہ کیونکر ہوگا؟

مریم علیہا السلام نے تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ راہبہ کے ہاں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اولاد کا کیا سوال؟

وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ	کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک تو لگایا نہیں	①
قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ	فرمایا کہ خدا اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے	کہا گیا کہ یہ خدا کے اس قانون مشیت کے مطابق ہوگا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے۔
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳:۴۶)	جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔	وہ قانون جو اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس سکیم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ص ۱۳۰

دیکھئے مفہوم بالا میں پرویز صاحب نے لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ① کا معنی بھی چھوڑ دیا اور فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ کا بھی۔ اور "جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے" کا اپنی طرف سے اضافہ فرمایا اور فَيَكُوْن کا مفہوم بتایا۔ "اس سکیم کا آغاز ہو جاتا ہے" اب پرویز صاحب کی اتنی کوشش کے بعد بھی آپ حضرت عیسیٰ کی بن باپ پیدائش کے قائل رہیں۔ تو آپ کی مرضی۔

۱۳۔ حضرت عیسیٰ کا گود میں کلام کرنا:

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳:۴۶)	اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر (دونوں حالتوں میں) لوگوں سے (یکساں) گفتگو کرے گا اور نیکو کاروں میں ہوگا۔	تندرست وتوانا چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا' نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک پاکباز انسان۔ ص ۱۲۹

اب دیکھئے کہ اس مقام پر پرویز صاحب نے مَهْد کا ترجمہ "چھوٹی عمر" کیا ہے۔ جب کہ لغات القرآن میں مھد کا معنی گہوارا لکھا ہے (ص ۱۵۷۲) لیکن پھر پینترا بدلتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"حضرت عیسیٰ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں۔ آپ نے فرمایا میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اور

---

① ان الفاظ کا کوئی معنی یا مفہوم نہیں۔ یہ بس اللہ میاں نے یونہی نازل کر دیئے تھے۔

② سورہ مریم میں (آیت ۲۰) پرویز صاحب ان الفاظ کا معنی تو لکھ دیتے ہیں مگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے حضرت مریم کی شادی کر دیتے ہیں۔ (مفہوم القرآن ص ۶۸۹)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مجھے نبی بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰ کو نبوت مل چکی تھی"

پرویز صاحب کی یہ دلیل اس لحاظ سے غلط ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام اپنے بچے کو اٹھائے مَكَانًا قَصِيًّا سے اپنی قوم کے پاس آئیں تو اس وقت ان لوگوں نے مریم علیہا السلام سے کہا کہ نہ تمہارا باپ برا آدمی تھا نہ ماں بدکار تھی۔ تم یہ بچہ کہاں سے لے آئی تو حضرت مریم نے کوئی جواب دینے کی بجائے اس بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ (فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ (۲۹:۲۰)

اب سوال یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام تو اشارہ کر کے جواب کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئیں حضرت عیسیٰ ویسے ہی اس وقت کلام نہ کر سکتے تھے تو پھر یہ ہنگامہ کیسے فرو ہوا تھا؟

۱۴۔ حضرت عیسیٰ کے دوسرے معجزات :

(۱) اِنِّیْٓ اَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳:۴۰)	میں تمہارے سامنے مٹی کی صورت بشکل پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے سچ مچ جانور ہو جاتا ہے۔	میں اس وحی کے ذریعے ایسی حیات نو عطا کروں گا جس سے تم موجودہ پستی وخاک نشینی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں پر اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکرو عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی ص ۱۲۰

اب دیکھئے درج بالا مفہوم میں آپ کو فانفخ اور باذن اللّٰہ کا معنی یا مفہوم بھی کہیں نظر آتا ہے؟ کیا یہ الفاظ بے کار ہیں؟ علاوہ ازیں پرویز صاحب نے اَخْلُقُ کا معنی "حیات نو عطا کرنا" طین کا معنی "خاک نشینی" اور فیکُون طَیْرًا کا معنی فضا کی بلندیوں میں اڑنا کر کے اس معجزہ سے انکار کی راہ جیسے ہموار فرمائی ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔

(۲) وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ	اور مادر زاد اندھے کو تندرست کر دیتا ہوں	یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح رستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے (ص ۱۳۰)

اس جملہ میں ضمیر واحد متکلم ہے یعنی حضرت عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں فاعل مادر زاد اندھے (مفعول) کو اچھا کر دیتا ہوں۔ لیکن پرویز صاحب کا فاعل حضرت عیسیٰ نہیں بلکہ آسمانی روشنی ہے اور مفعول وہ ساری قوم جو آپ پر ایمان نہ لائی اور ان کی آنکھیں بے نور تھیں۔

(۳) وَالْاَبْرَصَ	اور ابرص کو بھی	اس سے تمہاری ویران کھیتی جس پر تروتازگی کا نشان باقی نہیں رہا۔ پھر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی جن کی وجہ سے تمہیں کوئی پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ (ص ۱۳۰)

اس لفظ میں فاعل حضرت عیسیٰ ہیں اور مفعول کوڑھی لوگ ہیں لیکن پرویز صاحب کا فاعل آسمانی روشنی اور مفعول منکرین نبوت ہیں۔ آپ اپنے مفہوم کی تائید کے طور پر لغات القرآن میں لکھتے ہیں کہ "انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ انسانیت کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے (ص ۳۱۵) اب سوال یہ ہے کہ ان بیماریوں سے مراد انسانیت کی ہی بیماریاں ہے تو ان کا ذکر دوسرے انبیاء کے ضمن میں بھی آنا چاہیئے تھا۔ آخرت حضرت عیسیٰ کے بیان میں ہی قرآن نے دو دفعہ یہ ذکر کیوں کر دیا ہے؟ اور باقی سب کو چھوڑ دیا۔

(۴) وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳:۴۸) — اور خدا کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ — مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی یہ موت جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے۔ ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی۔" (ایضاً)

اب دیکھئے اس مفہوم میں (۱) فاعل کوئی بھی نہیں جب کہ آیت میں فاعل عیسیٰ ہیں (۲) باذن اللہ کا لفظ بھی ضرورت سے زائد ہے (۳) موتیٰ کے معنی مردے نہیں بلکہ "ذلت و خواری کی موت" ہے (۴) موتیٰ موت کی جمع ہے یعنی مردے لیکن مفہوم آپ واحد کی صورت میں پیش فرما رہے ہیں۔

اگر آپ ان سب تاویلات کو درست تصور فرمالیں تو واقعی حضرت عیسیٰ کو کوئی بھی معجزہ نہیں دیا گیا تھا۔

۱۵۔ حضرت عزیر کا سو سال کے بعد زندہ ہونا:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ — یا اس شخص کی طرح جسے ایک گاؤں پر اتفاق گزر ہوا — (تمثیلی انداز میں بنی اسرائیل کی غلامی کے سو سالہ دور کو یوں سمجھو کہ) ایک شخص کا گزر ایک بستی پر ہوا۔

وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ — وہ گاؤں اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا۔ تو اس نے کہا کہ خدا اس (کے باشندوں) کو مرنے کے بعد کیونکر — جس کے مکانات مسمار ہو کر کھنڈر بن چکے تھے۔ اس نے کہا کیا اس قسم کی ویران بستی کو اس کی موت کے بعد

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْبَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ

زندہ کرے گا۔ تو خدا نے اس کی روح سو برس تک قبض کرلی۔ پھر اس کو جلا اٹھایا اور پوچھا تم کتنا عرصہ مرے رہے ہو۔ اس نے جواب دیا ایک دن یا اس سے بھی کم۔ فرمایا بلکہ تم سو برس (مرے) رہے ہو۔ اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ اتنی مدت میں مطلق سڑی بسی نہیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (جو مرا پڑا ہے غرض ان باتوں سے یہ ہے) کہ ہم تم کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں

پھر سے زندگی مل سکتی ہے؟" اللہ نے ایک سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور اس کے بعد اسے دوبارہ زندگی عطا کردی۔ اس سے پوچھا گیا بھلا تم کتنی مدت اس حالت میں رہے ہو؟ اس نے کہا۔ بس ایک آدھ دن اللہ نے کہا تم سو سال تک اس حالت میں رہے ہو بایں ہمہ دیکھو۔ تمہارا کھانا اور پانی تک خراب نہیں ہوا۔ اسی طرح تمہارا گدھا بھی ویسے کا ویسا کھڑا ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے اس بات کی نشانی بن جاؤ کہ قوانین خداوندی کی رو سے مردہ اقوام کو بھی زندگی مل سکتی ہے۔

وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا

اور وہاں گدھے کی ہڈیوں کو بھی دیکھو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑے دیتے ہیں۔ اور ان پر کس طرح گوشت پوست چڑھائے دیتے ہیں۔

کیا تم جنین کی حالت پر غور نہیں کرتے کہ ہم خون کے لوتھڑے سے کس طرح ہڈیاں ابھارتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت پوست چڑھا کر انہیں ایک جیتا جاگتا بچہ بنا دیتے ہیں۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲:۲۵۹)

جب یہ واقعات اس کے مشاہدے میں آئے تو بول اٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جب اس مثال کے ذریعے سے اس پر بات واضح ہو گئی تو اس نے کہا کہ ہاں اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے موت اور حیات کے فیصلے بھی انہی پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں ص ۱۰۲

آپ اقتباس بالا پڑھ کر بتایئے کہ موت وحیات کا وہ کونسا مقررہ پیمانہ ہے جس کی رو سے گدھے کا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مالک تو سو سال مرا پڑا رہے اور گدھا ویسے کا ویسا کھڑا رہے؟ نیز وہ کونسا مقررہ پیمانہ ہے جس کی رو سے کھانا اور پانی ایک سو سال تک کھلے میدان میں پڑا رہنے کے باوجود خراب نہیں ہوتا؟

بات گدھے کی ہو رہی تھی۔ پرویز صاحب نے درمیان میں جنین کا ذکر کر کے پہلے لوتھڑے سے ہڈیوں کا بے محل ذکر شروع کر دیا۔ پھر ہڈیوں پر گوشت پوست پہنانا شروع کر دیا۔ جس کا آیت کے سیاق و سباق سے چنداں تعلق نہیں۔

سرسید صاحب نے اس واقعہ کو خواب کا واقعہ قرار دیا ہے۔ پرویز صاحب اس واقعہ کو تمثیلی داستان بتا رہے ہیں۔ ان اللہ علی کل شی قدیر کہتے وقت سرسید صاحب نے اس سوئے ہوئے آدمی کو جگا لیا تھا۔ پرویز صاحب مقررہ پیمانے اور کنٹرول بتانے لگے ہیں جن کے مطابق ان کا اپنا بیان بھی پورا نہیں اترتا۔

۱۶۔ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں:

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ	پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا اور وہ (قابل ملامت) کام کرنے والے تھے۔	کشتی میں بوجھ زیادہ تھا وہ ڈوب گئی اور یونس کو ایک بہت بڑی مچھلی نے دبوچ لیا۔ وہ اس مصیبت کو دیکھ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ آیا ہے۔ یہ اس کی سزا ہے۔
فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ	پھر اگر وہ (خدا کی) پاکی بیان نہ کرتے	لیکن اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور مچھلی کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔
لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۷:۱۴۲تا۱۴۴)	تو اس روز تک کہ لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ اس کے پیٹ میں رہتے۔	اگر وہ ایسا نہ کرتا اور بہت اچھا تیراک نہ ہوتا تو مچھلی اسے نگل لیتی اور پھر وہ قیامت تک باہر نہ آسکتا۔ یعنی کبھی باہر نہ آسکتا۔ (ص ۱۰۴۷)

اب دیکھئے پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔

1. تیراک کے لیے سابح کا لفظ آتا ہے مُسبح کا نہیں آتا۔
2. سورہ انبیاء میں اس قصہ یونس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

"اور ذوالنون کو یاد کرو۔ جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں چل دیئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ آخر اندھیروں میں (خدا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کو) پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے (اور) بے شک میں قصوروار ہوں۔"

اب سوال یہ ہے کہ اگر مچھلی نے یونس کو صرف دبوچا ہی تھا نگلا نہیں تھا۔ تو وہ کون سے اندھیرے تھے جن میں یونس نے پکارا تھا۔

3 مسبح کا معنی سرگرم عمل رہنا بھی ہے اور تسبیح بیان کرنا بھی۔ تاہم قرآن تسبیح بیان کرنے کے معنی کی تائید کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے حضرت یونس کی وہ تسبیح بھی بیان کر دی ہے۔

رہا کشتی کو ڈبو کر بیسیوں جانوں کو غرقاب کرنا۔ اور حضرت یونس کا اپنے آپ کو مچھلی سے چھڑانا تو یہ سب پرویزی اختراعات ہیں جن کے بغیر آپ کا یہ مفہوم مکمل نہ ہو سکتا تھا۔

۱۷۔ حضرت ایوب علیہ السلام پر انعامات :

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ اِذْنَادٰى رَبَّهٗ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَ عَذَابٍ	اور ہمارے بندے ایوب علیہ السلام کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ (بار الہا) شیطان نے مجھ کو تکلیف اور ایذا دے رکھی ہے۔	اور ہمارے بندے ایوب علیہ السلام کی سرگزشت کو بھی سامنے رکھو۔ وہ ایک سفر میں بڑی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ گئے۔ پانی ختم ہو گیا وہ سفر کی تکان اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس پر اسے سانپ نے ڈس لیا۔ اس طرح اسے مصائب و تکالیف کے ہجوم نے گھیر لیا۔
اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ	(ہم نے کہا کہ زمین پر) لات مارو دیکھو۔	ہم نے اس کی رہنمائی ایسے مقام کی طرف کر دی۔
هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ○	یہ (چشمہ نکل آیا) نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو شیریں	جہاں ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا۔ وہ وہاں پہنچا۔ پانی پیا' نہایا' مار گزیدہ پاؤں کو پانی میں رکھ کر ہلاتا رہا۔ جس سے حدت رفع ہوئی۔
وَوَهَبْنَا لَهٗ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ○	اور ہم نے ان کے اہل وعیال اور ان کے ساتھ ان کے برابر بخشے تو یہ ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے لیے نصیحت تھی	پھر اس کے ساتھی بھی اس سے آملے۔ بلکہ ان کے ساتھ اتنی تعداد میں ایک اور جماعت بھی ایمان لے آئی یہ سب کچھ ہماری طرف سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سامان رحمت و ربوبیت تھا۔ اس میں صاحبان عقل وبصیرت کے لیے سامان موعظت ہے۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (۴۱:۳۸تا۴۴)

اور اپنے ہاتھ میں جھاڑو لو۔ اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو۔ بے شک ہم نے ایوب علیہ السلام کو صابر پایا بہت خوب بندے تھے۔ بے شک وہ رجوع کرنے والے تھے

وہ جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج کراتا رہا اس طرح اسے شفا ہو گئی۔ اس نے اس تکلیف کو بڑی پامردی سے برداشت کیا اور کہیں بھی ہمارے قانون کی خلاف ورزی نہ کی۔ ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا رہا۔ (یوں اس نے توہم پرستی کی جڑ کاٹ دی۔ جس میں لوگ مبتلا تھے۔) (ص ۱۰۶۰)

پرویز صاحب کا یہ مفہوم درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے:

1 دنیا میں ہزاروں چشمے ایسے ہیں جن کا پانی صاف شفاف ٹھنڈا اور میٹھا' پینے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن ایسے چشموں میں مارگزیدہ پاؤں ڈال کر ہلائے تو اسے آرام نہیں آتا۔ لامحالہ حضرت ایوب والا معاملہ خرق عادات تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

2 پرویز صاحب کی لغات القرآن کے مطابق شیطان کے معنی یا تو پیاس کی شدت ہے یا سانپ کا ڈسنا دونوں اکٹھے نہیں ہوتے۔ اس پیاس کی شدت کے لیے آپ کو حضرت ایوب کو سفر پر روانہ کرنا پڑا اور وہیں سانپ سے ڈسوا بھی لیا۔

3 کسی نبی پر ایمان لانے والی جماعت اس کی آل تو کہلا سکتی ہے۔ اہل نہیں کہلا سکتی۔ فرعونیوں کو آل فرعون تو کہا جا سکتا ہے اہل فرعون نہیں کہہ سکتے اہل فرعون سے مراد اس کے گھر والے ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح آل ایوب علیہ السلام سے مراد ایوب پر ایمان لانے والی جماعت اور اہل ایوب علیہ السلام سے مراد ان کے گھر والے ہی ہو سکتے ہیں۔ ہاں ان میں سے اگر کوئی فرد کافر ہو تو نبی کے اہل سے خارج ہو جائے گا۔ نیز اہل الکتاب اور اہل المدینہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن آل کتاب اور آل مدینہ [1] نہیں کہہ سکتے۔

4 اللہ تعالیٰ تو حضرت ایوب علیہ السلام کو حکم دے رہے ہیں کہ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا اور پرویز صاحب اس کا مفہوم ماضی میں بیان فرما رہے ہیں کہ "وہ جڑی بوٹیوں سے علاج کراتا رہا"

نیز جب ایوب علیہ السلام کو چشمہ میں ایڑی ہلانے سے شفا ہو گئی تھی۔ تو بعد میں جڑی بوٹیوں سے علاج کرانے کی ضرورت کیا تھی؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

5 فَاضْرِبْ بِهٖ کا مفہوم بتانا آپ چھوڑ گئے۔ یا شاید ضِغث کا معنی جڑی بوٹیاں اور اضرب بہ کا معنی ہی علاج کرانا ہو۔

۱۸۔ اصحاب الفیل :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟	کیا تم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا کہ تمہاری نشوونما دینے والے نے اس لشکر کا کیا حشر کر دیا تھا۔ جو تم پر ہاتھی لے کر حملہ آور ہوا تھا۔
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ	کیا ان کا داؤ غلط نہیں کیا	خدا نے ان کی خفیہ تدبیر کو کس طرح ناکام بنا کر رکھ دیا تھا
وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ	اور ان پر جھلڑ کے جھلڑ جانور بھیجے	(انہوں نے پہاڑ کے دوسری طرف ایک غیر مانوس خفیہ راستہ اختیار کیا تھا تاکہ وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں۔ لیکن) چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ (جو عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں فطری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں گی۔) ان کے سر پر منڈلاتے ہوئے آ گئے۔ اور اس طرح تم نے دور سے بھانپ لیا کہ پہاڑ کے پیچھے کوئی لشکر آ رہا ہے۔ (یوں ان کی خفیہ تدبیر طشت از بام ہو گئی)
تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ	جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔	چنانچہ تم نے پہاڑ پر چڑھ کر ان پر سخت پتھراؤ کیا۔
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (۱۰۵:۱تا۵)	تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس	اور اس طرح اس لشکر کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا (یعنی ان کا کچومر نکال دیا۔) (ص ۱۴۸۴)

---

① اہل اور آل کے مزید فرق کے لیے دیکھیے میری تصنیف مترادفات القرآن۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

1 آپ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ "چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ عام طور پر لشکر کے ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں۔ تاکہ انہیں بہت سی لاشیں کھانے کو ملیں" دور نبوی میں بے شمار جنگیں ہوئیں۔ کسی موقع پر چیلوں اور گدھوں کے لشکر اوپر منڈلائے نہ ہی کسی اور زمانہ میں ایسا واقعہ ہوا۔ لہٰذا یہ بات بھی خرق عادت تھی۔

2 ﴿ سِجِّيْلٍ ﴾ کا لغوی معنی ہے سنگ گل یعنی وہ مٹی جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے (دیکھئے پرویز صاحب کی لغات القرآن ص ۸۵۲) اور ایک دوسرے مقام پر آپ نے اس کا معنی کھنگر کیا ہے۔

اور ایسے کھنگر، کنکر یا کنکریاں پہاڑوں کے اوپر نہیں ہوتیں۔ نہ ہی ایسے کھنگروں یا کنکریوں سے کسی لشکر کو جس میں بالخصوص ہاتھی بھی ہوں ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

3 ترمی واحد مونث غائب کا صیغہ پرندوں کے جھنڈ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن آپ نے جو مفہوم بیان فرمایا ہے۔ وہ ترمون کا ہے۔ لہٰذا ترمی کا بیان کردہ مفہوم گرامر کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔

4 علاوہ ازیں تاریخ سے بھی ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اہل مکہ اصحاب الفیل کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے ہوں۔

۱۹۔ رسول اکرم ﷺ اور واقعہ اسراء :

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا	وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ یعنی (بیت المقدس) لے گیا	خدا کی سکیمیں اتنی بلند تر ہیں کہ وہ ان کے قیاس و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں۔ چنانچہ وہ اپنی سکیم کے مطابق اپنے بندے کو راتوں رات بیت الحرام (مکہ) سے نکال کر (مدینہ کی) کشادہ سرزمین کی طرف لے گیا تاکہ اس دور دراز مقام میں جا کر نظام خداوندی کی تشکیل کرے۔
الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ	جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔	ہم نے اس مقام اور اسکے گردو پیش کو بڑا بابرکت بنایا ہے۔ اس کی فضا آسمانی انقلاب کے لیے بڑی سازگار ہے۔
لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۷:۱)	تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں	یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ خدا ان باتوں کو آشکار کر دے جن کا اتنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

عرصہ سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

(ص ۶۲۶)

اس مفہوم میں پرویز صاحب نے واقعہ اسراء اور واقعہ ہجرت کو ایک ہی واقعہ قرار دیا ہے۔ جو درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

1 اس سورہ اسراء کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۵۰ ہے۔ اس کے بعد مکہ میں مزید ۳۶ سورتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد ہجرت کا وقت آیا تھا۔

2 واقعہ اسرا تو واقعی ایک رات کا واقعہ ہے جیسا کہ قرآن میں ہے لیکن ہجرت میں ۱۵ دن اور ۱۵ راتیں لگ گئے تھے۔ لہٰذا اس پر ﴿ لَيْلًا ﴾ (ایک رات یا راتوں رات) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

3 مسجد اقصیٰ اسم معرفہ اور ایک مشہور و معروف مسجد کا نام ہے۔ جو بنی اسرائیل کے دور سے لے کر آج تک موجود اور اسی نام سے متعارف ہے۔ لہٰذا مسجد اقصیٰ کا مفہوم اور دراز کا مقام (یا دور کی مسجد' ① مسجد نبوی) بیان کرنا اور عرفی معنے چھوڑ کر لغوی معنی بیان کرنا سراسر لغو اور احمقانہ فعل ہے۔

۲۰۔ اللہ تعالیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا:

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا	اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا اور اس میں باہم جھگڑنے لگے	اور جب تم نے ایک انسانی جان ناحق لے لی۔ اسے (خفیہ طور پر) مار دیا۔ اور جب تفتیش شروع ہوئی۔ تو لگے ایک دوسرے کے سر الزام دھرنے۔
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ	لیکن جو بات تم چھپا رہے تھے خدا اسے ظاہر کرنے والا تھا۔	لیکن جس بات کو تم چھپانا چاہتے ہو۔ خدا اسے ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔

---

① جیسا کہ آپ نے ایک دوسرے مقام پر وضاحت فرما دی لکھتے ہیں کہ:

"خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب کا نہیں تو یہ حضور کی شب ہجرت کا بیان ہے۔ اس طرح مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ کی مسجد نبوی ہوگی۔ جسے آپ نے وہاں جا کر تعمیر فرمایا۔ باقی رہا اس کے ماحول کا بابرکت ہونا تو اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جس سرزمین سے حق کی سرفرازی و سربلندی کا اس طرح ظہور ہوا ہو۔ کہ وہ باطل کی ہر قوت پر غالب آجائے اس سے زیادہ اور خیر و برکت کیا ہوگی۔ (معراج انسانیت ص ۲۰۷)

واقعہ اسراء کی اس تاویل سے آپ نے اپنے دو بنیادی نظریات کی تائید فرما دی (۱) معجزات سے انکار (۲) اللہ تعالیٰ کے استویٰ علی العرش سے انکار۔ جو لوگ صرف معجزات کے منکر مگر استوی علی العرش کے قائل ہیں۔ وہ اس واقعہ کی تاویل روحانی سفر سے کرتے ہیں۔ جس کی تردید پہلے پیش کی جا چکی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا	تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا کوئی سا ٹکڑا مقتول کو مارو	اس (خدا) نے کہا کہ تم میں سے ایک ایک جاؤ اور مقتول کے کسی حصہ جسم کو...... لاش کے ساتھ لگادو (چنانچہ جو مجرم تھا۔ وہ لاش کے قریب پہنچا تو خوف کی وجہ سے اس سے ایسے آثار نمایاں ہو گئے۔ جو اس کے جرم کی غمازی کرنے کے لئے کافی تھے۔
كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى	اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے۔	اس طرح اللہ نے اس کے قتل کے راز کو بے نقاب کر دیا۔
وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ	اور تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔	اور مجرم سے قصاص لے کر موت کو زندگی سے بدل دیا۔
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲:۷۲، ۷۳)	تاکہ تم سمجھو	کیونکہ موت میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ (۲:۱۷۹ ایضاً ص۲۵)

اب دیکھئے اس مفہوم میں آپ نے:

1. اضربوا کا معنی مارنا کی بجائے ساتھ لگانا کر دیا۔ جو لغوی لحاظ سے غلط ہے۔
2. اضربوہ میں ہ کی ضمیر مقتول کی طرف ہے اور ببعضھا میں ھا کی اس مذبوح سانڈ کی طرف جس کے ذبح کرنے میں بنی اسرائیل پس وپیش کر رہے تھے۔ لیکن آپ نے ہا کی ضمیر بھی مقتول کی طرف موڑ دی ہے۔ جس کا معنی یہ ہونا چاہئے کہ مقتول کے جسم کو اسی کے جسم کا کوئی حصہ لگاؤ۔ لیکن آپ پھر ہا کی ضمیر کو بنی اسرائیل کے تمام افراد کی طرف لے جاتے ہیں۔ جو گرامر کی رو سے غلط ہے۔
3. مجرم کی دریافت کا جو نفسیاتی طریقہ آپ نے دریافت فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ کسی بھی زمانہ کی پولیس یا عدالت ایسے آسان نفسیاتی طریقہ سے مجرم کی تلاش کے سلسلہ میں استفادہ نہیں کر سکی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس طرح قتل کے راز بے نقاب کیا کرتا ہے۔
4. حوالہ تو اس بات کا درکار تھا کہ مردہ زندہ ہوتا ہے؟ لیکن آپ قصاص کا اپنی طرف سے اضافہ فرما کر حوالہ یہ پیش فرما رہے ہیں۔ کہ قوم کی حیات کا راز قصاص میں پوشیدہ ہے اور یہ لعلکم تعقلون کا مفہوم ہے۔

مفہوم القرآن سے جو مندرجہ بالا اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ صرف ایک بنیادی نظریہ ”انکار معجزات“ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ اس متوارث نظریہ کو نبھانے کی خاطر قرآن کی عبارت

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

سے کیا کچھ کیا گیا ہے۔ پھر طلوع اسلام کے ایسے اور بھی بہت سے نظریات ہیں۔ جن کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ان مخصوص نظریات کی آبیاری آپ قرآن سے یونہی فرمایا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ آپ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ:

"یہ بھی یاد رہے کہ میرے نزدیک یہ شرک ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی خیال لے کر قرآن کی طرف آئے اور پھر قرآن سے اس کی تائید تلاش کرنا شروع کر دے۔ قرآن سے صحیح رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے۔ اور اس کے ہاں سے جو کچھ ملے اسے من وعن قبول کرے۔ خواہ یہ اس کے ذاتی خیالات' رجحانات' معتقدات اور معمولات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ (مقدمہ مفہوم القرآن ص ش)

ہم آپ کے اس خیال کو درست ہی نہیں قابل تحسین سمجھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے آپ کا عمل آپ کے اس قول کی مطابقت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں اس دیباچہ میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مفہوم القرآن کا اولین مخاطب قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ یہ بنیادی طور پر انہیں کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔" (ایضاً ص ط)

اب دیکھئے تعلیم یافتہ طبقہ سے آپ کی مراد کالجوں کا انگریزی خواں طبقہ ہی ہو سکتا ہے۔ جو جدید لادینی نظریات سے مرعوب اور عقل کا پرستار بلکہ صرف اپنی ہی عقل پر نازاں ہوتا ہے۔ مفہوم القرآن کے مطالعہ کے لیے اس طبقہ کا انتخاب واقعی نہایت مفید ہے۔ ایسا طبقہ چونکہ عربی زبان سے بے بہرہ ہی نہیں بلکہ نفور بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا پرویز صاحب کی تاویلات و تحریفات اس کی نگاہ میں اوجھل ہی رہیں گی اور اسے یہ قطعاً معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ قرآن کے نام پر اس سے کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: چہارم

فکر پرویز پر عجمی شیوخ کی اثر اندازی

پرویز صاحب کی خالص قرآنی دعوت: تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی نے "خالص قرآنی دعوت" کا دعویٰ کیا۔ خواہ دعویٰ نہایت نیک نیتی سے کیا گیا تھا۔ تاکہ امت سے فرقہ بازی ختم کی جاسکے۔ یا یہ دعویٰ حصول جاہ اور بدنیتی سے یا غلط فہمی سے کیا گیا تھا۔ ان تمام صورتوں میں ہمیشہ یہ معاملہ پیش آیا کہ اس "خالص قرآنی دعوت" کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت سے انحراف پھر بتدریج اہانت شروع ہوگئی۔ پھر آپ کی احادیث وسنن کے ساتھ ہی ساتھ جامعین حدیث اور محدثین کرام کو بھی تختہ مشق بنالیا گیا۔ چونکہ اس "خالص قرآنی دعوت" کی بنیاد کتاب اللہ اور حامل کتاب کی تفریق پر رکھ کر اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا موقعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی خالص قرآنی دعوت کو امت مسلمہ نے کم ہی قبول کیا ہے۔ اور ایسی خالص قرآنی دعوت کے داعی ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں۔ اس دعویٰ کے بعد داعی کی دیانت اخلاص اگر ہو بھی تو---- اور تدبیر ودانش سب صفر سے ضرب کھاتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ داعی کی یہ خوبیاں اس دعویٰ میں پوشیدہ مفاسد کو بھی روک نہیں سکتیں نہ ہی کبھی اس طرح فرقہ بازی ختم ہوئی' نہ اس میں کچھ اصلاح ہوئی۔ اس کے برعکس مزید ایک نیا فرقہ معرض وجود میں آگیا ایسی "خالص قرآنی دعوت" کے داعی ہمیشہ یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے کیونکہ فلاں اور فلاں امام نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی۔ لیکن حقیقتاً ان کا یہ دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پرانی باتوں سے کبھی نیا فرقہ وجود میں نہیں آتا۔ نیا فرقہ وجود میں آجانے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ایسا داعی چند نئے افکار ونظریات بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پرویز صاحب کی خالص قرآنی دعوت کا نتیجہ سامنے ہے۔ وہ فرقہ پرستی کو شرک قرار دیتے رہے اور اس فرقہ بازی کو ختم کرنے کا واحد حل یہی خالص قرآنی دعوت کو تلاش کرنا اور اختیار کرنا فرمایا۔ ان کی اس دعوت سے امت کی اصلاح تو کچھ نہ ہوسکی۔ البتہ ایک نیا "پرویزی فرقہ" معرض وجود میں آگیا۔ اور اس طرح پرویز صاحب خود شرک میں اضافہ کا سبب بن گئے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

خالص قرآنی دعوت پر اصرار : پرویز صاحب قرآن کے علاوہ اور کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تحریروں میں اس "سنہری اصول" کا جابجا اظہار فرمایا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

① "اگر یہ (پرویز صاحب کے تصورات۔ مولف) قرآن کی کسی حقیقت کی تائید کرتے ہوں تو ان سے قرآن فہمی میں مدد لیجیے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز قرآن کے خلاف جاتی ہو۔ تو بلا ادنیٰ تامل اسے دیوار پر دے ماریئے۔" (معارف القرآن' ج:۲' ص:۲۹ پیش رس)

② "جب تک ہم خالص قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جسے ہر وقت وہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" (اسباب زوال امت' ص:۱۱۷-۱۱۸)

③ "میں علیٰ وجہ البصیرت دیکھ رہا ہوں کہ مسلمان قرآن سے ہٹ کر دوسری راہوں پر چلے جا رہے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے سامنے صحیح دین پیش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے سامنے خالص قرآن پیش کیا جائے۔" (م۔ ح' ج: ۲' ص:۳۱۶)

④ "صحت و سقم کا معیار میزان قرآن ہے۔ نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لیے اگر کوئی شخص میری گزارشات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ تو اسے کہو کہ قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔" (سلیم کے نام خطوط' ص ۷۴)

پھر ان باتوں سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے فرمایا۔

اپنی غلطیوں کا اعتراف : "میں جو کچھ کہتا ہوں' ہو سکتا ہے اس میں غلطی کر جاؤں۔ لیکن میں صرف اس غلطی کو تسلیم کروں گا جسے قرآن کی رو سے غلط ثابت کیا جائے گا۔ کتنی ہی غلطیاں ہیں جن کی میں نے اس طرح اصلاح کی ہے۔ اور آئندہ کے لیے بھی اس قسم کی اصلاح کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں اور اصلاح کرنے والے کا شکر گزار۔ والسلام" (م۔ ح ج ۲ ص ۳۱۷)

پرویز صاحب کی کذب بیانی : اب دیکھئے پرویز صاحب اس اعتراف کے بعد اس سے کیسے انحراف فرماتے ہیں لکھتے ہیں۔

"میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے' قارئین کے سامنے ہے۔ میں ہر سوچنے والے کو دعوت دیتا ہوں کہ میری تحریروں کو قرآن کے معیار پر پرکھے اور جہاں کوئی غلطی نظر آئے اس سے مجھے مطلع کرے۔ جس کے لیے میں شکر گزار ہوں گا اس کے جواب میں معترضین کی طرف سے آج تک کبھی کسی نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری فلاں بات قرآن کے خلاف ہے۔ ہمیشہ یہی کہا کہ تم حدیثوں کے منکر ہو اور اسلاف کے ناقد ہو۔ اس لیے کافر ہو مرتد ہو اور نہ جانے کیا کیا ہو۔" (اسباب زوال امت ص ۱۵۳)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب سوال یہ ہے کہ اگر آج تک پرویز صاحب کو کسی نے کبھی بھی یہ نہیں لکھا کہ "تمہاری' فلاں بات قرآن کے خلاف ہے" تو بموجب اقتباس اول وہ کونسی غلطیاں تھیں۔ جن کی آپ نے اصلاح فرمائی تھی؟نیز وہ کون کون سے خوش قسمت حضرات تھے۔ جن کی نشاندہی کے مطابق آپ نے قرآنی غلطیوں کی اصلاح کی تھی؟ علاوہ ازیں آپ نے اس کا شکریہ بھی ادا فرمایا تھا۔

خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرنا: پرویز صاحب کا دوسرا "سنہری اصول" یہ ہے کہ آپ خود بھی خالی الذہن ہو کر مطالعہ فرمایا کرتے ہیں۔ اور دوسرے کو بھی ایسی ہی ہدایت فرماتے ہیں اس اصول کے سلسلہ میں بھی آپ کے چند اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

① "اگر تعصب کی پٹی کسی کی بصارت نہ چھین لے تو کہئے کہ اس تعلیم کے ماننے میں کسی سلیم القلب انسان کو ذرا بھی تامل ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے لیے قرآن کی تعلیم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا ضروری ہے اور یہی چیز مشکل ہے۔ جس دن انسان میں اتنی وسعت قلب اور کشادگی نگاہ پیدا ہوگئی اسی دن یہ مشکلات حل ہو جائیں گی۔" (م-ح-ج:۲' ص:۲۲۶)

② "قرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے بعد بھی اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی عقل میں نہیں آتیں تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہ کیجیے۔ بلکہ ان احکام کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجیے تاآنکہ مزید تحقیق وتدبیر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔" (ایضاً ص۵۴۱)

③ "قرآن غور وفکر کی بار بار دعوت دیتا ہے لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی اثرات کو داخل نہ ہونے دیجیے۔ اللہ کی کتاب اس سے بہت بلند وبالا ہے۔" (ایضاً ص۵۷۳)

قصہ مختصر یہ کہ آپ پہلے سے ذہن میں کوئی تصور جما کر بعد میں قرآن کریم کے مطالعہ کو شرک سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے مفہوم القرآن کا تعارف ص ش پر اس بات کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے بعد اب درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے۔

پرویز صاحب کا شرک: "میں نے انسانی زندگی کے اہم مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لیا اور یونان کے فلاسفروں سے لے کر اس وقت تک ان کے متعلق مختلف ائمہ فکر نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا بغائر مطالعہ کیا۔ اس طرح ایک ایک مسئلہ کے متعلق انسانی فکر کے اہم گوشے میرے سامنے آگئے۔ اس کے بعد میں نے انسانی فکر کی اس اڑھائی ہزار سالہ کدوکاوش کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کیا (یا قرآن کا مطالعہ اس فکر کی روشنی میں کیا) قرآن کا اس طرح مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا ایک ایک دعویٰ زندہ حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ اس کے بعد میرے لیے زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق قرآن کی راہ نمائی کا تعین کرنا کچھ مشکل نہ رہا۔ مجھے قرآن کی صداقتوں کا جو یقین اس طرح حاصل ہوا وہ نہ زبان سے بیان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہو سکتا ہے نہ قلم سے ادا..... مدت سے میرا جی چاہتا تھا کہ جس انداز سے میں نے قرآن کو سمجھا ہے اس میں دوسرے ارباب ذوق و فکر کو بھی شریک کر سکوں۔ لیکن یہ مرحلہ بجائے خود بڑا ہمت طلب تھا۔" (انسان نے کیا سوچا؟ (پیش لفظ ص ص۵-۶)

اس اقتباس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

① پرویز صاحب پہلے اڑھائی ہزار سالہ دور کے فلاسفروں کی فکر کو اپنے ذہن میں راسخ فرما کر اس فکر کی روشنی میں قرآن کا یا قرآن کی روشنی میں اس فکر کا جائزہ لیتے ہیں۔ گویا قرآن کے مطالعہ سے پہلے بھی آپ کا ذہن عجمی افکار سے لدا ہوا تھا۔ قرآن کے مطالعہ کے بعد بھی وہی فکر غالب رہا۔ اس طرح کا مطالعہ پرویز صاحب کی اپنی تحریر کے مطابق شرک ہے۔

② پھر آپ پر اس انداز سے جو قرآنی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ اس میں وہ دوسروں کو بھی شریک فرمانا چاہتے ہیں۔ گویا آپ اس ہمت طلب مرحلہ پر قابو پا کر اپنے جیسے ارباب ذوق و فکر کو اس شرک میں شریک کرنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔

③ فلسفہ کے کسی بھی طالب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ان فلاسفروں میں زندگی کے اہم مسائل سے متعلق بے شمار اختلافات و تضادات موجود ہیں۔ لیکن پرویز صاحب اس مجموعہ تضادات کا جب قرآن کی روشنی میں یا قرآن کو ان افکار کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ تو ان افکار کو قرآن کے مطابق پاتے ہیں۔ اس سے آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ پرویز صاحب نے قرآن کا کس طرح گلا گھونٹا ہوگا۔ ہم بھی اس سلسلہ میں انشاء اللہ آپ کی مدد کریں گے۔

خالی الذہن ہونے کا پرویزی مطلب : پرویز صاحب کے درج بالا متفرق اقتباسات کو سامنے رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ جب پرویز صاحب خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ تو اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مطالعہ کے وقت آپ کا ذہن رسول اللہ ﷺ کی توضیح و تشریح، صحابہ کرام کے آثار و اقوال اور آئمہ سلف کی تشریحات سے یکسر خالی ہونا چاہیئے۔ بصورت دیگر نہ آپ خالی الذہن کہلا سکتے ہیں اور نہ ہی آپ میں وسعت قلبی یا کشادگی نگاہ پیدا ہو سکتی ہے۔ رہے پرانے زمانے کے یونانی فلاسفر یا موجودہ دور کے یہودی اور عیسائی آئمہ فکر تو ان کے افکار و نظریات کو ذہن میں راسخ کرنے کے باوجود بھی آپ خالی الذہن ہی رہیں گے۔ اور آپ کی وسعت قلبی اور کشادگی نگاہ کو کوئی آنچ نہیں آنے پائے گی آپ کے کرنے کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کے آئمہ فکر کی قرآن سے تائید مہیا کر لیا کیجیے۔

پرویز صاحب کے عجمی شیوخ

پرویز صاحب کے عجمی اساتذہ کرام کی فہرست بڑی طویل ہے جو اڑھائی ہزار سالہ دور پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اساتذہ کرام عموماً فلاسفر ہوتے ہیں یا پروفیسر، یہی لوگ آپ کے آئمہ فکر اور دانشور شیوخ ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

چھ سو سال قبل مسیح کے یونانی فلاسفروں سے لے کر موجودہ دور کے یورپی فلاسفروں اور پروفیسروں سب سے آپ نے استفادہ فرمایا ہے۔ آپ کی قرآنی بصیرت پر جس طرح یہ شیوخ اثر انداز ہوئے اس کا اندازہ آپ کے مختلف ادوار کے بیان کردہ تراجم اور مفاہیم قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

پرانے شیوخ : ان میں کچھ شیوخ تو ایسے ہیں جن سے پرویز صاحب کے اسلاف نے استفادہ فرمایا تھا۔ اور آپ نے اس استفادہ کو من وعن قبول فرمالیا ہے۔ مثلاً معتزلین نے یونانی استاد ارسطو کے نظریہ الٰہیات کو اپنا کر خدا کی تنزیہہ کے بہانے اس کے تجریدی تصور کو قبول کر لیا تھا۔ پھر اسی مسئلہ تقدیر میں انسان کو مختار مطلق بنا دیا پھر نتیجتاً معجزات سے بھی انکار لازم آیا۔ یہ تمام عقائد آج بھی معتزلین کے اخلاف میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اسی طرح ایک یورپی پروفیسر ڈارون سے متاثر ہو کر سرسید احمد خاں جب نظریہ ارتقاء پر ایمان لے آئے تو حضرت آدم کو ایک مخصوص فرد اور نبی تسلیم کرنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا آپ نے قصہ آدم وملائکہ اور ابلیس جو قرآن میں بیسیوں مقامات پر مذکور ہے۔ ایک فرضی اور تمثیلی داستان قرار دے دیا۔ اور پرویز صاحب نے سرسید کی تاویلات کو بہت پسند فرمایا اور اسی کی شرح وبسط میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی تصنیف "ابلیس وآدم" اسی غرض سے لکھی گئی۔

اب پرویز صاحب کی باری آئی تو یہ عجمی افکار کو قبول کرنے کے لحاظ سے اپنے اسلاف سے سبقت لے گئے۔ جب آپ کے ذہن پر ہیگل اور کارل مارکس جیسے یہودی فلاسفروں اور روسی ائمہ فکر کے افکار نے تسلط جما لیا۔ تو آپ نے اشتراکیت جیسے ملحدانہ نظام معیشت وسیاست کو قرآن کی رو سے درست ثابت کرنے کی کوشش میں "قرآنی نظام ربوبیت" تصنیف فرماڈالی۔ جس کا تفصیلی ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

چند نئے شیوخ اور ان کے افکار

پرویز صاحب کے نئے عجمی شیوخ میں سے ایک برگسان ہیں جن کا پرویزی افکار پر گہرا اثر ہوا ہے۔ جن دنوں آپ معارف القرآن تصنیف فرما رہے تھے تو سورہ ہود کی ایک آیت اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵۶:۱۱) کا ترجمہ یوں پیش فرمایا تھا۔ "بے شک میرا رب صراط مستقیم پر ہے" (م ۸۱۶:۴) غالباً اس کے بعد آپ نے برگسان کا مطالعہ کیا۔ جس نے (بزبان پرویز صاحب) یہ لکھا ہے کہ۔

برگسان کا نظریہ ارتقاء : "یہی وہ معاشرہ ہے جس کے متعلق برگسان نے کہا ہے کہ وہ ہر وقت آگے بھی بڑھتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا توازن بھی قائم رکھتا ہے (Creative Evolution) (نظام ربوبیت ص۲۵۹)

تو آپ نے اسی مندرجہ بالا آیت کے ترجمہ یا مفہوم کو یوں بیان فرمایا کہ:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"یعنی اللہ کا قانون ربوبیت توازن بدوش راہ پر جا رہا ہے اور جو معاشرہ اس قانون کی اتباع کرے گا اس میں بھی توازن قائم ہو جائے گا۔ (نظام ص۵)

اس ترجمہ یا مفہوم میں ایک بات تو آپ نے یہ دیکھ لی کہ برگسان کی فکر پرویز صاحب کی قرآنی فکر پر کس قدر اثر انداز ہوئی ہے دوسری بات جو قابل غور و فکر ہے وہ یہ ہے کہ پرویز صاحب خود خالص قرآنی دعوت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ اور قرآن کے ترجمہ یا مفہوم میں کسی طرح کا اضافہ برداشت نہیں کرتے۔ چنانچہ معارف القرآن کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگ اس واقعہ کو ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حشر کے روز مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ چار پرندوں کو لے کر اپنے ساتھ ملا لو (پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) ان کا ایک ایک حصہ چار پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر انہیں بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے تیری طرف آئیں گے" ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ ذبح شدہ پرندوں کو درست کر سکتا ہے۔ جب ہمارا ایمان یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ تو مردہ پرندوں کو زندہ کر دینا مستبعد کیوں ہو؟" لیکن قرآن کریم سے اس قسم کی تفسیر کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اول تو کہ اس کے لیے مندرجہ صدر ترجمہ میں قوسین کی عبارت کا اپنی طرف سے اضافہ کرنا ہوگا۔ یعنی پرندوں کو ذبح کر کے قیمہ کرنے کا واقعہ قرآن میں نہیں اسے اپنی طرف سے بڑھانا ہوگا" (م۲-۷)

پرویز صاحب کے اس اقتباس میں درج ذیل امور قابل غور ہیں۔

① پرویز صاحب کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے۔ لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ مندرجہ بالا ترجمہ میں آٹھ لفظوں کا قوسینی اضافہ آپ کو گوارا نہیں۔ لیکن جب آپ نے خود اسی آیت کا ترجمہ یا مفہوم (م ۳-۶۹) بیان فرمایا تو نو گنا اضافہ فرما لیا [1]

② پرویز صاحب ظاہری الفاظ پر محمول کرنے والے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے کیونکہ اس طرح معجزات سے انکار مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اسرار و رموز اور تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک وہی اسرار و رموز' اور تاویلات درست ہوتی ہیں جو وہ خود کریں۔ اور اگر یہی کام اپنی کسی غرض سے صوفیاء کر لیں تو آپ ان پر برس پڑتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے دین کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

③ آپ معجزہ کے وقوع کا زبانی اقرار تو فرما رہے ہیں۔ لیکن اس اقرار میں بھی انکار ہی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ آپ کو قیمہ کرنے پر کوئی قرینہ نظر نہیں آرہا۔ حالانکہ جزء کا لفظ ہی واضح قرینہ ہے۔

---

[1] ایسے اضافہ کی ایک مثال بطور نمونہ سورہ فاتحہ کا مفہوم ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

④ نظام ربوبیت والے ترجمہ پر مندرجہ ذیل سوالات کا جواب پرویز صاحب کے ذمہ ہے۔ (۱) ربی (میرے رب یا میرے پروردگار) کا ترجمہ اللہ کا قانون ربوبیت کیسے بن گیا؟ (۲) "جا رہا ہے" کون سے قرآنی لفظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے؟ (۳) اس پورے فقرہ "اور جو معاشرہ اس قانون کی اتباع کرے گا۔ اس میں بھی توازن قائم ہو جائے گا" کے لیے عربی کے کون سے الفاظ ہیں؟ (۴) یا اس اضافہ کے لیے کون سا قرینہ موجود ہے؟ اور کیا ان سب باتوں کے باوجود پرویز صاحب "خالص قرآن" ہی پیش فرما رہے ہیں؟

ہمارے نزدیک اب سب باتوں کا جواب یہی ہے کہ یہ باتیں قرآن میں قطعاً نہیں یہ باتیں دراصل برگسان کے اقتباس میں تھیں۔ جنہیں مولانا پرویز صاحب نے قبول فرما کر ان کو قرآن کے ذمہ لگا دیا ہے۔ برگسان" کا درج بالا اقتباس نقل کرنے کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"یہ معاشرہ آگے بڑھے گا۔ کیونکہ یہ اس خدا کی صفات کا مظہر ہوگا۔ جو خود صراط مستقیم پر جا رہا ہے۔" (نظام ربوبیت' ص۲۶۰)

اسی ایک سطر کی اقتباس میں دو باتیں آگئیں (۱) خدا کی صفات [1] کا مظہر معاشرہ اور (۲) معاشرہ کا صراط مستقیم پر آگے بڑھے جانا۔ سردست دوسری بات ہی زیر بحث ہے۔ اس اقتباس کے پہلے حصہ میں اللہ کا قانون ربوبیت توازن بدوش راہ پر جا رہا تھا۔ اب اس حصہ اقتباس کی رو سے خدائی صفات کا مظہر معاشرہ صراط مستقیم پر جا رہا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اللہ' قانون ربوبیت' اور اللہ کا قانون ربوبیت۔ نظام ربوبیت یہ سب اللہ ہی کے معنی ہیں اور پرویزی مفاہیم کی رو سے یہ سب الفاظ مترادفات میں شمار ہوتے ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مولانا پرویز صاحب کی اس قرآنی فکر کا ماخذ کیا ہے؟ یہ عقدہ وہ خود بھی حل فرما دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک عجمی استاد پروفیسر الیگزینڈر کے خطبات (Time, Space + Deity) کے حوالے سے استاد صاحب کا بیان یوں قلمبند فرماتے ہیں۔

الیگزینڈر کا نظریہ ارتقاء: "کائنات کی جو سطح ہو' خدا اس سے بلند ہوتا ہے۔ مثلاً جب کائنات جماد کی سطح پر تھی تو خدا نباتاتی سطح پر تھا اور جب کائنات حیوان کی سطح پر آگئی تو خدا انسان (یعنی شعور) کی سطح پر تھا۔ اب کائنات شعور کی سطح پر ہے تو خدا ملائکہ کی سطح پر ہے۔ اس طرح کائنات کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ خدا کی سطح بھی اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا پروفیسر الیگزینڈر کے نزدیک خدا اس پوری کائنات کا نام ہے جو کائنات کی سطح سے بلندی کی تلاش میں ہو۔ یہ بلند سطح الیگزینڈر کے نزدیک (Deity) کہلاتی ہے۔" (انسان نے کیا سوچا ص۲۲۲ حاشیہ)

---

[1] انسان کس طرح آہستہ آہستہ خدائی صفات کا مظہر بنتا جاتا ہے۔ اس تفصیل کے لیے قرآنی نظام ربوبیت کے انگریز مفکر باردیو کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اس عجمی امام کے اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

① اس وقت خدا ملائکہ کی سطح پر ہے۔ اور عنقریب کائنات یا معاشرہ بھی ملائکہ کی سطح پر پہنچ جائے گا۔ تو اتنی دیر میں خدا اور آگے بڑھ جائے گا۔ بالفاظ دیگر خدا کائنات سے ہمیشہ آگے آگے چلتا رہتا ہے۔ ملائکہ کی سطح سے آگے کون سی سطح ہوگی؟ یہ امام صاحب نے نہیں بتایا۔

② صراط مستقیم انسان (یعنی شعور کی سطح تک تو زمین پر ہی تھی۔ لیکن اب اوپر ملائکہ کی طرف جا رہی ہے۔ جہاں خدا پہنچ چکا ہے۔ ملائکہ غالباً بلندی پر ہوتے ہیں۔ خدا کے بلندی پر جانے کے لیے پرویز صاحب یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ وہ خدا ذی المعارج (بلندیوں کی طرف جانے والا ۷۰:۳) ہے اور اپنے توازن کو اس لیے برقرار رکھے گا (یہ غالباً صراط مستقیم ہی کی تشریح ہو رہی ہے۔ مولف) کہ اس کی صفات (اسماء حسنیٰ) پورا تناسب رکھے ہوئے ہیں۔" (نظام ص ۲۶۰) اور معاشرہ کے بلندیوں پر جانے کی دلیل یہ ہے کہ لترکبن طبقا عن طبق (۸۴:۱۹) تاکہ تم درجہ بدرجہ اوپر بڑھتے چلے جاؤ گے" (قرآنی فیصلے ص ۳۴۳) گویا پرویز صاحب نے اپنے استاد کے فکر کی قرآن کی بارگاہ سے سند مہیا فرما دی۔

③ جب تک خدا انسان (یعنی شعور) کی سطح تک نہ پہنچتا تھا۔ وہ بھی زمین پر ہی تھا۔ اس کے بعد ہی بلند ہوا۔ اور ملائکہ کی سطح پر جا پہنچا۔ دیکھئے اب معاشرہ اس ملائکہ کی سطح پر کب پہنچتا ہے؟

④ کائناتیں دراصل دو ہیں۔ کیونکہ استاد صاحب فرما رہے ہیں کہ "خدا اس پوری کائنات کا نام ہے جو کائنات کی سطح سے بلندی کی تلاش میں ہو" اب ہم پھر پہلے استاد برگسان کی طرف رجوع کریں گے تاکہ یہ خدا' انسان اور کائنات کا معمہ فلسفہ کی رو سے بھی حل کیا جا سکے۔ ہمارے مولانا پرویز صاحب برگسان کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"برگسان نے اس مقام پر قرآنی آیات کا لفظی ترجمہ پیش کر دیا ہے۔ جن میں انسانی زندگی کا مقصود رجعت الی اللہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال اس باب میں لکھتے ہیں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا منتہی خدا کی طرف ہے۔ یہ آیت قرآنی فکر کی بڑی گہرائیوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس حقیقت کی طرف یہ نص صریح اشارہ ہے کہ ارتقائے انسانیت کا رخ ستاروں کی طرف نہیں بلکہ لامنتہیٰ کائناتی حیات اور دنیائے روح کی طرف ہے' (انسان نے کیا سوچا ص ۲۹۲)۔

برگسان کے اسی فکر کو نظام ربوبیت کے ص ۷۳ پر بھی بیان کر کے اس کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ۔

" وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳:۴۰) (یقیناً اس سلسلہ ارتقاء کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے) یہ ہیں نفس انسانی کے ارتقائی منازل اور یہ ہے اس کا مقصود و منتہیٰ" (نظام ص ۷۳)

برگسان اور الیگزینڈر کے نظریات کا تضاد: اب دیکھئے کہ پروفیسر الیگزینڈر کی فکر کی رو سے خدا ہمیشہ کائنات یا معاشرہ سے آگے آگے چلتا رہتا ہے اور برگسان کے نظریہ کے مطابق خدا کائنات یا معاشرے کا مقصود و منتہی ہے۔ یعنی یہ معاشرہ یا کائنات خدا تک پہنچ سکتا ہے تو اب ان دونوں اماموں کے نظریات میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تضاد واقع ہو گیا ہے۔ اس تضاد کو دور کرنے کی درج ذیل صورتیں ہی ممکن ہیں۔ یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ پروفیسر الیگزنڈر کے نظریہ کے علی الرغم۔

(الف) خدا کبھی کبھی ساکن ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کا انتظار کرنے لگتا ہے تاکہ وہ اس تک پہنچ سکے۔

(ب) اور اگر خدا کے بارے میں سکون محال ہو تو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کبھی کبھی پیچھے کی طرف بھی چل پڑتا ہے۔ تاکہ معاشرہ اس سے مل سکے۔ یا

(ج) خدا ایک ہی جگہ حرکت کرتا رہے۔ یعنی مارک ٹائم کرتا رہے۔

(د) یا یہ کہ خدا کچھ مدت کے لیے دوری حرکت کرنے لگ جائے۔ یعنی اپنے ہی گرد خود گھومنے لگ جائے۔ تاکہ پیچھے سے یا نیچے سے آنے والی کائنات اسے مل سکے اور جب کائنات خدا سے مل جائے تو خدا آگے بڑھنے والی حرکت اختیار کر کے نہایت تیزی سے کائنات سے آگے نکل جائے۔

ان چاروں صورتوں میں سے قابل ترجیح صورت تو وہی ہو سکتی ہے جسے پرویز صاحب پسند فرمائیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ چوتھی صورت پرویز صاحب کو قابل قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ جب وہ زندگی کی بھی دوری حرکت کے قائل نہیں تو خدا کے حق میں دوری حرکت کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ وہ قرآن کی رو سے فرماتے ہیں کہ:

"قرآن سے پہلے ذہن انسانی زندگی کی دوری حرکت کا قائل تھا۔ جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (Dynomic) تصور پیش کر کے یہ بتایا کہ حیات کسی چکر (Cycle) میں گردش نہیں کر رہی۔ بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ صراط مستقیم سے اس غلط فلسفہ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال ہو گیا اور اس سے صحیح مقصود حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۴۲)۔

باقی رہ گئیں تین صورتیں یعنی ایک یہ کہ خدا کو کسی وقت ساکن قرار دیا جائے' دوسرے اگر حرکت بھی ضروری ہو تو کچھ وقت کے لیے مارک ٹائم کرے اور یا رجعت قہقری کرے تب تو برگسان والے قرآن کے ترجمہ والی بات ممکن ہو سکتی ہے۔ ورنہ پروفیسر الیگزینڈر تو اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی والی بات نہیں مانتے وہ تو خدا کو کائنات سے ہمیشہ آگے آگے ہی چلاتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے آپ کے صرف دو اساتذہ کرام کا ذکر کیا تو ان میں شدید اختلاف اور تضاد واقع ہو گیا۔ اب اس تضاد یا اختلاف کے متعلق بھی پرویز صاحب ہی کا فیصلہ سن لیجیے۔ آپ فرماتے ہیں۔

اختلافات کے متعلق پرویز صاحب کا فیصلہ: سب سے پہلے اس حقیت کو پیش نظر رکھیے کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے۔ کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو اس کی تعلیم میں بہت اختلاف ہوتا۔ (۴:۸۳) (نظام ربوبیت ص ۳۲۷)

اب دیکھئے جب دو باتوں یا نظریات میں تضاد اور اختلاف ہو تو ان میں سے ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

یہ بھی ممکن ہے دونوں ہی غلط ہوں۔ صحیح ایک بھی نہ ہو۔ لیکن ہمارے مولانا پرویز صاحب ان دونوں متضاد نظریات کی تائید میں قرآن پیش فرما کر گویا قرآن میں اختلاف ثابت کر رہے ہیں۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ:

"معنوی اختلافات جو مفسرین اور فقہاء نے پیدا کیے ہیں ان اختلافات کا ذمہ دار قرآن مبین نہیں ہے۔ بلکہ فرقہ بند مفسرین اور فقہاء خود ہیں۔ ہر مفسر وفقیہہ نے اپنے مسلک کے مطابق کھینچ تان کی ہے۔ سارے معنوی اختلافات کی ذمہ داری مفسرین اور فقہاء کی فرقہ بندی پر ہے۔ قرآن مبین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔" (م۔ ح ج ۲ ص ۲۶۷)

کتنی معقول بات کہی ہے پرویز صاحب نے کہ فقہاء اور مفسرین کے اختلافات کا ذمہ دار قرآن نہیں ہے اسی حوالے سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ عجمی فلاسفروں کے افکار سے متاثر ہو کر ان افکار کو قرآن کے واسطہ سے امت میں پھیلا کر جو اختلاف وانتشار پیدا فرما رہے ہیں اس کا ذمہ دار قرآن مبین کو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

اب ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ جب پرویز صاحب معارف القرآن کی دوسری جلد لکھ رہے تھے تو سورہ سجدہ کی درج ذیل آیت يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۵:۳۲) کا ترجمہ یوں لکھا۔ "(اور دیکھو) وہ (ہر) امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے پھر (ہر) امر اسی کے حضور میں پہنچ جائے گا۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار برس ہوگی۔ (م ۲-۱۷۹)

مندرجہ بالا ترجمہ میں پرویز صاحب نے یعرج الیہ کا ترجمہ "اس کی طرف چڑھتا ہے" کے بجائے۔ "اس کے حضور پہنچ جائے گا" اس لیے کیا ہے کہ آپ معتزلہ کی تقلید میں استواء علی العرش کے منکر ہیں۔ اس ایک بات کے علاوہ یہ ترجمہ گوارا ہے اگرچہ بریکٹوں میں دو جگہ "ہر" کا اضافہ بھی بے جا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کسی وقت ارتقاء سے متعلق کسی عجمی استاد کا مقالہ پڑھا جسے آپ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

<u>پروفیسر مارگن کا نظریہ ارتقاء</u> : پروفیسر مارگن (C.Liod Morgan) نے "ارتقائے نفس" کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ لکھا ہے جس کے آخر میں وہ رقم طراز ہیں کہ..... "میں ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی خدائی عالمیت (Devine Egency) کا ہی مظاہرہ ہے اور چونکہ اس ارتقاء میں نفس انسانی بلند ترین مقام پر ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفس انسانی اس نفس اعلیٰ کی عالمیت کا آئینہ ہے۔" (معارف القرآن ص ۲۱۶-۲۱۷)

اس کے بعد جب آپ نے سورہ سجدہ کی اسی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم بیان فرمایا تو اس طرح فرمایا:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"وہ (اللہ) آسمان (کی بلندیوں) سے زمین (کی پستیوں) کی طرف ایک امر (اسکیم) کی تدبیر کرتا ہے جو اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی ہے۔ ایسے مدارج جن کا عرصہ تمہارے حساب وشمار سے ہزار برس کا ہو۔ (م ۳۔ ۵۳۴)

اس کے بعد اس آیت کا ترجمہ یوں فرمایا:

"اللہ اپنے امر (سکیم) کی ابتدا آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔" پھر اس کے بعد اسی نظام ربوبیت کے ص ۶ پر اسی آیت کا مفہوم یہ بیان فرمایا: "اللہ اپنی اسکیم کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے یعنی اس شے کا آغاز خدا کے مرتب کردہ نقشے کے مطابق سب سے پست نقطہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانون ربوبیت کے مطابق اوپر ابھرنی شروع ہو جاتی ہے۔" (نظام ص ۶)

اب دیکھئے (۱) چونکہ پروفیسر مارگن نے ارتقاء کے سلسلہ میں اسکیم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ لہٰذا ہمارے مولانا پرویز صاحب نے پہلے تو امر کا معنی قوسین میں ہمیں اسکیم سمجھایا۔ بعدہ قوسین کی ضرورت بھی نہ رہی۔ گویا امر کا صحیح ترجمہ اسکیم ہی ہوتا ہے۔

(۲) پرویز صاحب نے پہلے (دو تراجم) میں قوسین میں "تدریجی یا (ارتقائی) مراحل طے کرتی ہوئی" کے الفاظ درج کیے ہیں۔ یہ ان کا اپنا یا ان کے عجمی شیوخ کا ذہن تو ہو سکتا ہے۔ قرآن نے نہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا ہے نہ اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہے۔ تیسرے ترجمہ میں قوسین کا سہارا بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور "قانون ربوبیت" کے مطابق کا اضافہ اس طرح کیا گیا ہے گویا یہ بھی قرآنی الفاظ ہی کا ترجمہ ہے۔

(۳) پہلے اور دوسرے ترجمہ کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر اور ابتداء مترادف الفاظ ہیں۔ اور تیسرا ترجمہ تو خالص تضادات کا مجموعہ ہے یعنی۔

"اللہ اپنی اسکیم کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ یعنی اس کا آغاز خدا کے مرتب کردہ نقشے کے مطابق سب سے پست نقطہ سے ہوتا ہے۔ اب جب تدبیر اور ابتداء یا آغاز ہم معنی قرار پا گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان کا معنی سب سے پست نقطہ ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ قلندرانہ بات جس کے متعلق پرویز صاحب فرمایا کرتے ہیں۔

زبروں در گزشتم زدروں خانہ گفتم　　سخنے نگفتہ راچہ قلندرانہ گفتم

اور اس کے بعد پرویز صاحب کی یہ دردمندانہ اپیل بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

"میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے سرسری نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے اور سوچئے کہ میں نے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے یا نہیں۔" (نظام ربوبیت تعارف ص ۲۸)

بات بہت لمبی ہو گئی حالانکہ ابھی تک صرف آپ کے دو تین اساتذہ کرام کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ وہ پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت پر کس حد تک چھا گئے ہیں۔ جب کہ آپ کے ایسے عجمی شیوخ ہزاروں نہیں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تو سینکڑوں ضرور ہیں۔ ایسے تو ان اساتذہ کا ذکر خیر آپ کی ہر تصنیف میں مل جاتا ہے۔ تاہم آپ کی تصانیف انسان نے کیا سوچا۔ اور نظام ربوبیت اس سلسلہ میں بھرپور معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔

سورہ فاتحہ کا مفہوم : اسی طرح ابھی تک ہم نے صرف دو آیات پر پرویز صاحب کے عجمی شیوخ کی اثر اندازی کا ذکر آیا ہے۔ جب کہ قرآن میں ساڑھے چھ ہزار سے بھی زائد آیات ہیں۔ اب اس اثر پذیری کے بعد موصوف قرآن کا مفہوم جس طرح بتایا کرتے ہیں۔ اس کے نمونہ کے طور پر ہم مفہوم القرآن سے سورہ فاتحہ کا مفہوم درج کر رہے ہیں۔

﴿ الحمد للّٰہ رب العالمین ﴾

"زندگی کا ہر حسین نقشہ اور کائنات کا ہر تعمیری گوشہ خالق کائنات کے عظیم القدر نظام ربوبیت کی ایسی زندہ شہادت ہے جو ہر چشم بصیرت سے بے ساختہ داد تحسین لے لیتی ہے۔

﴿ الرحمٰن الرحیم ﴾

وہ نظام جو تمام اشیائے کائنات اور عالمگیر انسانیت کو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سے تکمیل تک لیے جا رہا ہے۔ عام حالات میں بتدریج اور ہنگامی صورتوں میں انقلابی تغیر کے ذریعے۔

﴿ مالک یوم الدین ﴾

انسان کو یہ تمام سامان نشوونما بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشوونما اور اس کے مدارج کا تعین اس کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ جن کے نتائج خدا کے اس قانون مکافات کی رو سے مرتب ہوتے ہیں۔ جس پر اسے کامل اقتدار حاصل ہے۔

﴿ ایاک نعبد و ایاک نستعین ﴾

اے عالمگیر انسانیت کے نشوونما دینے والے! ہم تیرے اسی قانون عدل و ربوبیت کو اپنا ضابطہ حیات بناتے اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی بھرپور اور متناسب نشوونما کر سکیں اور پھر انہیں تیرے ہی بتائے ہوئے طریق کے مطابق صرف کریں۔

﴿ اھدنا الصراط المستقیم ﴾

ہماری آرزو یہ ہے کہ یہ پروگرام اور طریق جو انسانی زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جائے گی سیدھی اور متوازی راہ ہے۔ نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے آجائے۔

﴿ صراط الذین انعمت علیھم ﴾

یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر پچھلی تاریخ میں سعادت مند جماعتیں زندگی کی شادابی و خوشگواری، سرفرازی و سربلندی اور سامان زیست کی کشادگی و فراوانی سے بہرہ یاب ہوئی تھی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

﴿ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین ﴾

اور ان کا انجام سوختہ بخت اقوام جیسا نہیں ہوتا تھا۔ جو اپنے انسانیت سوز جرائم کی وجہ سے یکسر تباہ اور برباد ہو گئیں۔ یا جو زندگی کے صحیح راستہ سے بھٹک کر اپنی کوششوں کو نتائج بدوش نہ بنا سکیں اور اس طرح ان کا کارواں حیات' ان قیاس آرائیوں کے سراب اور توہم پرستیوں کے پیچ وخم میں کھو کر رہ گیا۔"

یہ ہے وہ قرآنی مفہوم جسے پرویز صاحب نے تو صحیح طور پر سمجھا ہے۔ لیکن کسی بھی عربی دان کے لیے پرویزی مفہوم کے اس ملغوبہ سے کسی بھی قرآنی لفظ کا ترجمہ برآمد کرنا ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔

مزید دو آیات کا ارتقائی مفہوم: اب ہم صرف دو آیات مزید' انکا ابتدائی ترجمہ' اسکے بعد اسی آیت کا بتدریج ارتقائی ترجمہ یا مفہوم آمنے سامنے رکھ کر پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ آپ بھی قرآنی مفہوم کی تبدیلی کی رفتار یا آپکی قرآنی بصیرت کے ارتقاء کی رفتار معلوم کر سکیں اور یہ بات تو آپ غالبا سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ایسی تبدیلیاں کسی عجمی امام کے فکر کی اثر پذیری کے بعد ہی واقع ہوا کرتی ہے پہلی آیت یہ ہے۔

آیت	پرویز صاحب کا ابتدائی ترجمہ	ارتقائی مفہوم
الشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا (۲:۲۶۸)	شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور برائیوں کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن اللہ تمہیں ایسی چیزوں کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جس میں اس کی مغفرت اور فضل وکرم کا وعدہ ہے۔ (معارف ۲۔۱۱۷)	ابلیسی معاشرہ تمہیں ہر وقت احتیاج سے ڈراتا رہتا ہے اور اس ڈر کی بنا پر بخل پر اکساتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس نظام ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ (نظام ص ۱۷۵)

اب ذرا لغوی معنی کا ارتقاء بھی ملاحظہ فرمائیے:

قرآنی لفظ	عام لغوی معنی	پرویزی معنی نمبر۱	پرویزی معنی نمبر۲	تبصرہ
الشیطن	شیطان	شیطان	ابلیسی معاشرہ	(۱) گویا یہ ابلیسی معاشرہ ہی تھا۔ جس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا تھا
یعدکم	تمہیں وعدہ دیتا ہے	تمہیں ڈراتا ہے	ڈراتا رہتا ہے	(۲) وعدہ دیتا ہے ڈراتا ہے۔ یقین دلاتا ہے۔ ضمانت دیتا ہے یہ سب مترادفات ہیں اسی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

طرح دوسرے پرویزی مترادفات ملاحظہ فرمالیجیے

یامرکُمْ	تمہیں حکم دیتا ہے	ترغیب دیتا ہے	اکساتا رہتا ہے
فحشاء	بے حیائی	برائیاں	بخل

(۳) پہلا ترجمہ بھی خالص قرآن ہے اور دوسرا بھی۔ اگرچہ ان دونوں تراجم میں بڑا فرق ہے۔ تاہم یہ دونوں ہی خالص ہیں۔

اللّٰہ	اللہ	اللہ	نظام ربوبیت
یعدکُمْ	تمہیں وعدہ دیتا ہے	دعوت دیتا ہے	یقین دلاتا ہے
			ضمانت دیتا ہے
مغفرۃ	بخشش	مغفرت	پوری پوری حفاظت
فضلا	فضل	فضل وکرم	رزق کی فراوانیاں

اور دوسری آیت یہ ہے:

آیت	پرویزی مفہوم ۱	مفہوم ۲	مفہوم ۳
الیہ یصعد الکَلِمُ الطیبُ والْعَمَلُ الصَّالح یَرفعُہٗ وَالَّذِیْنَ یمکرونَ السَّیات (۳۵:۱۰)	اچھا کلام اس کی طرف پہنچتا ہے اور اچھا کام اس کو بلند کرتا ہے اور جو لوگ بری تدبیریں کر رہے ہیں (م ۲:۸۰) مطابق ہر شے ہمواریاں اور توازن پیدا کرنے والے پروگرام کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نقطہ تکمیل کی طرف عروج کرتی چلی جاتی ہے	ہر خوشگوار نقشہ (یا نظریہ) قانون ربوبیت کے مطابق اس کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی یہ بلندی پروازی عمل صالح کے سہارے پر ہوتی ہے۔ یعنی قانون ربوبیت کے مطابق ہر شے ہمواریاں اور توازن پیدا کرنے والے پروگرام کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نقطہ تکمیل کی طرف عروج کرتی چلی جاتی ہے	یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی سمت ہر وہ نظریہ جو زندگی میں خوشگواریاں پیدا کرنے کا موجب ہے ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی یہ ترقی ہموار جدوجہد کے سہارے ہوتی ہے جو لوگ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لیے خفیہ تدابیر کرتے ہیں۔ (نظام ص ۲۴۸)

اس آیت کا بھی پہلا ترجمہ بہت حد تک درست ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں خالص قرآن کے نام پر قرآنی مفہوم میں جو کچھ حشو وزوائد بھر دیئے گئے ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہیں۔ پرویز صاحب کا ذہن تو عجمی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

تصورات وافکار کی آماجگاہ بنا ہی تھا۔ انہوں نے قرآن کو وہی کچھ بنا دیا جو کچھ آپ کا ذہن تھا اس موقعہ پر ایک دفعہ پھران کے اس قول کو دہراتے جایئے۔

"قرآن غور وفکر کی بار بار دعوت دیتا ہے لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی اثرات کو داخل نہ ہونے دیجیے۔ اللہ کی کتاب اس سے بہت بلند وبالا ہے۔" (م۔ ۳:۵۷۳)

مذہب سے دین تک کا ارتقائی عمل

اب ہم ایک نئے زاویے سے پرویز صاحب کے فکری ارتقاء کا جائزہ لیں گے۔ آپ کائنات کی ہر چیز میں ارتقاء کو لازمی سمجھتے ہیں حتیٰ کہ انسان کو بھی ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس عقیدہ کا اثر آپ کی ذات پر یہ ہوا کہ آپ کے افکار میں بھی زندگی بھر ارتقائی عمل جاری رہا ہے جس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ آپ ۱۹۴۵ء تک باذہب مسلمان تھے۔ اس دور کے چند اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

① "سائنس فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے اور مذہب یہ سکھاتا ہے کہ ان قوتوں کے ماحصل کو صرف کس طرح کرنا چاہیئے..... لہٰذا مذہب سائنس کی کاوشوں کی قدر کرے گا۔" (انسان نے کیا سوچا؟ ص۲۲۶)۔

② اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا۔ جہاں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں عالمگیر مذہب یعنی دین ہونے کی اہلیت کس میں ہے۔" (م۔ ۲:۲۰۷)

③ "چنانچہ ان مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے اور اسلام کے علاوہ اور کونسا مذہب ہے جس میں ایسا نہیں ہوا "اس عقدہ کے حل میں عجیب وغریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا ہے۔" (م۔ ۱۶)

④ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھیے کہ مذہب کا یہ نظام (یعنی عالمگیر صداقتوں پر متشکل عملی اسلوب) جسم نامی کی طرح بڑھتا رہا ہے۔" (م۔ ۲:۲۴۶)

⑤ "مسلمان یہ آزادی ہر ایک کو دیں گے۔ لیکن ان کے نزدیک مذہبی آزادی یہیں تک محدود نہیں۔ یہ تو ان کے مذہب کا ایک گوشہ ہے ان کے مذہب کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں محیط ہے۔ اس لیے ان کے ایمان کے مطابق مذہبی آزادی سے مفہوم نظام مملکت کی آزادی ہے۔ یہی ان کا دین ہے۔" (م۔ ۴:۲۴۶)

⑥ یہ سامی نسل ہی ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نوع انسانی کا مذہب مرتب کیا۔ تاریخی حدود سے کہیں آگے۔ دنیاوی خباثتوں اور آلودگیوں سے پاک اور صاف اپنے خیموں میں بیٹھے ان بدوی مصلحین نے نسل انسانی کے لیے مذہب کی تدوین کی۔" (م۔ ۲:۳۳۸)

⑦ "ہم نے بتایا ہے کہ مذہب سے انسانی سیرت میں بلندی اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔" (م ۲۔۲۷۵)۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑧ "یورپ کے ارباب فکر و نظر قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدت افکار (ایمان ومذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔" (م-۲:۳۶۸)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے پہل پرویز صاحب مذہب اور دین کو مترادفات کے طور پر استعمال فرمایا کرتے تھے اور یہ تک کہنے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو بذریعہ وحی آسمان سے نازل ہوا ہے۔

دوسرا دور۔ لفظ مذہب سے بیزاری کا اظہار

پر جب آپ نے ۱۹۵۲ء میں اسباب زوال امت تالیف کی تو مذہب اور دین کے مفہوم کو بالکل جدا جدا بیان فرمایا اور ان کو مختلف بلکہ متضاد اشیاء کے طور پر پیش فرمایا۔ چنانچہ اس کتاب کے ص ۵۵ پر تحریر فرمایا:

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں مذہب اور دین کے الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن مذہب نہیں لایا تھا۔ حتیٰ کہ مذہب کا لفظ بھی [1] غیر قرآنی ہے' سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب نظام دین مفقود ہو گیا۔ آج ہمارے پاس مذہب ہے دین نہیں۔ لہٰذا میری تحریروں میں جہاں مذہب کا لفظ آئے۔ اس سے یہی مفہوم ہوگا میں اسلام کو دین کہہ کر پکارتا ہوں (کہ قرآن نے اسے دین کہا ہے) اسے مذہب نہیں کہتا۔

غور فرمایئے مولانا پرویز صاحب کس ڈھٹائی سے سفید جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے آٹھ عدد اقتباسات اسی لیے پہلے درج کر دیئے ہیں کہ آپ کے اس بیان کی صداقت کی قلعی کھل جائے۔ اپنی سابقہ تحریروں کے بعد زوال امت کے ایک پیرا میں جن سات امور کے متعلق آپ نے کذب بیانی سے کام لیا ہے۔ ہم نے ان پر مسلسل نمبر لگا دیئے ہیں۔

اب ہم مختصراً یہ دیکھیں گے کہ جناب پرویز صاحب پر دین اور مذہب کی کن کن باتوں کا فرق منکشف ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ دین سے کیا کیا کچھ مراد لیتے ہیں اور مذہب سے کیا؟ پورا اقتباس درج کرنے کے بجائے اب ہم صرف مفہوم اور حوالہ ہی درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔

---

[1] مذہب کا لفظ تو واقعی غیر قرآنی ہے۔ البتہ نظام اور نظام ربوبیت کے الفاظ شاید قرآنی ہی ہوں۔ جبھی تو ادارہ طلوع اسلام اور ماہنامہ طلوع اسلام اس نظام ربوبیت کے پیامبر بنے ہوئے ہیں۔ نظام اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے ایسا مردود لفظ ہے کہ اس کے مادہ ن۔ ظ۔ م سے کوئی مشتق لفظ بھی قرآن نے استعمال نہیں کیا۔ مگر پرویز صاحب کے ہاں یہ لفظ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

① مذہب یا دھرم سے مفہوم ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان تعلق۔ پرائیویٹ عقیدہ (م۴۔۴۱۷)	① قرآن کا لایا ہوا دین (عملی نظام) مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا۔" (زوال امت ص۸۹) گویا دین بمعنی عملی نظام اور
② مذہب= دین ۔ نظام مملکت (م۴۔۴۲۰)	② دین = مذہب + ملوکیت (حوالہ ایضاً)
③ مذہب ضابطہ اخلاق پیش کرتا ہے (زوال-۸۸)	③ دین نظام خلق (متوازن نظام) پیش کرتا ہے۔" (زوال ص۸۸ گویا دین= نظام خلق= متوازن نظام
④ مذہب = رہبانیت (م۴۔۴۲۰)	④ دین = مذہب + سیاست (م۴۔۴۳۱)
⑤ قانون بلا قوت (م۴۔ ۴۳۴)	⑤ دین = آخرت + دنیا (زوال ص۹۱)
⑥ مذہب = دین ۔ قوت (م۴۔۴۳۶)	⑥ دین = مذہب + حکومت (زوال ص ۹۳)
⑦ مذہب = دین ۔ دنیا (م۴۔۴۸۶)	⑦ دین = مذہب + نظام مملکت (م۴:۴۲۰)

اس تبدیلی نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام مملکت حکومت' سیاست' دنیا' ملوکیت اور قوت پرویز صاحب کے نزدیک یہ سب ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو بھی غنیمت تھا۔ مگر پرویز صاحب تو یہ بھی فرما رہے ہیں کہ:

1 "نظام انسانیت کی سب سے مہیب لعنتیں کیا ہیں؟ ملوکیت' برہمنیت اور استعماریت" (م۲۔۶۹)

2 مذہب خود تاریکی ہے۔ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے؟" (زوال امت ص۱۰۴)

اب دیکھئے دین = مذہب + ملوکیت اب دونوں اقتباسات کی رو سے یہ مساوات یوں بنے گی۔

دین = تاریکی + لعنت (لاحول ولا قوۃ)

پھر پہلے اقتباسات میں پرویز صاحب مذہب کو وحی قرار دے چکے ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اب اگر مذہب کو تاریکی ہی تاریکی سمجھا جائے تو پرویزی اقتباسات کی رو سے قرآن سے روشنی کیسے مل سکتی ہے؟ وہ تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔

دراصل پرویز صاحب میں دو خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو انہیں قرآنی الفاظ کی ضرورت سے زیادہ اور مختلف اوقات میں مختلف معانی ومفاہیم بیان کرنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ دوسرے جو کچھ وہ پہلے لکھ چکے ہوتے ہیں اسے یاد رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یا بسیار دروغ گوئی نے ان کے حافظہ کو کمزور کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں اختلاف اور تضاد بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور اُن کے اپنے پیش کردہ اصول کے مطابق یہی اختلاف ان کی تحریروں کو باطل قرار دینے کی معقول وجہ بن جاتا ہے۔ بہرحال ان کا بیان کردہ مفہوم قرآنی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ارض وسماء کے معانی میں تدریجی ارتقاء

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ آپ کے فکری ارتقاء کا ایک اور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ آپ قرآنی الفاظ کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ ہم صرف الفاظ کے معانی اور ان کے حوالہ جات پر اکتفا کریں گے۔ کیونکہ یہ بحث پہلے ہی خاصی طویل ہو گئی ہے۔

①	سماء بمعنی آسمان	(م ۲:۱۷۹)	
②	" " بلندی	(نظام:۱۱)	
③	" " آسمان کی بلندیاں	(م ۳:۵۳۴)	
④	" " ابتداء یا انتہائی پست نقطہ	(نظام ۶) (م ۲:۶)	
⑤	" " حد نگاہ		
⑥	" " سماوی کُرے۔ اجرام سماوی یا فلکی	(م ۳:۵۳۴)	
⑦	" " کائنات کی بلندیاں	(نظام ۴'۱۲-۱۳-۴۸)	
⑧	" " خدا کا کائناتی قانون	(نظام : ۸۶)	
⑨	" " عمرانی زندگی	(" : ۱۱۸)	
⑩	" " آفاقی دنیا	(" : ۲۴۹)	
⑪	" " خارجی کائنات	(" : ۲۸۱)	
⑫	" " کائناتی قانون	(" : ۲۸۲)	
⑬	" " کائناتی نظام	(" : ۲۸۵)	
⑭	" " نظام ربوبیت	(" : ۲۸۷)	
⑮	" " معاشرہ	(" : ۲۸۷)	

①	ارض بمعنی زمین	(م ۲:۱۷۹)	
②	" " پستیاں	(م ۲:۲) (۲۱۹:۳)	
③	" " زمین کی پستیاں	(م ۳:۵۳۴)	
④	" " کائنات کی پستیاں	(نظام ۴'۱۲-۱۳-۴۸)	
⑤	" " معاشی زندگی	] (نظام:۸۶)	
⑥	" " وسائل پیداوار		
⑦	" " معاشی پروگرام	(نظام : ۱۱۶)	
⑧	" " معاشرہ	(" : ۱۱۹)	
⑨	" " دنیا	(" : ۲۴۵)	
⑩	" " معاشی پیداوار کا ذریعہ	(" : ۲۴۵)	
⑪	" " معاشی مفاد پرستیاں	(" : ۲۳۳)	
⑫	" " معاشی دنیا	(" : ۲۴۹)	
⑬	" " تمدنی زندگی	(" :	
⑭	" " تمدنی اور معاشی زندگی	(" : ۲۸۱)	
⑮	" " تمدنی اور معاشی دنیا	(" : ۲۸۲)	
⑯	" " معاشی نظام انسانیت	(" : ۲۸۵)	

اور اگر سماوات اور ارض دونوں الفاظ کا یک جا مفہوم بتانا ہو وہ ہوگا۔ صرف "نظام" (نظام- ۲۸۵) اور انہی دونوں الفاظ کا تفصیلی معنی ہے "کائناتی نظام"

اب بتایئے جس شخص کی تحریروں میں ایک ہی قرآنی لفظ کے اس قدر مختلف اور متضاد مفاہیم بیان کیے گئے ہوں اور ایسے مفاہیم کسی عربی لغت سے ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکتے ہوں تو کیا اس کی تحریروں پر کچھ بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک پرویزی افکار کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ان کی تحریروں کا یہی اختلاف ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: پنجم

داعیٔ اِنقلاب کا ذاتی کردار

ایک گھریلو شہادت

داعیٔ انقلاب کی دعوت کی کامیابی کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ جس بات کی طرف وہ دعوت دیتا ہے اس پر وہ خود بھی دل سے یقین رکھتا ہو۔ جو بات دل سے اٹھتی ہے انسان اس پر عمل پیرا ہو کر اس کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک داعی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے۔ سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے لوگوں کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کرے۔ انبیائے کرام کا یہی طریق کار رہا ہے۔ اور انبیاء کے علاوہ دوسرے داعیان کے لیے بھی یہ بات اتنی ہی ضروری ہوتی ہے۔ جتنی انبیاء کے لیے فرق صرف یہ ہے کہ انبیاء کی زندگی دعوت سے پہلے بھی بے لوث اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے داعیان کی دعوت سے پہلے کی زندگی قابل مواخذہ نہیں سمجھی جاتی۔ پھر اگر داعی کی دعوت میں خلوص اور ایثار ہو تو لوگ اس کی دعوت پر لبیک کہتے اور اس دعوت میں اس کے شریک کار بن جاتے ہیں۔ یہی لوگ جو سب سے پہلے داعی کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصائب اور سختیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس دوران جب وہ دعوت انقلاب کی حقانیت کے ساتھ ساتھ داعی کا بلند کردار اور مشفقانہ سلوک دیکھتے ہیں تو اس داعی پر ان کا ایمان ویقین پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کی بناء پر وہ ہر طرح کے مصائب وآلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ اس تحریک کا ابتدائی اور نہایت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے ایسے ہی ساتھیوں کو قرآن کریم نے السابقونَ السابقون اور السابقونَ الاَوَّلُوْن کے معزز القاب سے پکارا ہے۔ اور ان کا درجہ جماعت میں سب سے بلند ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس اگر داعی انقلاب خلوص سے عاری یا مفاد پرست ہو یعنی اس کے قول وفعل میں تضاد واقع ہو تو اس کی دعوت کی حقیقت محض ایک پروپیگنڈہ کی حیثیت سی رہ جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی ساتھی جوں جوں صحیح صورت حال سے واقفیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ چھٹتے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ کچھ اور ناآشنا لوگ اس جماعت میں شامل ہو کر ان کی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے۔ تا آنکہ اس دعوت کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کے امکانات کم ہی رہ جاتے ہیں۔

اب ہم انہیں اصولوں پر ادارہ طلوع اسلام کے قائد اور اس کی دعوت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے کسی پر کوئی الزام نہیں دینا چاہتے۔ بلکہ بزم طلوع اسلام ہی کے ایک معزز رکن جناب محمد علی خاں بلوچ بی۔ اے (آنرز) جو شاید تحریک کا قریبی مطالعہ کرنے کے بعد کچھ دل برداشتہ نظر آتے ہیں۔ کی زبانی ان کے تالیف کردہ پمفلٹ "حدیث دلگدازے" سے کچھ اقتباس پیش کریں گے۔

۱۔ السابقون الاوّلون پر کیا بیتی؟

"لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر انتہائی المناک اور تاسف انگیز ہے کہ باوجودیکہ قرآن کی یہ تحریک وقت کی اپنی پکار ہے۔ اور اس پکار کا خود اپنا زور دروں بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہونا چاہیئے اور باوجودیکہ مخلص' ایثار پیشہ اور تجربہ کار کارکنوں اور فنڈز اور سرمایہ کی اعانت بھی اسے پوری طرح حاصل رہی ہے۔ مگر تحریک آگے بڑھنے کے بجائے برابر ناکامیوں کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو کارکن جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں تحریک سے ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی جگہ کچھ نئے لوگ آجاتے ہیں۔ لیکن جب وہ پرانے ہونے لگتے ہیں تو وہ بھی تحریک کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ صورت حال جتنی المناک اور تاسف انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ مخلص کارکنوں کے لیے لائق غور و فکر بھی ہے"

طلوع اسلام کی بڑی بڑی شخصیتیں: "میرے سامنے اس وقت وہ طویل فہرست ہے جس میں ان بڑی بڑی شخصیتوں کے نام گنائے گئے ہیں۔ جو ایک زمانہ میں تحریک کے روح رواں رہ چکے ہیں۔ اس میں اس شخصیت کا اسم گرامی بھی ہے جو طلوع اسلام کی ملک گیر بزموں کا بانی اور آرگنائزر تھا۔ اس میں وہ بزرگوار بھی شامل ہے۔ جنہیں محترم پرویز صاحب کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اور جنہوں نے ان کے ہر اہم علمی کارنامے میں ان کا عرصہ دراز تک پورا پورا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان میں وہ مخلص اور بے لوث جاں نثار بھی شامل ہیں۔ جنہیں طلوع اسلام کی برادری کا بزرگ خاندان سمجھا اور کہا جاتا تھا اور جن کی تعریفیں کرتے کرتے پرویز صاحب کا منہ سوکھتا تھا۔ ان میں وہ پرخلوص جاں نثار بھی شامل تھے۔ جنہیں ہفتوں محترم پرویز صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل رہا کرتا تھا۔ ان میں وہ بزرگوار بھی شامل ہیں جو ایک دو روز نہیں بلکہ کئی سال تک ایک ہزار روپیہ سالانہ پرویز صاحب کو پابندی کے ساتھ نذر کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ طلوع اسلام کو سالانہ چھ ہزار روپیہ کا خسارہ رہتا ہے۔ ان میں بانیان طلوع اسلام کنونشن اور ممبران مجلس اقبال بھی شامل ہیں۔ ان میں ممبران مجلس عاملہ ممبران پبلسٹی کمیٹی' صدر کالج کمیٹی اور قرآنی سفیر برائے ممالک یورپ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ اگر یہ تمام بڑی بڑی شخصیتیں تحریک سے کنارہ کش ہو جاتی ہیں یا انہیں بانی تحریک سے کچھ شکایات پیدا ہو جاتی ہیں تو ہر شخص ٹھٹھک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان جیسے واقفان راز تحریک سے کیوں بد دل ہو کر حریم ناز سے رخصت ہوتے چلے گئے۔ ظاہر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے کہ نہ تو اتنے آدمیوں کا ایک دم سر پھر گیا تھا۔ اور نہ ہی حکومت پاکستان کے محکمہ صحت کی طرف سے اس عرصہ میں کوئی ایسی رپورٹ آئی ہے۔ کہ پاکستان میں ان دنوں مرض نفاق وغداری کی کوئی رو وبائی صورت اختیار کر گئی تھی..... بہرحال اسی سلسلہ دراز کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ آج کل محترم پرویز صاحب کے عتاب کا رخ "میزان" کے ممبران اور کراچی کے احباب کی طرف ہے۔ وہ برابر ہدف طعن وملامت بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان میں اکثریت کراچی والوں کی تھی۔ اس لیے کراچی کی بزم بھی توڑ دی گئی۔ طلوع اسلام کے قریبی حلقوں میں تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ ۳/اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ایک مجلس مشاورت بلائی گئی۔ جس میں واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا۔ اور نام لے لے کر کراچی والوں کو منافق اور منافق اعظم بتایا گیا پھر ۱۲ اکتوبر ۶۴ کو بزم لاہور کے اراکین کو محترم پرویز صاحب نے چائے پر مدعو فرمایا۔ اور اس میں میزان اور کراچی والوں کے خلاف زہر سے بجھی ہوئی تقریر فرما کر حاضرین کے جذبات کو مشتعل کیا گیا۔ اس تقریب نامسعود کو "یوم الفرقان" کے نام سے یاد کیا گیا۔ کیونکہ اس دن ان کے خیال کے مطابق مومنین صادقین اور منافقین کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔ اس مجلس کی تقریر بقول ایک حاضر جلسہ کے اس قدر اشتعال انگیز تھی کہ کراچی والوں میں سے کوئی وہاں موجود ہوتا تو حاضرین اس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے۔" (ایضاً ص ۵-۶-۷)

۲۔ مفکر قرآن کا ایثار اور دیانت

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ:

"۱۹۶۰ء کے اواخر میں محترم پرویز صاحب اور چوہدری عبدالرحمان صاحب کراچی تشریف لائے اور پرویز صاحب نے احباب کراچی کے سامنے یہ تجویز پیش فرمائی کہ طلوع اسلام کے لٹریچر کی اشاعت کے لیے ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ جو موصوف کی کتابوں کو شائع اور فروخت کرے۔ اور اس طرح اشاعت وفروخت کی دردسری سے موصوف کو نجات حاصل ہو جائے۔ اور وہ ہمہ تن اپنے تصنیفی کاموں پر توجہ دے سکیں۔ حسب سابق کراچی کے احباب نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ اور چون ہزار (۵۴۰۰۰) روپیہ فراہم کر دیا۔ جن احباب نے یہ خطیر رقم فراہم کی تھی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان لوگوں کا مقصد اس ذریعہ سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان کی کمپنی کو جو کچھ منافع حاصل ہو وہ قرآنی لٹریچر کی اشاعت پر صرف کیا جا سکے۔ لیکن جب کچھ ہی عرصہ بعد کراچی کے احباب کو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ تمام سرمایہ خرد برد ہو چکا ہے اور کمپنی الٹا مقروض ہو چکی ہے۔ تو فطری طور پر ان تمام لوگوں کے احساسات کو دھچکا لگا۔ جنہوں نے سرمایہ فراہم کیا تھا۔ ایسا کیوں اور کس طرح ہوا؟ یہ داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ جس کی مختصر سی تفصیل میزان لمیٹڈ کے سرکلر نمبر ۲ مورخہ ۲۔ نومبر ۱۹۶۴ میں حافظ برکت اللہ صاحب آنریری مینجنگ ڈائریکٹر نے پیش کر دی تھی۔ جس کی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کوئی تردید محترم پرویز صاحب یا ادارہ کی طرف سے نہیں کی گئی اور نہ ہی کوئی معقول جواب دیا گیا۔"

"احباب کراچی جنہیں پرویز صاحب سے انتہائی عقیدت تھی یہی سمجھتے رہے کہ یہ سب کچھ ارادتاً نہیں بلکہ ناواقفیت یا بے توجہی کی بنا پر ہوا ہے اور اگر پرویز صاحب کو پوری حقیقت سمجھا دی گئی تو اس کی تلافی فرما دیں گے۔ چنانچہ طویل عرصہ اندر اندر مذاکرات ہوتے رہے۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد میزان لمیٹڈ کے ممبران نے عبدالرب صاحب سے رجوع کیا۔ جن کا پرویز صاحب پر کافی اثر تھا۔ اور وہ خود بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ سب کچھ پرویز صاحب سے غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر ہوا اور وہ اس معاملہ میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جناب پرویز کو بڑی منت سماجت سے یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی کہ۔

① میزان آپ کا اپنے خون جگر سے پیدا کردہ بچہ ہے۔ اسے پروان چڑھائیں اور اسے خسارہ سے بچانے اور کاروباری انداز سے چلانے کے لیے جو طریق کار بھی تجویز ہوا ہے جبراً و قہراً ہی سہی اسے اختیار کر لیں۔ توقع ہے آج کا نقصان کل کے فائدے میں بدل جائے گا۔

② معاملہ کو ذاتی مفاد [1] اور قانونی نقطہ نظر سے دیکھنے کی بجائے قرآنی تحریک اور مخلص رفیقوں کے احساسات اور عزائم کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔

③ رائلٹی پر اصرار سابقہ اعلانات کے خلاف ہے۔ جن میں کہا گیا تھا کہ آپ کتابوں کی آمدنی میں سے ایک پیسہ تک نہیں لیتے اور رائلٹی بھی ایک پائی نہیں لیتے۔ رائلٹی کو میزان کی حیات و ممات کا مسئلہ نہ بنائیں۔

④ چھوٹے چھوٹے باہمی اختلاف مفید اداروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ قدرے دور اندیشی اور وسعت نظر سے کام لیا جائے تو وہ دور ہو سکتے ہیں۔

⑤ مہنگائی میں آپ کے اخراجات کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ لیکن قرآنی تعلیمات کی اشاعت کا مطالبہ بھی کم وزنی نہیں۔ دونوں میں موافقت پیدا کریں۔

⑥ کراچی والوں کو پہلے صرف تحریک کو آگے بڑھانے کا سودا تھا۔ اب وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ میزان کو مالی نقصان سے بچایا جائے۔

⑦ کراچی والے آپ کی سہولت کو بہرحال مقدم سمجھتے ہیں۔ میزان کو خسارہ سے بچانے کی تجاویز میں بنیادی اور اہم ترین بات ان کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کے اخراجات کو ضرور پورا کیا جائے۔ خواہ چیئرمینز الاؤنس کی شکل میں ہو یا مقررہ رائلٹی کی صورت میں۔

---

[1] واضح رہے کہ پرویز صاحب نے اپنے نظام ربوبیت کی بنیاد ہی ذاتی مفاد کے بجائے ایثار یا لینے کی بجائے دینے پر رکھی ہے۔ نظریات وہ ہیں اور عمل یہ۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑧ میزان کو ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رہنا چاہیئے۔ اس کے ٹوٹنے سے آپ کی قیادت پر بہت مضر اثر پڑے گا۔ قرآنی تحریک بدنام اور اس کے حامی ذلیل ہوں گے۔ اور مخالفین بغلیں بجائیں گے۔ آپ کی کتابیں نیلام ہوں گی۔ اور خریداروں کی کمی کے باعث ممکن ہے تل کر بکیں۔ ادارہ اور تحریک کی ہوا اکھڑے گی' اور جگ ہنسائی ہوگی۔ میزان اور بزم میں گہرے تعلق کے باعث مایوسی بزم کی کمر توڑ دے گی۔ کراچی والوں کی بے پناہ عقیدت کو زبردست دھچکا لگے گا۔ اور ان کہی باتیں زبان پر آنے لگیں گی۔ مثلاً:

(الف) پریس اور مکتبہ میں لگے ہوئے روپیہ کی بازیابی کے لیے پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کی سکیم سوچی گئی اور اس کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ حصص کا وصول شدہ روپیہ جلد از جلد اپنایا جا سکے۔ ۵۴-۵۵ ہزار وصول شدہ رقم کا دو تہائی پرویز صاحب نے لے لیا۔

(ب) رائلٹی نرالے ڈھنگ سے مقرر کی اور سولہ سترہ ہزار روپیہ پرویز صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر وصول کر لیے (میزان جائے جہنم میں میری رائلٹی مجھے دو)۔

(ج) میزان کے حصص فروخت کرنے کی کوشش پرویز صاحب نے بالکل نہیں کی۔

(د) میزان سے میاں صاحب کو نکالنا پرویز صاحب نے ضروری سمجھا تاکہ میزان کے مفاد کو کچل ڈالنے میں وہ رکاوٹ نہ بن سکیں۔" (حوالہ ایضاً' ص: ۸-۹-۱۰)

اس بزرگ خاندان کی یہ تمام مساعی اور پند و نصائح بے کار گئیں۔ اور ان سب باتوں کے جواب میں پرویز صاحب نے انہیں تحریر فرمایا کہ:

"میزان اور وہ ایک نہیں دو ہیں۔ اور دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ ہے۔ اس لیے میزان کو ختم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ انہیں سہولت اور مالی فائدہ ہو۔" (ایضاً' ص: ۱۲)

میزان والوں کی طرف سے بار بار یہ الزام دہرایا جا رہا تھا کہ کس قدر غیر کاروباری' غلط' قابل اعتراض اور ناروا فیصلے کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

1. پرویز صاحب اپنے ساٹھ ہزار روپے کے حصص کی قیمت نقد صورت میں ادا کرنے کے بجائے کتابوں کی صورت میں ادا کریں۔
2. پرویز صاحب کا نصب کردہ پریس اصل لاگت پر ۱۲ء۲۲۳۴۱ روپے میں میزان کے لیے خرید لیا جائے۔
3. پرویز صاحب کے قائم کردہ مکتبہ کا فرنیچر ۸۸ء۳۵۴۲ میں خریدا گیا۔
4. پرویز صاحب کے قائم کردہ مکتبہ کی کتب ۳۹ء۹۵۳۶ میں خریدی گئیں۔
5. کتاب ضحی الاسلام کے ترجمہ اور کتابت کی اجرت پر جو رقم پرویز صاحب ادا کر چکے ہیں یعنی ۲۳۰۷ روپے وہ انہیں ادا کیے جائیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ان تمام معاملات میں چونکہ خود پرویز صاحب ایک پارٹی تھے اور چودھری عبدالرحمٰن صاحب خود ان ہی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ جن کا ایک پیسہ بھی کمپنی میں نہیں لگا تھا۔ لہٰذا یہ تمام نقصان دہ اور ضرر رساں فیصلے شرعاً' اخلاقاً اور قانوناً انہیں از خود نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ اور اگر غلط طریقہ پر یہ فیصلے ان دونوں حضرات نے ملی بھگت سے کر بھی لیے تھے تو جس وقت ان بزرگوں نے ان فیصلوں پر اعتراض کیا تھا جن کی رقوم کمپنی میں لگی ہوئی تھیں۔ تو ان فیصلوں کو کالعدم کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ محترم پرویز صاحب کی طرف سے اصل اعتراضات کا تو کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ الٹا میزان والوں کو منافقت' غداری' مفاد پرستی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا طعن دیا جاتا ہے۔ اور انہیں طرح طرح سے بدنام کیا جا رہا ہے۔ ان کا سوشل بائیکاٹ کرنے کی ہدایات جاری کی جا رہی ہیں۔ کیا قرآن کریم کے تیس سالہ تدبر و تفکر نے انہیں یہی کچھ سکھایا ہے اور کیا یہی قرآن کی تعلیم ہے؟" (ایضاً' ص:۱۴-۱۵)

۳۔ فرقہ پرستی اور پارٹی بازی

پرویز صاحب اپنے لٹریچر میں اکثر اس اعلان کا اعادہ فرماتے رہتے ہیں کہ پارٹی بازی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے اور یہ کہ طلوع اسلام کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض ایک "بزم" ہے۔ جیسے بزم اقبال وغیرہ۔ اب محرم رازِ درون کی زبانی یہ حقیقت بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"پرویز صاحب نے اس پیراگراف میں اپنے قرآنی معاشرہ کے اندر کم از کم دو پارٹیوں یا دو فرقوں کا وجود خود ہی تسلیم فرمالیا ہے۔ ایک پارٹی تو ان ناقدین کی ہے جو پرویز پر مالی اور تنظیمی معاملات میں تنقید کر رہی ہے اور جسے وہ منافق قرار دے کر اپنے معاشرہ سے خارج کر رہے ہیں۔ اور دوسری پارٹی متبعین مخلصین کی ہے جو ان سے اندھی عقیدت رکھتی ہے جس کے اجتماع میں وہ اپنا یہ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ تو خود اس قرآنی معاشرہ کو کیا کہا جائے گا جس میں یہ دونوں پارٹیاں یا فرقے پنپ رہے ہیں۔ حالانکہ آپ پوری قوت سے سال ہا سال سے چیختے آرہے ہیں کہ ہم کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں ہیں اور ہمارے نزدیک فرقہ بندی یا پارٹی بازی شرک کے مترادف ہے۔"

"علاوہ ازیں پرویز صاحب اپنے اس خطبہ میں بار بار ان منافقین کو اپنے گروہ یا جماعت سے نکال دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ کبھی فرماتے ہیں کہ:

"صحیح تدبیر یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے۔ اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ وہ کس ذہنیت کا انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے ممبر بنا لیں۔ اور بعد میں اسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔" (ایضاً' ص:۸۷).....

کہیں فرماتے ہیں کہ:

"زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کے تجربہ کے بعد آپ کے تعلقات باقی نہیں رہتے انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں آپ اپنے آپ کو کبھی موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ لیکن اگر کوئی تحریک انہی حالات میں کسی کو اپنے حلقہ سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اس شخص کو نہیں بلکہ تحریک کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔" (ایضاً)

اخراج کہاں سے؟: "کیا محترم پرویز صاحب بتائیں گے کہ وہ ان تمام حضرات کو کس چیز سے خارج کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ انہیں اپنی کوٹھی سے نکالنا چاہتے ہیں یا لاہور بدر کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان بدر کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ اگر یہ سب کچھ نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وہ انہیں اپنی جماعت ہی سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ انہیں واقعی پرویزی جماعت ہی سے خارج کرنا چاہتے ہیں تو خدا کے واسطے یہ تو بتائیں کہ پھر فرقہ اور پارٹی اور کسے کہتے ہیں؟ اگر آپ کی جماعت کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں ہے کیونکہ فرقہ پرستی اور پارٹی بازی قرآن کی نص صریح سے شرک ہے تو آپ کو ان لوگوں کے نکالنے پر کیوں اصرار ہے؟ جس طرح آپ کا جی چاہے قرآن کی دعوت آپ دیجیے اور جس طرح ان لوگوں کا جی چاہے قرآن کی دعوت یہ لوگ دیتے جائیں۔ قرآن کریم کی دعوت دینا کوئی آپ ہی کی اجارہ داری نہیں ہے۔"

(حدیث دلگداز ے' ص: ۳۶-۳۷)

۴۔ دعوت "علی وجہ البصیرت" کی اور آرزو "اندھی عقیدت" کی

اسی طرح پرویز صاحب اپنے اکثر لٹریچر میں سورہ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۸ درج فرما کر اسلامی تعلیمات کو علی وجہ البصیرت جانچنے پرکھنے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔ بلوچ صاحب ایسی ہی چند آیات بمعہ ترجمہ درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اس انداز کے دانا بینا اور شنوا لوگوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میری قرآنی تحریک کو تو ایسے کارکن درکار ہیں جو۔"

چشم بند لب ببند و گوش بند

کا مصداق ہوں۔ جو بالکل الٹ کر نہ دیکھیں کہ جو فنڈ ہم نے دیا تھا اس کا کیا ہوا؟ جو خدمات ہم نے سرانجام دیں تھیں۔ ان کا کیا نتیجہ نکلا۔ غرض وہ نہ آنکھوں سے دیکھیں اور نہ عقل وشعور کو کام میں لائیں۔ البتہ کبھی کبھی اپنے دل کے دریچوں میں سے جھانک کر یہ دیکھ لیا کریں کہ ان میں کتنی تبدیلی آئی ہے۔ یا پھر اتنا دیکھ لیا کریں کہ تحریک کتنی پھیلی ہے اور بس۔ دل کے ان دریچوں کی بات ہی کیا ہے۔ ایک خرقہ بدوش صوفی کی ہدایت پر جب آپ اس خیال سے ان میں جھانکتے رہیں گے۔ کہ ان میں کتنا نور ولایت پیدا ہو گیا ہے تو کچھ دن کی مشق کے بعد ان دریچوں میں نور ولایت بھی نظر آنے لگتا ہے۔ وہ (پرویز صاحب) فرماتے ہیں کہ:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"قرآنی تحریک کی پوری عمارت للّٰہیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ للّٰہیت کے یہ معنی ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ یعنی اس دعوت اور تحریک کا فروغ اور کامیابی اور اس کے ذریعے اپنی اصلاح نفس..... اگر اس مقصد کے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں پیدا ہو گیا تو للّٰہیت نہ رہی۔ سودا بازی ہو گئی۔" (ایضاً ص:۶۹)

اور "اخلاص کا معیار ایک ہی ہے یعنی للّٰہیت جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد میرے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہو گئی اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کس حد تک مدد ملے گی۔" (ایضاً ص ۸۳)

اور "آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار "تبدیلی" ہونا چاہیئے۔ میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع رکھا ہے کہ مومن کسے کہتے ہیں؟ آپ اسے بغور پڑھیے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہیے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔" (ایضاً ص:۸۶)

تو حضرات! یہ ہے اس قرآنی تحریک کا انجام جو علم وبصیرت کے نام پر شروع کی گئی تھی اور خالصتاً کو رانہ تقلید پر ختم ہو رہی ہے ؎ دیدہ آغازم انجام بنگر

آپ سوچئے اور بار بار سوچئے کہ کیا آپ کو اس انداز پر اپنی بیش قیمت توانائیاں اور بیش قیمت سرمایہ ضائع کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیئے؟ کیونکہ اگر کچھ کھو لینے کے بعد کل کو کراچی والوں کی طرح آپ کو بھی مایوسی ہوئی تو یہ مایوسی مزید دل شکنی کا باعث ہوگی" (حدیث دلگدازے ص۴۶۔۴۷)

۵۔ کافرگری اور منافق گری

جناب پرویز صاحب کے خلاف جب پورے پاکستان کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا تھا تو موصوف نے لکھا تھا کہ:

"اس سے بھی بڑھ کر ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کو (یا کسی اور کو) یہ اتھارٹی کہاں سے مل جاتی ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ صادر کریں؟ علماء کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ وہ جسے چاہے کافر قرار دے دے۔" (کافرگری، ص:۲۳)

"تو کیا جناب پرویز صاحب یہ بتانے کی تکلیف فرمائیں گے کہ خود پرویز صاحب کو کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھے بغیر ہی یہ اتھارٹی کہاں سے حاصل ہو گئی ہے۔ کہ وہ جسے ان کا جی چاہے منافق بنا دیں اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لوگوں کے خلاف نفاق کے فتوے صادر فرما دیں۔"

جناب پرویز صاحب نے فرمایا تھا کہ:

"باقی رہے مفتی۔ سو اسلامی سلطنت میں یہ ایک منصب تھا کہ جس پر کوئی شخص حکومت کی طرف سے تعینات ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مفتی نہیں ہوتا تھا۔ جس طرح آج کل ایڈووکیٹ جنرل یا اٹارنی جنرل حکومت کی طرف سے تعینات ہوتے ہیں۔ اور ہر وکیل اپنے آپ کو نہ ایڈووکیٹ جنرل وغیرہ قرار دے سکتا ہے؟ اور نہ ہی اس منصب کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے مفتی کی حیثیت مشیر قانون کی ہوتی ہے۔ اس کا کام صرف مشورہ یا رائے دینا تھا۔ فیصلہ حکومت خود کرتی تھی۔ یا اس کی طرف سے مقرر کردہ قاضی۔ اب نہ وہ حکومتیں باقی ہیں نہ ان کی طرف سے مقرر کردہ مفتی۔ لیکن یہ حضرات ابھی تک اپنے آپ کو انہی معنوں میں مفتی سمجھتے ہیں اور صرف مفتی کے فرائض ہی سرانجام نہیں دیتے۔ بلکہ قاضی کی حیثیت سے فیصلے بھی صادر کرتے ہیں"

"کیا محترم پرویز صاحب ہمیں بتائیں گے کہ ان کی طرف سے نفاق کے یہ فتویٰ کس اتھارٹی کی بناء پر صادر کیے جا رہے ہیں؟ کیا وہ خود حکومت ہیں؟ یا حکومت پاکستان کی کوئی صاحب اقتدار ہستی یا حکومت پاکستان نے آپ کو اس مقصد کے لیے تعینات فرمایا ہے۔ کہ آپ لوگوں کے دلوں میں جھانک کر ان کے متعلق ایمان کے فیصلے صادر فرمایا کریں؟ اگر ان میں سے ایک صورت بھی نہیں تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ لوگوں پر نفاق کا گھناؤنا الزام لگائیں۔ واضح رہے کہ اسلام کی رو سے نفاق کا درجہ کفر واضح سے کہیں بدتر ہوتا ہے۔" (حدیث دلگدازے' ص ۲۲' ۲۳)

"دوسری بنیادی بات خود نفاق کے سلسلہ میں عرض کرنی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اجماعی طور پر علمائے اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد نفاق کا انسٹی ٹیوشن ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کی وفات کے بعد آدمی کو یا مسلمان کہا جا سکتا ہے یا کافر' منافق نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ نفاق کا تعلق خالصتاً آدمی کے دل سے ہوتا ہے جس کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کو تو وحی کے ذریعے منافقین کا علم ہو جاتا تھا۔ لیکن آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص کسی کے نفاق کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں..... چنانچہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں علمائے اسلام نے لوگوں کے کفر اور فسق کے فتوے تو بے شمار دیئے۔ لیکن جناب پرویز صاحب سے پہلے کسی بڑے سے بڑے عالم اور مجتہد کو بھی یہ جسارت نہیں ہو سکی کہ وہ کسی آدمی کے خلاف نفاق کا فتویٰ صادر کر سکے۔ یہ نرالا اعزاز آج چودھویں صدی میں محض جناب پرویز کو حاصل ہوا ہے کہ وہ لوگوں کے متعلق نفاق کے فتوے صادر کر کے علیم بذات الصدور ہونے کے مدعی بن رہے ہیں۔" (ایضاً' ص ۲۱-۲۲)

"نفاق کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ نفاق دراصل ایک قسم کا جھوٹ ہی ہوتا ہے اور آدمی جھوٹ یا تو دفع مضرت کے لیے بولتا ہے یا جلب منفعت کے لیے۔ آدمی نفاق جیسے گھناؤنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

جرم کا ارتکاب اس لیے کرتا ہے کہ مومنین کی جماعت سے اسے کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔ اور یا اس لیے کہ حکومت وسلطنت میں مجھے کوئی اچھا منصب حاصل ہو جائے گا یا دولت ثروت یا عزت وشوکت حاصل ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کا گروہ اس وقت وجود میں آیا جب مدینہ کی مسلمانوں کی ریاست کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ مکی دور میں منافقین کا گروہ ناپید تھا۔ اب غور فرمایئے کہ محترم پرویز صاحب کی جماعت مومنین آج کس دور سے گزر رہی ہے کیا وہ مکی دور کی آئینہ دار ہے۔ یا مدنی دور کی مظہر ہے؟ آپ کی جماعت مومنین میں شامل نہ ہونے سے منکرین کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے اور جو لوگ اس جماعت میں شامل ہیں انہیں کونسے فائدے حاصل ہو رہے ہیں؟ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ جو لوگ آپ کی جماعت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ انہیں منکر حدیث' منکر شان رسالت جیسے دل آزار القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ گھروں میں تفرقے پڑ جاتے ہیں۔ گھر والے بھی ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ لوگ انہیں مسلمان بھی نہیں سمجھتے۔ وہ پورے معاشرہ سے کٹ کر رہ جاتے ہیں تو ان غریبوں کو وہ کونسا مادی یا غیر مادی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جس کی خاطر وہ منافقانہ طور پر آپ کی جماعت میں داخل ہوں گے۔" (ایضاً ص ۲۶-۲۷)

"محترم پرویز صاحب نے صورت حال کی اصلاح و درستی کے بجائے کراچی کے احباب کے خلاف اقدامات شروع کر دیئے۔ تاآنکہ انہیں منافق قرار دے کر جماعت سے خارج کر دیا گیا چونکہ شکایات مالی معاملات سے متعلق تھیں۔ اس لیے پرویز صاحب نے اس خطاب میں جس کا نام انہوں نے "حرف دلنواز" رکھا ہے۔ شاطرانہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ (خاکم بدہن) حضور اکرم ﷺ پر بھی منافقین کی طرف سے اسی قسم کے گھناؤنے الزامات لگائے جایا کرتے تھے۔ یعنی جب منافقین نے حضور اکرم ﷺ تک کو نہیں چھوڑا تو میری ہستی ہی کیا ہے؟ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"اس قسم کے کینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ داعی انقلاب کے خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیئے جائیں۔ غور فرمایئے کہ ذات اقدس واعظم' جسے زمانہ قبل از نبوت لوگ امین کہہ کر پکارتے تھے۔ جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف واعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بددیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اس ذات گرامی کے متعلق یہ بدنہاد یہ مشہور کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملہ میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ وَمِنْهُم مَّنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ (۵۸:۹) ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے ہیں۔ اور طعنے دیتے ہیں غور کیجیے کہ ان باتوں سے حضور ﷺ کا کلیجہ کس طرح چھلنی ہوتا ہوگا؟" (ایضاً' ص:۴۷)

صحافتی بازی گری: صحافتی بازی گری کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ جب آپ کے کسی کام پر اعتراض کیا جائے تو آپ کسی مشہور ہستی کا نام لے دیجیے جس کا تقدس واحترام مخاطب کے لیے مسلم ہو۔ اور اس ہستی کی کسی ایسی ہی مفروضہ غلطی کی نشان دہی کر دیجیے۔ جیسی آپ سے سرزد ہوئی ہے اور کہہ دیجیے کہ یہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے کسی مشہور ہستی کو اپنی سطح پر لا کھڑا کرنا تو دنیا کے بہت سے شاطروں کا شیوہ رہا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے حضور اکرم ﷺ کی ہستی کو وہی شخص استعمال کر سکتا ہے جس کے دل میں خوف خدا بلکہ ایمان کا شائبہ بھی نہ رہا ہو۔ حسب عادت اس مقام پر بھی پرویز صاحب نے کتربیونت اور تحریف سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر اس انداز کا الزام کبھی نہیں لگایا گیا کہ آپ معاذ اللہ پیسے کے معاملے میں گڑ بڑ کرتے ہیں۔ آپ کے متعلق منافقین نے محض یہ الزام لگایا تھا کہ آپ صدقات میں سے ہم لوگوں کو کم دیتے ہیں۔ اور دوسرے ضرورت مندوں کو زیادہ' یہ بات نہیں کہ انہیں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ آپ معاذ اللہ خود کچھ لے لیتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صدقات کے اموال کو اپنے اور اپنے اہل وعیال پر حرام کر رکھا تھا۔ (حدیث دلگدازے' ص:۳۷-۳۸)

کراچی کے منافقین : "یہ گفتگو ان لوگوں کے متعلق ہے جنہیں پہچاننے میں جناب پرویز صاحب کو اتنا طویل عرصہ لگ گیا جیسا کہ بقول ان کے آنحضرت ﷺ کو بھی منافقین کو پہچاننے میں نو سال کا عرصہ لگ گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور اکابر صحابہ' منافقین کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اور پہلے دن ہی سے پہچانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی کسی منافق کو کوئی ذمہ داری کا کام نہیں سونپا۔ کبھی کسی منافق کے خلوص' دیانت اور تقویٰ کا اعتراف فرما کر اس کی تعریفیں نہیں فرمائیں۔ جس پر آگے چل کر آپ کو پچھتانا پڑا ہو کہ میں نے فلاں کام فلاں آدمی کو سونپ دیا تھا۔ مگر وہ تو منافق نکل آیا۔ کیا جناب پرویز صاحب حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کرام سے کسی عبدالرب اور میاں عبدالخالق کی مثال پیش فرما سکتے ہیں۔ جنہیں آپ نے ناظم اور مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدہ پر سرفراز کیا ہو۔ لیکن بعد میں وہ منافق نکل آیا ہو اس کے برخلاف جناب پرویز ان لوگوں کو منافق قرار دے رہے ہیں۔ جنہیں اہم تر ذمہ داریوں کے کام سونپے گئے اور عرصہ دراز تک آپ ان کے خلوص' دیانت اور خدمات جلیلہ کے گن گاتے رہے۔" (حدیث دلگدازے' ص:۲۴-۲۵)

۶۔ عفو ودرگزر

"حضور اکرم ﷺ اپنے دور کے منافقین کو پہلے ہی دن سے پہچانتے تھے۔ لیکن ۹ سال تک انہیں برداشت فرماتے رہے۔ اور ان کے خلاف کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ بعض دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کا اصرار بھی کرتے لیکن آپ یہی جواب دیا کرتے تھے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ لوگ باتیں بنائیں۔ کسی تحریک کے ایک سچے قائد کا یہ ظرف ہوتا ہے۔ جس کی جناب پرویز کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ان میں تو! منافقت تو بڑی بات ہے۔ ذرا سی مخلصانہ تنقید یا دیانتدارانہ مخالفت کو برداشت کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔" (ایضاً' ص:۲۵)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

معاشرتی تعلقات کا انقطاع: "اس قدر گرج برس لینے اور دل کے پھپھولے پھوڑنے کے بعد بھی جناب پرویز صاحب کے غیظ و غضب کو تسکین نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے بعد حاضرین اجلاس کو ان منافقین کے معاشرتی بائیکاٹ پر اکساتے ہوئے فرمایا کہ:

"اس رسول سے یہی نہیں کہا گیا کہ وہ ان سے جنگ کرے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کرے۔ معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم کیا گیا کہ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (۹:۸۴) یوں اس گروہ سے جماعت مومنین پاک اور صاف ہوئی۔

"پرویز صاحب نے دعویٰ تو فرمایا ہے معاشرتی تعلقات کے انقطاع کا اور دلیل دی ہے اس کی قبر پر نہ کھڑا ہونے اور نماز نہ پڑھنے کی وہ بھی صرف حضور اکرم ﷺ سے خاص ہے۔ تو کیا یہ معاشرتی بائیکاٹ اس مردہ سے ہوگا جو مرچکا؟ یا اس کے اقارب سے جو اس جرم میں ملوث نہیں ہیں؟...... لہٰذا اس آیت کریمہ سے معاشرتی تعلقات کے انقطاع پر دلیل لانا جاہلانہ استدلال ہے۔ اس آیت میں تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کریں۔ یہاں معاشرتی بائیکاٹ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"غزوہ تبوک حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کی آخری مہم تھی جو سن ۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوہ تبوک تک میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد ان کے استیصال کا انتظام کیا گیا۔ (ایضاً ص:۷۷)

ایک ہی سطر میں دو بالکل متضاد دعوے کر جانا جناب پرویز صاحب ہی کا کمال ہے ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ "غزوہ تبوک حضور ﷺ کی حیات طیبہ کی آخری مہم تھی۔ جو سن ۹ھ میں واقع ہوئی تھی" "آخری مہم" کے الفاظ کو ذہن میں رکھئے۔ یعنی بعد میں کوئی مہم پیش نہیں آئی اور دوسری طرف یہ ادعا بھی ہے کہ اس کے بعد ان کے استیصال کلی کا انتظام کیا گیا۔ کیا انتظام کیا گیا اور کہاں انتظام کیا گیا؟ اسی زمین پر یا ساتویں آسمان پر، پرویز صاحب نے یہ بتانے کی مطلق زحمت نہیں فرمائی پرویز صاحب کو تسلیم فرمالینا چاہیئے کہ ایک طرف قرآن کریم کی اس دھمکی اور دوسری طرف حضور اکرم ﷺ کے کریمانہ اخلاق عفو ودرگزر اور حسن معاملت نے ان منافقین پر یہ گہرا اثر چھوڑا کہ وہ خود ہی اپنے نفاق سے تائب ہو گئے اور انہوں نے اپنی اصلاح خود ہی کرلی۔ کہ ان احکام پر عمل کرنے کی نہ تو نوبت آئی اور نہ اس کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک داعی کا کردار یہ ہوتا ہے وہ نہیں جس کا مظاہرہ محترم پرویز صاحب نے فرمایا ہے جبھی تو لوگ ان کے گرد سے چھٹتے جارہے ہیں۔ پرویز صاحب کو "داعی انقلاب" کہلوانے کا تو بہت شوق ہے اے کاش! وہ داعی انقلاب کا کردار بھی اپنے اندر پیدا کرسکتے (ص ۴۳ تا ۴۷)

منافقین کراچی پر پندارِ نفس کا الزام: "دوسری بات ہمیں ان لوگوں سے متعلق کہنی ہے جن پر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(Egoism) یا پندار نفس کا الزام لگایا گیا ہے۔ اگر یہ لوگ محض اس مقصد سے آپ کی تحریک میں شامل ہوئے تھے کہ لوگ اس کی تعریف کریں؟ اور اس طرح وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائے اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے۔ اس کے پندار کو تسکین ہوتی ہے..... الخ"

"تو کیا ساری دنیا میں تعریف کرانے اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا آدمی بننے' اپنے نفس کو بھلانے اور اپنے اس پندار کی تسکین کرنے کے لیے محض پرویزی معاشرہ ہی رہ گیا تھا۔ جس کی کل کائنات چند سو افراد سے زیادہ نہیں ہے۔؟ کیا پرویز صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اجتماعات صرف ان کے ہاں ہی ہوتے ہیں اور کہیں اجتماعات نہیں ہوتے؟ کیا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ دریاں اور کرسیاں محض ان کے ہاں ہی بچھائی اور اٹھائی جاتی ہیں اور کسی جماعت کو نہ تو دریاں میسر ہیں اور نہ کرسیاں؟ کیا جھاڑو محض ان کے ہاں ہی دی جاتی ہے۔ اور جھوٹے برتن محض اِن ہی کے ہاں صاف کیے جاتے ہیں؟ کہ اس غریب کارکن کو یہ تمام کام اور کہیں میسر نہیں آسکتے تھے اس لیے وہ اپنے پندارِ نفس کی تسکین کے لیے آپ کے معاشرہ میں داخل ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ محترما!

وفا کیسی' کہاں کا عشق' جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل' تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

(حدیث دل گدازے' ص: ۳۰)

یہ ایک ایسے شخص کے تاثرات ہیں جو طلوع اسلام کا معزز رکن رہا ہے۔ تاہم وہ "منافق" نہیں تھا۔ کیونکہ وہ لاہور کا رہنے والا تھا۔ اس کی رقم بھی میزان میں نہیں لگی تھی۔ جس کے خرد برد ہونے کی اسے ذاتی طور پر کوفت ہوئی ہو۔ وہ طلوع اسلام کا رکن بھی رہا کیونکہ بزم صرف کراچی کی توڑی گئی تھی۔ پھر وہ پرویز صاحب کا نام بھی احترام سے لیتا ہے۔ لہٰذا اسے "غیر جانبدار" ہی سمجھنا چاہیئے۔ تاہم اس نے پرویز صاحب کے کردار کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کھل کر کر دی ہے کہ کس طرح پرویز صاحب نے "میزان" کا سرمایہ ہضم کرنے کے بعد سرمایہ فراہم کنندگان پر نازیبا الزامات اور اتہامات بھی لگائے ہیں۔ تاکہ ان کا اپنا عیب نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس ضمن میں محمد علی صاحب نے چند ایسی حیلہ سازیوں کا بھی ذکر فرما دیا ہے جو پرویز صاحب کی تحریروں میں عموماً ملتا ہے۔ اور اس کتاب "حدیث دل گدازے" کے ٹائٹل پر یہ عبارت لکھی ہے۔ "جناب پرویز صاحب کی کاروباری دیانت اور منافق گری کا شاہکار۔ ایک غیر جانبدارانہ بے لاگ تبصرہ" از محمد علی بلوچ' بی اے (آنرز)' ارجن روڈ' کرشن نگر' لاہور۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

باب: پنجم

پرویز صاحب کے لٹریچر کی خصوصیات

پرویز صاحب کا لٹریچر اور مختلف تحریروں کے مطالعہ کے بعد جو چند باتیں خاص طور پر ذہن میں ابھرتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ اپنی قرآنی بصیرت کو بھی قرآن سمجھنا

پرویز صاحب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے جی میں آئے۔ وہ لکھنے سے پیشتر ان الفاظ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ "قرآن کہتا ہے کہ....." بالفاظ دیگر آپ اپنی قرآنی بصیرت کو بھی قرآن ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

① "قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ تو بے شک حیوان ہی کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ اس کی زندگی کا یہ حصہ وہ ہے جس میں وہ حیوانات کی طرح طبعی زندگی بسر کرتا ہے (کھانا' پینا' سونا' افزائش نسل کرنا اور مرجانا) لیکن اس کی زندگی کا دوسرا حصہ حیوان کی ارتقاء یافتہ شکل نہیں بلکہ صفات خداوندی کا مظہر ہے۔" (قرآنی نظام ربوبیت ص۶۹)

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا عبارت قرآن کی کونسی آیت یا آیات کا ترجمہ ہے۔ غور فرمایئے آپ کی قرآنی فکر نے کس خوبی سے اس دور کے اہم مسئلہ کیا انسان اولاد ارتقاء ہے؟ قرآن سے حل فرما دیا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ آپ کی یہ قرآنی فکر صحیح ہے یا غلط سوال صرف یہ ہے کہ قرآن میں وہ کونسی نص قطعی ہے۔ جس کی بناء پر آپ یہ فرما رہے ہیں کہ "قرآن کہتا ہے کہ....."

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ:

② "قرآن کہتا ہے کہ انسانی جسم مادی عناصر کا مرکب ہے۔ اس لیے موت کے ساتھ طبعی جسم کا خاتمہ ہو جائے گا (قرآنی نظام ربوبیت ص۷۲) یہ قرآن کی کونسی آیت کا ترجمہ ہے۔ کہ انسانی جسم مادی عناصر کا مرکب ہے؟ گویا قرآنی فکر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات و نظریات کو کس طرح قرآن میں داخل کر سکتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اب ایسے ہی چند اقتباسات ذیل میں بلا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ (حوالہ کے صفحات نمبر قرآنی نظام ربوبیت کے ہیں۔)

③ "قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبعی اشیاء اپنے خواص واثرات رکھتی ہیں اسی طرح مستقل اقدار بھی اپنے اثرات رکھتی ہیں۔" (۷۴)

④ "قرآن کہتا ہے کہ علم کے ان شعبوں (میڈیسن' فلسفہ' اور سائیکالوجی) میں تحقیق کرو اور پھر دیکھو کارگاہ عالم انفرادی نظریہ کے تحت چل رہا ہے یا دین کے عالمگیر نظریہ اجتماعی کے مطابق۔"

⑤ "قرآن کہتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ معاشرہ جو انفرادی مفاد خویش کے نظریہ پر قائم ہوگا تباہ وبرباد ہو جائے گا اور جس نظام کی بنیادیں نوع انسانی کے مفاد کلی پر ہوں گی وہی انسانیت کی ربوبیت کا ضامن اور انسانی ذات کی نشوونما ارتقاء کا کفیل ہوگا۔ تو یہ دعویٰ ایک عظیم الشان حقیقت پر مبنی ہے۔" (۱۱۵)

⑥ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جو لوگ نظام ربوبیت کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسکے بعد ایسا پروگرام مرتب کریں جو انسانوں میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب ہو اور ان کے برعکس جو لوگ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں ان دونوں کی زندگی کبھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ (۱۱۹)

⑦ "قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے (۱۶۴)۔

⑧ قرآن کہتا ہے کہ اگر اس (نظام ربوبیت کی حامل) پارٹی نے استقامت برتی تو وہ وقت آجائے گا۔ جب مشیت کے اٹل قانون کے مطابق ان کا تعمیری پروگرام مخالفین کے تخریبی پروگرام پر غالب آجائے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔" (۲۴۶)

⑨ قرآن نے کہا تھا کہ ملوکیت (Kingdom) کا نظام باطل نظام ہے۔ (۲۵۳)

⑩ "قرآن نے کہا ہے کہ سرمایہ داری باطل کا نظام ہے۔ اس لیے باقی نہیں رہ سکتا۔ باقی وہی نظام رہے گا جو نوع انسان کی ربوبیت اور منفعت کا ضامن ہوگا۔" (۲۰۵)

بایں ہمہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ آپ قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم ہیں۔ آپ خالی الذہن ہو کر قرآن کے اندر جاتے ہیں بالکل اسی طرح خالی الذہن ہو کر معتزلہ نے بھی قرآن میں فکر کیا تھا اور اپنے دور کے نظریات داخل کر کے انہیں اپنے قرآنی فکر کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ پھر سید صاحب نے بھی خالی الذہن ہو کر فکر کیا۔ اب جناب پرویز صاحب کو یہ قرآنی فکر تو ورثہ میں مل گئی۔ کچھ آپ کی فکر نے نئے دور کے مسائل اس فکر میں شامل کر دیئے اور آپ کی قرآنی فکر [1] نے اتنا ارتقاء کیا کہ بس خود کو قرآن ہی سمجھنے لگے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے ایک ساتھی محمد علی بلوچ جن کا تعارف ہم پہلے کرا چکے ہیں لکھتے ہیں۔

---

[1] ان حضرات کی قرآنی فکر میں ایک اور فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور سرسید کی یہ فکر بلا واسطہ تھی ⟵

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"اب کچھ عرصہ سے جناب پرویز کی یہ تکنیک بن گئی ہے کہ جب ان کی ذات پر یا ان کے کردار پر کسی طرف سے کوئی اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ فوراً قرآن خطرہ میں ہے" کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! یہ لوگ قرآن کی آواز کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کریم کی وحدت میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں گویا ان کے نزدیک قرآن اور پرویز کوئی دو چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ دونوں ایک بن چکے ہیں کہ اگر پرویز صاحب پر کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ براہ راست قرآن پر اعتراض سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور سادہ لوح عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے "قرآن خطرہ میں ہے" کے نعرہ سے کام لیا جاتا ہے۔" (حدیث دلگدازے' ص:۴۷)

۲۔ لفظ ایک' مفہوم بہت سے

دوسری خصوصیت آپ کے کلام میں یہ ہے کہ آپ اکثر الفاظ قرآنی کا ترجمہ یا مفہوم بدلتے رہتے ہیں ایک مقام پر اس لفظ کا ترجمہ کچھ ہوگا دوسرے مقام پر کچھ اور تیسرے پر کچھ اور جس کی وجہ یہ ہے کہ نظریات زیادہ ہو گئے ہیں۔ جنہیں آپ نے قرآنی فکر کے ذریعہ قرآن سے ثابت کرنا ہوتا ہے۔ پھر جس مخصوص نظریہ کی بحث چل رہی ہو اسی طرح کا حسب حال مفہوم بیان فرما دیتے ہیں۔ آپ کسی لفظ کا ترجمہ بیان کرنے کو پسند نہیں فرماتے۔ مفہوم یا مطلب بتایا کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کرنے سے انسان کسی خاص معنی کا پابند ہو جاتا ہے۔ اسی پابندی کو دور کرنے کی خاطر تو آپ نے احادیث کو چھوڑا تھا۔ اور اب اگر ترجمہ کی مصیبت مول لے لیں تو اتنے ڈھیر سارے نظریات قرآن سے کیسے ثابت کیے جا سکتے ہیں۔ اب ہم بطور نمونہ چند الفاظ اور ان کے مختلف مفاہیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) لفظ "اللہ" چھ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ سے مراد اللہ کا قانون یا قانون خداوندی بھی ہے۔ صفات خداوندی بھی اللہ کا نظام بھی قرآنی معاشرہ بھی اور اگر اللہ کے ساتھ رسول کو جمع کر دیا جائے۔ تو اس سے مراد مرکز ملت ہوتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے اللہ پر ایمان بالغیب) ان سب مفاہیم میں قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ بذات خود کوئی حی وقیوم اور قادر مطلق ہستی نہیں ہے۔

اور پرویز صاحب نے اس فکر قرآنی کے لیے اپنی تصنیف لغات القرآن کو واسطہ بنایا ہے۔ جب آپ کے سامنے قرآن میں داخل کرنے والے نظریات کا انبار لگ گیا تو قرآن کے بیشتر الفاظ کی آپ کو تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اس ضرورت کے ماتحت آپ کو یہ لغات تصنیف کرنا پڑی جس میں اگرچہ آپ نے چند مستند کتب لغت سے استفادہ کیا ہے۔ اور اپنے مفید مطلب ومعانی کی تلاش میں دور کی کوڑی لائے ہیں۔ تاہم آپ نے اپنے چند مخصوص نظریات کو اس لغت میں بھر دیا ہے۔ ان کی تائید آپ کو لغت کی کسی کتاب میں نہ مل سکے گی اس لغت کی تصنیف کا فائدہ یہ ہوا کہ اب جب آپ کو قرآنی الفاظ کے نامانوس اور انوکھے معانی بتانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کے ساتھ اپنی لغت کا حوالہ دے دیتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(۲) لفظ آخرت کے بھی' چھ مفہوم ہیں۔ مستقبل بھی' کلی مفاد بھی۔ آخر الامر بھی آنے والی نسلوں کا مفاد بھی' حیات بعد الممات بھی اور حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں بھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ایمان بالغیب)

(۳) دنیا کا لفظ چار مفہوم ادا کرتا ہے۔ حال کی زندگی' ذاتی مفاد' مفاد عاجلہ اور موجودہ دنیا کی زندگی۔ (حوالہ ایضاً)

(۴) دین کے چار مفہوم ہیں: ① مکافات عمل (ن۔ ر ص۱۴۰)' ② بمعنی نظام ربوبیت (ایضاً ص۲۸۵)' ③ نظام ربوبیت کا قیام (ایضاً ص۱۱۵)' ④ "قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کا تحفظ" (لغات القرآن زیر عنوان ق۔ د۔ ر) اور ⑤ قانون مکافات حق (ن۔ ر ص۱۴۸) [1]

(۵) صلوۃ کے مفاہیم یہ ہیں: [1] صفات خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنا' [2] نظام ربوبیت کی بار بار یاد دہانی کرتے رہنا' [3] مسکین کو کھانا کھلانا' اور [4] مصلی وہ گھوڑا ہوتا ہے جو گھوڑ دوڑ میں اول نمبر پر آنے والے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ارکان اسلام)

(۶) زکوٰۃ کے تین مفہوم ہیں: ① اسلامی حکومت جو کچھ مسلمانوں سے لے لے وہ زکوٰۃ ہے' ② زائد از ضرورت مال مسلمان اسلامی حکومت کو دے دیں' ③ اسلامی حکومت جو ضروریات زندگی لوگوں کو دے وہ زکوٰۃ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے' قرآنی زکوٰۃ)

(۷) ملائکہ کے مفہوم پانچ ہیں: ① خارجی قوائے فطرت' ② داخلی قوتیں' ③ نفسیاتی محرکات' ④ طبعی تغیرات اور' ⑤ پروں والے فرشتے سے مراد ان کی قوت ہے۔ جتنے پر زیادہ اتنی قوت زیادہ (تفصیل کے لیے دیکھئے' فرشتوں پر ایمان بالغیب) ان سب مفاہیم میں قدر مشترک یہ ہے کہ فرشتوں کا خارجی وجود اور ذاتی تشخص نہیں ہے۔

(۸) لفظ جن کے پانچ مفہوم ہیں: [1] وہ آتشیں مخلوق جو انسان سے پہلے تھی' [2] دیہاتی لوگ' [3] غیر مرئی قوتیں' [4] انسانی جذبات' [5] ابلیس کی خوئے سرکشی۔

(۹) لفظ شیطان کے تین مفہوم ہیں۔ ① شیطان بمعنی شیطان (نظام ربوبیت ص۳۳۲)' ② بمعنی سرکش قوتیں (ایضاً ص۲۱۹)' ③ شیطان بمعنی ابلیسی معاشرہ (ایضاً ص۱۷۵)

(۱۰) لفظ سماء کے ۱۵ مفہوم ہیں اور

(۱۱) لفظ ارض کے ۱۶۔ تفصیل کے لیے دیکھئے اسی حصہ ششم کا تیسرا باب۔

---

[1] دین اور مذہب کے بے شمار "تقابلی مفاہیم" فکر پرویز عجمی شیوخ کی اثر اندازی میں گزر چکے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مفہوم ایک الفاظ بہت

اور اس خصوصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کسی غیر قرآنی لفظ کے لیے قرآن میں کئی الفاظ اپنی تائید کے لیے تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ ربوبیت ہے جو عربی زبان کا ہے مگر اس کا ذکر قرآن میں نہیں۔ آپ چونکہ نظام ربوبیت کے موجد ہیں۔ لہٰذا اپنی تائید کے لیے کئی لفظوں کا مفہوم قانون ربوبیت یا نظام ربوبیت بتاتے ہیں۔ پہلے تو آپ نے "چند قرآنی اصطلاحات" کے تحت ربوبیت کا ذکر کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ یہ لفظ بھی قرآن میں موجود ہے اور اس کا مفہوم یہ بتایا کہ:

"ربوبیت بمعنی کسی شے کا کامل نشوونما پا کر اپنی تکمیل کو پہنچ جانا یعنی اس کی مضمر صلاحیتوں کا پورے طور پر نشوونما پانا۔" (نظام ربوبیت' ص:۸۶)

پھر درج ذیل الفاظ کو اپنی تائید میں پیش فرمایا ہے۔

① رب بمعنی خدا کا قانون ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔ (ایضاً ص۸۶)

② آیات کے معنی بھی قانون ربوبیت ہے فرماتے ہیں: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ ﴾ (۱۰۵:۱۸) یہ وہ لوگ جو خدا کے قانون ربوبیت سے انکار کرتے ہیں اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں۔ (ق۔ن ر ص:۹۷)

③ لفظ بینة کے معنی بھی قانون ربوبیت ہے جیسے فرمایا: ﴿ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۸۵:۷) تمہارے پاس خدا کا قانون ربوبیت واضح انداز میں آچکا ہے۔ (ایضاً' ص:۹۴)

④ لفظ اللہ کا معنی بھی قانون ربوبیت ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا ﴾ (۳۰:۴۱) جن لوگوں نے خدا کے قانون ربوبیت کو اپنا نصب العین بنالیا اور اس راہ پر نہایت استقلال واستقامت سے گامزن ہو گئے۔ (نظام ربوبیت ص۲۴۲)

⑤ پھر کبھی کبھی لفظ اللہ کا معنی قانون ربوبیت کے بجائے نظام ربوبیت بھی بن جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ﴾ (۲۶۰:۲) نظام ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ (نظام ربوبیت' ص:۱۷۵)

⑥ پھر لفظ ربانیون کے معنی نظام ربوبیت کی حامل جماعت ہوتا ہے۔ (ایضاً)

اب بتایئے جہاں قرآن کے اتنے الفاظ نظام ربوبیت کا مفہوم پیدا کر رہے ہوں تو پھر بھی یہ نظام قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتا؟ اگر ربوبیت کا لفظ قرآن میں نہیں تو پھر کیا ہوا؟

۳۔ من نہ کردم شما حذر بکنید

طلوع اسلام کے لٹریچر میں یہ بات آپ کو بکثرت لکھی ہوئی ملے گی۔ کہ اس آسمان کے نیچے یقینی چیز صرف قرآن ہے۔ لہٰذا دین سب کچھ قرآن میں ہی ہے احادیث روایات سب ظنی ہیں۔ پرویز صاحب

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

محدثین سے اس لیے ناراض ہیں کہ انہوں نے احادیث کو دین کا جزو بنا دیا ہے۔ اور مفسرین سے اس لیے کہ وہ تورات وانجیل سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتب بھی تحریف شدہ اور ظنی ہیں۔ یہ تو آپ کا زبانی دعویٰ ہے اور عمل یہ ہے کہ آپ اپنا الو سیدھا کرنے کی خاطر ان تمام چیزوں سے استفادہ ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں حجت کے طور پر پیش فرمایا کرتے ہیں۔ اب چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(الف) انجیل سے استفادہ

حضرت عیسیٰ کا باپ: فرماتے ہیں:

"غور فرمایا آپ نے حضرت مسیح کے متعلق اناجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤد کی نسل سے تھا اور یہ سلسلہ یوسف نجار کی وساطت سے حضرت داؤد تک پہنچتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان سب ناموں کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام یوسف کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں" (معارف القرآن ج ۳ ص ۵۴۷)..... اب آیئے قرآن کریم کی طرف تو اس میں یہ تصریح کہیں بھی نہیں کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی۔" (معارف القرآن ج ۳ ص ۵۴۷)

اس اقتباس پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

① قرآن میں عیسیٰ ابن مریم یا مسیح ابن مریم کا ذکر کم وبیش تیس بار آیا ہے اور ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے ماں کا نام ہی لیا ہے باپ کا نام نہیں لیا۔ اگر حضرت عیسیٰ کا باپ فی الواقع یوسف تھا تو قرآن کو اس کا ذکر کرنے سے آخر کونسی چیز مانع تھی؟

② اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (۵:۳۳) انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو۔ اللہ کے ہاں یہی بات درست ہے۔ اب اگر حضرت عیسیٰ کا باپ تھا تو کیا اللہ نے اپنے اس بیان کردہ اصول کی (معاذ اللہ) خود ہی خلاف ورزی کیوں کی؟ یا آپ کا یہ خیال ہے کہ عیسیٰ کا باپ تو تھا مگر (نعوذ باللہ) اللہ کو اس کا علم نہ تھا؟

③ اگر کوئی بات قرآن میں بہ صراحت مذکور نہ ہو تو کیا تورات وانجیل قابل اعتماد اور یقینی بن جاتی ہیں کہ انہیں بطور دلیل اور ثبوت پیش کیا جا سکے؟

④ قرآن اور انجیل میں فرق یہ ہے کہ قرآن حضرت عیسیٰ کا نسب بواسطہ ماں (مریم) حضرت داؤد سے ملاتا ہے۔ جب کہ بعض اناجیل (وہ بھی ساری نہیں) بواسطہ یوسف نجار حضرت داؤد تک ملاتی ہیں۔ لیکن بعض دوسری اس کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً متی میں ہے کہ کنواری مریم [1] بچہ جنے گی۔ اسی طرح انجیل برنباس میں بھی یوسف نجار کا نام نہیں۔ پھر آپ ان اناجیل کو ترجیح کیوں دیتے ہیں۔ جن میں عیسیٰ کے باپ کا ذکر موجود ہے۔ حالانکہ دونوں غیر یقینی ہیں۔

---

[1] متی باب آیت ۱۸ تا ۲۳

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

⑤ اگر کوئی بات قرآن میں بصراحت مذکور ہو تو کیا آپ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں سب معجزات اور خرق عادت امور کا بصراحت ذکر ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں ذکر کر آئے ہیں تو کیا آپ نے انہیں تسلیم کر لیا ہے۔ اب ہم بتائیں گے کہ قرآن نے بہ صراحت کیوں ذکر نہیں کیا عیسیٰ کا باپ نہ تھا اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

① عیسائیوں کی اکثریت عیسیٰ کو اس دور میں بھی اور آج بھی بن باپ پیدائش کی قائل رہی ہے۔ اسی لیے وہ حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ چنانچہ سن ۹ ھ میں نجران کا جو عیسائی وفد مدینہ میں رسول اکرم ﷺ سے مناظرہ کرنے آیا تو اس کا سوال ہی یہ تھا کہ اگر عیسیٰ ابن اللہ نہیں تو بتاؤ ان کا باپ کون تھا؟ اس سوال کے جواب میں سورہ آل عمران کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ ٱللَّهِ كَمَثَلِ ءَادَمَ ﴾ "عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے ہاں آدم جیسی ہے۔" (آل عمران ۳/ ۵۹)

یعنی عیسیٰ اور آدم دونوں بن باپ پیدا ہوئے۔ پھر اگر آدم ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہو کر بھی ابن اللہ نہیں بن سکتا تو عیسیٰ ابن اللہ کیسے بن سکتے ہیں؟

② مسلمان وحی الٰہی کے مطابق حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدائش کے قائل تھے اور آج تک قائل ہیں۔ سورہ آل عمران آیت ۴۶' سورہ مریم آیت نمبر ۲۰ دو مقامات پر قرآن میں مذکور ہے۔ کہ حضرت مریم کو کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ اس کے باوجود حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ اب پرویز صاحب اس وحی الٰہی سے کیوں انحراف فرماتے ہیں کہ سورہ آل عمران کی مذکورہ آیت کا مفہوم بیان کرتے وقت الفاظ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ کا مفہوم یا معنی بیان کرنا ہی گول کر جاتے ہیں (مفہوم القرآن ص ۱۴۹) اور سورہ مریم میں اس کا معنی تو بیان کرتے ہیں مگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے حضرت مریم کی شادی کر لیتے ہیں۔ (مفہوم القرآن' ص: ۶۸۱)

③ یہود ان کا باپ تو مانتے تھے۔ مگر یوسف نجار کو باپ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام کو ولد الحرام کہتے تھے۔ اب اسی چیز کی بھرپور تائید کی قرآن کو ضرورت تھی اور وہ اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے۔ یہودیوں سے ہی کچھ عیسائی متاثر ہوئے تو انہوں نے عافیت اس میں سمجھی کہ یوسف نجار کو ان کا باپ تسلیم کر لیا جائے۔ جیسا کہ صلیب کے معاملہ میں بھی کچھ عیسائی جزوی طور پر یہودیوں کے ہم خیال بن گئے تھے۔ حالانکہ قرآن آپ کی سولی کے ذریعے وفات پانے کی بھرپور تردید کرتا ہے۔

پھر جب یہ بات مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں میں مسلم تھی کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے تو قرآن کو خواہ مخواہ اس بات کی صراحت کی کیا ضرورت تھی۔ جو جانبین میں پہلے سے ہی مسلم تھی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(ب) تورات سے استفادہ

انتظام یوسفی : پرویز صاحب کو جب نظام ربوبیت کو ثابت کرنے کے سلسلے میں "عدم جواز ملکیت زمین" کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے تورات سے استفادہ فرمایا۔ کچھ اس میں کتر بیونت کی اور توراۃ کی جس آیت سے ملکیت زمین کا جواز ثابت ہوتا تھا اس کو چھوڑ گئے۔ یہ تفصیل چونکہ ہم ملکیت زمین کے تحت پیش کر چکے ہیں لہٰذا اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے سردست کہنے کی بات یہ تھی کہ اگر مفسرین تورات سے کوئی اقتباس لیں تو وہ مجرم اور ناقابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن اگر آپ بھی وہی کام کریں اور حلیہ بگاڑ کر ذکر کریں تو آپ کے لیے سب کچھ جائز ہے۔

(ج) روایات سے استفادہ

قرآن کی ترتیب : پرویز صاحب کی اپنی اور پورے ادارہ طلوع اسلام کی زندگی حدیث کو ظنی' ناقابل اعتماد اور دین سے خارج قرار دینے میں گزری ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ آپ احادیث و روایات کے بغیر "قرآن کی محفوظیت" اور اس کی موجودہ ترتیب کو بھی درست ثابت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

"آپ سوچئے تو کہ اگر حدیث و روایات سے انکار کر دیا جائے تو پھر قرآن کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ آخر یہ بھی تو روایات ہی کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ نے قرآن کو موجودہ شکل میں ترتیب دیا۔" (م- ج ۳۴۰)

بات تو پرویز صاحب نے درست کی' مگر ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ جس شخص کی عمر حدیث دشمنی میں گزری ہو کیا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کی محفوظیت اور ترتیب تک کے لیے روایات ہی کا سہارا لے؟ ظنی چیز سے جو کچھ بھی ثابت ہو گا وہ بھی ظنی ہی ہو گا۔ یقینی نہیں ہو سکتا۔

حدیث سے استفادہ کی بہت سی مثالیں آپ کو اس کتاب میں مل جائیں گی اور حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ضعیف سے ضعیف تر روایت بھی آپ کے نزدیک معتبر اور قابل احتجاج بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ آپ کے کسی نظریہ کی تائید کر رہی ہو۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ "اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک کی وجہ سے مرجائے تو قیامت کو مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی۔"

اب یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ پھر یہ قول بھی سند کے لحاظ سے ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک یہ بہت صحیح روایت ہے کیونکہ یہ اشتراکیت کے ثبوت کے لیے مفید چیز ہے۔ اشتراکی حضرات اور پرویز صاحب دونوں بکثرت اس روایت کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس روایت کے ناقابل احتجاج ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اسلام میں کتوں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کی کفالت کا کوئی تصور نہیں۔

۴۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار

اس سلسلہ میں آپ کئی قسم کے اقدامات فرماتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) غلط العام الفاظ سے استفادہ: (۱) ظن کا لفظ ہماری زبان میں شک اور وہم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ عربی میں یہ یقین کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال شک اور وہم کے معنوں میں بھی ہوا ہے۔ تاہم یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یقین کے معنوں میں اس کا استعمال زیادہ دفعہ ہوا ہے اور اس کی وضاحت ہم نے متعلقہ مقام پر کر دی ہے۔ اب چونکہ بعض محدثین نے حدیث کو ظنی علم کہا ہے۔ جس سے ان کی مراد مفید علم نظری ہوتی ہے لیکن پرویز صاحب اس لفظ کے ہمارے ہاں مروجہ مفہوم کو بیان کر کے اس سے حدیث سے بیزاری اور نفرت کا کام لیتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک دوسرا لفظ مذہب ہے جس کا عربی میں مفہوم کسی ایک فقہی مذہب کو اختیار کرنا ہے۔ مذاہب اربعہ سے مراد حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (Relegion) کے معنوں میں آتا ہے۔ یعنی جس طرح ہندو ازم، سکھ ازم اور عیسائیت اور بدھ ازم وغیرہ مذاہب ہیں۔ اسی طرح اسلام بھی ایک مذہب ہے۔ دوسرے مذاہب میں صرف انفرادی طور پر پوجا پاٹ کرنے سے مذہب کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جبکہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے اور اس کے تقاضے اور بھی بہت سے ہیں۔ اب پرویز صاحب نے اس غلط مفہوم سے یہ فائدہ اٹھایا کہ لوگوں کو بتایا کہ جب تک خلافت راشدہ کا دور رہا تو اسلام دین تھا پھر جب روایات کا چرچا ہوا تو اسلام ایک مذہب بن گیا اور یہ اسی حدیثی یا روایتی اسلام کا ثمر ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف انفرادی پوجا پاٹ کا نام رہ گیا ہے اور جب تک اس روایتی یا حدیثی اسلام سے گلوخلاص نہ کرائی جائے اسلام دین نہیں بن سکتا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کی ذلت و نکبت دور ہو سکتی ہے۔

مذہب کے لفظ سے پرویز صاحب کی یہ فریب دہی کئی لحاظ سے غلط ہے۔ مثلاً:

① ذخیرہ احادیث و روایات میں عبادات ہی کا ذکر نہیں بلکہ عقائد، معاملات، مناکحات، جہاد، جہانبانی اور عدالت اور عقوبات سب باتوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ علاوہ ازیں عبادات کی بھی اجتماعی شکل کو نمایاں طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔

② جن لوگوں نے اس حدیثی یا روایتی اسلام کو قبول کیا تھا۔ انہی لوگوں نے آٹھ نو صدیوں تک دنیا پر نہایت جاہ و حشمت سے حکومت کی ہے۔ لہٰذا یہ مفروضہ غلط ہے اور اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔

③ انگریز کی غلامی کے گئے گزرے دور میں بھی سید شہید اور مولانا شہید نے علم جہاد بلند کیا۔ کامیاب تحریک چلائی اور حکومت بھی قائم کر لی۔ حالانکہ یہ لوگ اس روایتی اسلام کے متبع تھے اس سے بھی یہی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ثابت ہوتا ہے کہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ یہ روایتی یا حدیثی اسلام نہیں بلکہ بدعی عقائد کا فروغ اور حدیثی اسلام سے بیزاری اور فرقہ بندی و فرقہ پرستی ہیں۔ جس میں خود طلوع اسلام بھی برابر کا شریک ہے۔

۴۔ کتاب اللہ : یہ لفظ بھی اسی قبیل سے ہے جس کا عام مفہوم "قرآن مجید سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کا صحیح مفہوم منزل من اللہ جملہ احکامات ہیں۔ خواہ یہ قرآن میں درج ہیں یا احادیث میں۔ اس کی تفصیل "حسبنا کتاب اللّٰہ" میں گزر چکی ہے۔

۵۔ مباشرت : یہ لفظ بھی چونکہ قرآن میں کنائی معنوں (یعنی مجامعت کے معنوں) میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا عوام میں اس کا یہی کنائی معنی مشہور ہو گیا۔ جبکہ اس کا لغوی معنی ایک کا اپنی جلد کو دوسرے کی جلد سے لگانا ہے۔ حدیث میں یہ لفظ اپنے حقیقی معنوں [1] میں بھی آیا ہے۔ یعنی روزہ کی حالت میں انسان اپنی بیوی سے مساس تو کر سکتا ہے۔ لیکن مجامعت نہیں کر سکتا۔ طلوع اسلام نے اس غلط العام مفہوم سے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا اور عوام کو ذخیرہ احادیث سے متنفر کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(ب) یک چشمی : قرآن میں غور و فکر کرنے اور عقل کے استعمال کی دعوت دی گئی ہے' تاکہ کافر کائنات کے کارخانہ کا محیر العقول نظام دیکھ کر اسلام لائیں اور جو اسلام لا چکے ہیں ان کا ایمان مضبوط ہو' لیکن جب وحی کے ذریعے کسی بات کا فیصلہ کر دیا۔ یا حکم دے دیا جاتا ہے۔ تو پھر ایسے مقامات پر عقل کا استعمال حرام اور اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اب طلوع اسلام چونکہ اپنے آباء کی تقلید میں عقل کی برتری کا قائل ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ ایسی آیات سامنے لائے گا۔ جن میں عقل کے استعمال اور غور و فکر کا ذکر ہو اور جن آیات سے عقل پر بندش ثابت ہوتی ہے۔ ان کا کبھی ذکر نہیں کرے گا۔ مثلاً پرویز صاحب کا ایک نظریہ یہ ہے کہ مومن کی دنیا کی زندگی کا خوشحال ہونا ضروری ہے' بلکہ یہی دنیا کی خوشحالی ان کی آخرت کی زندگی کی کامیابی کا معیار اور ضمانت ہے۔ یہ وہی مردود نظریہ ہے جو کفار اور مترفین انبیاء کے سامنے پیش فرماتے رہے۔ صرف الفاظ کی تبدیلی ہے وہ کہتے تھے کہ ہم اس لیے خوشحال ہیں کہ اللہ ہم پر خوش ہے اور اگر اس دنیا میں خوش ہے تو آخرت کی زندگی اگر ہے تو اس میں کیوں ہم سے ناراض ہو گا اور ہمیں کیوں عذاب دے گا؟ اب طلوع اسلام کی روش یہ ہے کہ صرف ایسی آیات کا ذکر کرتا ہے۔ جن میں مومن کی خوشحالی یا کامیابی کا ذکر ہے اور جن آیات میں مومنوں پر تنگ دستی' ابتلاء اور شدائد کا ذکر ہے وہ کبھی ذکر نہیں کرے گا گویا پرویز صاحب کسی معاملہ کے ایک پہلو کو خوب واضح کر دیتے ہیں اور دوسرے کو بالکل اوجھل رکھ کر قاری کو فریب دیا کرتے ہیں۔

یک چشمی کا دوسرا شاہکار۔ آپ کا مضمون "حصول جنت--- احادیث کی رو سے" ہے۔ جس کا جواب ہم اپنے الگ مضمون "حصولِ جنت" کے تحت تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

علاوہ ازیں ذات و صفات باری تعالیٰ' مسئلہ تقدیر' نکاح نابالغاں' اطاعت والدین' قربانی' وغیرہ بے شمار

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ایسے مسائل ہیں۔ جنہیں آپ یک چشم ہو کر ہی پیش فرمایا کرتے ہیں۔ ان مسائل میں اکثر کا جواب ہم مناسب مقامات پر تفصیل دے چکے ہیں۔

(ج) وقیع الفاظ کا استعمال: جب آپ کوئی بے ہودہ یا غلط قسم کا تصور یا نظریہ قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہوں تو اسی نسبت سے وقیع الفاظ استعمال فرمایا کرتے ہیں۔ مثلاً آپ قاری کے ذہن میں یہ مفہوم اتارنا چاہتے ہیں کہ "صراط مستقیم" سے مراد وہ راستہ ہے جس پر زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی انسان تک پہنچی اور اب آگے بڑھ رہی ہے۔ اب آپ اسے اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

"آپ نے صراط مستقیم سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ قرآن سے پہلے ذہن انسان کی دَوری حرکت کا قائل تھا۔ جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا..... (یہ مکمل عبارت "نظریہ ارتقاء" حصہ دوم میں ملاحظہ فرمایئے)

دیکھا آپ نے کہ صراط مستقیم کی یہ جامع اصطلاح کتنے زبردست اور اہم نکات کی حامل ہے اور وہ اہم نکات یہ ہیں۔

① قرآن سے پہلے پہلی ساتویں صدی عیسوی سے پہلے ذہن انسان کی دَوری حرکت کا قائل تھا۔ (اس کا ثبوت؟)

② قرآن نے زندگی کا حرکیاتی تصور پیش کیا یعنی وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

③ زندگی اپنا توازن قائم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور یہ راہ سیڑھی کی طرح سیدھی بھی ہے اور اوپر چڑھنے والی بھی کیونکہ خدا خود سیڑھیوں والا ہے۔

④ انسان اس زندگی کی راہ یا صراط مستقیم پر چھلانگیں لگاتا ہوا حدود اقطار السموات والارض سے آگے بھی جا سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ چار اہم نکات جو صراط مستقیم کی جامع اصطلاح میں پوشیدہ تھے' مگر افسوس کہ پرویز صاحب سے پہلے ان اہم نکات کا نہ اللہ کے رسول کو علم ہوا اور نہ صحابہ' کسی عالم یا امام کو حتیٰ کہ کسی معتزلہ کو بھی نہ ہوا۔ کیونکہ ارتقائی منازل کو طے کرانے کی ضرورت ہی ڈارون کے بعد پیش آئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جن سابقین کو ان اہم نکات کی سمجھ ہی نہ آ سکی ان کی زندگی کیسے یہ صراط مستقیم تلاش کرے گی؟

۲۔ قیام صلوٰۃ: "قیام صلوٰۃ قرآن کی ایک نہایت جامع و بلیغ اصطلاح ہے۔ اس سے مقصود درحقیقت اس معاشرے کا قیام ہے۔ جس میں قانون خداوندی عملاً نافذ ہو اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوتا ہوا ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے..... اس نظام کی بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے' تاکہ اس نظام یا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

نظام ربوبیت کے مختلف اصول و مبانی اجاگر ہوتے رہیں۔ اسی یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا فریضہ موقتہ ہے یعنی خاص اوقات کا اجتماع صلوٰۃ..... آپ نے دیکھ لیا کہ اجتماع صلوٰۃ درحقیقت پورے کے پورے دین کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ اس ذرا سے نگینے میں پورا تاج محل جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ (قرآنی فیصلے' ص: ۱۹ تا ۲۴)

دیکھا آپ نے "نظام صلوٰۃ یا قیام صلوٰۃ کی نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح" سے کتنے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ چند اہم نکات یہ ہیں۔

① یہ صلوٰۃ کا قیام مسئلہ ارتقاء کو بھی برحق ثابت کرتا ہے اور نظام ربوبیت کو بھی۔

② قیام صلوٰۃ ایک ایسا چھوٹا سا نگینہ ہے۔ جس میں جھانکتے ہی مسئلہ ارتقاء اور نظام ربوبیت دونوں تاج محل کی طرح جھلمل جھلمل کرتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں جو کہ پورے کے پورے دین کا خلاصہ یا سمٹی ہوئی شکل ہیں۔

③ قیام صلوٰۃ کا مقصد نظام ربوبیت اور ارتقاء کے اصول و مبانی کی یاد دہانی ہوتی ہے اور سب مسلمان اکٹھے مل بیٹھ کر کرتے ہیں۔ اس قیام صلوٰۃ کا مقصد نہ اللہ کا ذکر ہوتا ہے نہ اس کی عبادت۔ لہٰذا ایسی یاد دہانی کے لیے ہمارے خیال میں نہ وضو اور طہارت کی ضرورت رہ جاتی ہے نہ خاص طور پر کسی مسجد میں جانے کی۔

اب اس نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح کا اس سے زیادہ فائدہ ہو بھی کیا جا سکتا ہے کہ مسجد کی پانچ دفعہ حاضری سے چھٹی مل جاتی ہے۔ نہ وضو کی ضرورت نہ طہارت کی پابندیاں بس کسی جگہ اکٹھے ہو کر ایک شخص تقریر کر کے نظام ربوبیت کے اصول و مبانی بیان کرتا جائے اور دوسرے سنتے جائیں تو اجتماع صلوٰۃ کا موقت فریضہ ادا ہو گیا۔ ایسے ہی اجتماعات وہ نگینہ ہیں۔ جس میں پورے کے پورے دین کا تاج محل جھلمل جھلمل کرتا نظر آ جاتا ہے۔

۵- کہیں سے اینٹ کہیں سے روڑا

ایک اور نمایاں خصوصیت آپ کے کلام کی یہ ہے کہ آپ ایک پیراگراف میں قرآن کی پانچ سات سورتوں کی مختلف آیات میں اپنا مافی الضمیر شامل کر کے اسے مربوط بناتے اور پھر اسے قرآنی سند عطا فرما دیتے ہیں۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہم "نظام ربوبیت کا فلسفہ اور تشریف آوری" کے ذیلی عنوان "تفسیری انداز" میں پیش کر چکے ہیں۔ جن پر یہ شعر بالکل فٹ بیٹھتا ہے ؎

کہیں سے اینٹ کہیں سے روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا!!!

۶- تضاد بیانی

ویسے تو آپ کا سارا لٹریچر ہی تضاد بیانی پر شاہد ہے اور اس کی بہت سی مثالیں اس کتاب میں آپ کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

متفرق مقامات پر بھی مل جائیں گی نیز ایک لفظ کے مختلف مقامات پر الگ الگ مفہوم بیان کرنا بھی تضاد بیانی ہی کی ایک شکل ہے۔ تاہم ازراہ تفنن چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

(الف) جنّ

جنوں کے متعلق آپ نے جو تحقیق فرمائی ہے۔ اس سے متعلق چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

پہلا اقتباس: جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ، مستور، اوجھل، غیر مرئی۔ جب یہ کرۂ ارض سورج سے جدا ہوا تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ تبدل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی۔ اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی..... اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس پر ہمارا ایمان ہے۔" (آدم و ابلیس، ص:۹۷)

دوسرا اقتباس: جن و انس انسانوں کی ہی دو جماعتیں ہیں۔ انس شہروں کی مہذب آبادی اور جن صحرا کے بادیہ نشین۔ جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں جن و انس کا ذکر ہو گا۔ ان سے مراد انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہوں گی۔ (ایضاً، ص:۱۰۸)

اب دیکھئے پہلے اقتباس کی رو سے جن ایک آتشیں مخلوق اور انسان سے پہلے تھی۔ جس پر قرآن کی رو سے ایمان لانا چاہیئے۔ دوسرے اقتباس کی رو سے جن آج بھی موجود ہیں۔ اور چونکہ انسانوں کی ہی قسم ہے۔ لہٰذا خاکی ہوئے پھر دیہاتی لوگ چونکہ نظر بھی آ جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ جن کی تعریف سے خارج بھی ہوئے۔ اب قرآن کی رو سے شاید ان دیہاتی لوگوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہو؟ یہ بات پرویز صاحب ہی بتلا سکتے ہیں۔

تیسرا اقتباس: اب قابل غور مسئلہ یہ رہ گیا کہ جب جن قصہ پارینہ بن گئے تو پھر ٹیک کہاں سے پڑے اور کب ٹیکے؟ یہ تحقیق بھی حاضر خدمت ہے۔

"ہر وہ قوت جو انسانی نگاہوں سے اوجھل ہو (مثلاً بجلی، حرارت، ہوا۔ مؤلف) جن کہلاتی ہے اور انسانی جذبات چونکہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ (مثلاً رحم، غصہ، خوش ذوقی، شفقت۔ مؤلف) اس لیے اس اعتبار سے انہیں جن کہا گیا ہے۔" (ایضاً، ص:۹۰)

اب دیکھئے اس اقتباس کی رو سے جن نہ تو قصۂ پارینہ رہتے ہیں اور نہ دیہاتی لوگ بلکہ یہ غیر مرئی قوتیں ہیں۔ یا انسانی جذبات۔ غیر مرئی قوتوں کی پیدائش کا علم نہیں کہ کب پیدا ہوئی؟ البتہ انسانی جذبات انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوئے۔ لہٰذا اس اقتباس کی رو سے جن قصہ پارینہ نہیں نہ ان پر ایمان لانا ضروری

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ہے' بلکہ جو شے بھی غیر مرئی ہو۔ بس وہ جن ہے جیسے انسان کی عقل' فہم بیماری وغیرہ وغیرہ۔

چوتھا اقتباس: اب جنوں کے ساتھ چونکہ ابلیس کا بھی تعلق ہے۔ اب پرویز صاحب جن کی تخلیق کو اس سے وابستہ فرماتے ہیں:

"ابلیس نے جو اپنے متعلق کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اس کی خوئے سرکشی کی طرف اشارہ تھا۔" (ایضاً' ص: ۹۰)

گویا لفظ جن کے پانچ مفہوم ہوئے: ① آتشیں مخلوق جو انسان سے پہلے تھی اور اس پر ایمان لانا چاہیئے۔ ② دیہاتی لوگ۔ ③ غیر مرئی قوتیں۔ ④ انسانی جذبات۔ ⑤ ابلیس کی خوئے سرکشی باقی چار مفہوموں پر شاید ایمان لانے ضرورت نہیں۔

اب جو جنوں کے سلسلہ میں ابلیس کا ذکر چھڑ گیا۔ تو ابلیس کے متعلق پرویزی تحقیق بھی ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں:

ابلیس؟: "آدم مایوس ہو گیا۔ ابلیس ابلاس سے ہے جس کے معنی ہی مایوسی اور ناامیدی ہے۔" (نظام ربوبیت' ص: ۲۳۶)

پرویز صاحب کی اس عبارت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ آدم (نعوذ باللہ) ابلیس ہو گیا۔

(ب) مردوں کی حاکمیت

آپ مردوں کی عورتوں پر حاکمیت تسلیم نہیں کرتے اور آیت ﴿ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ (۴:۳۴) پر "طاہرہ کے نام خطوط" کے ص: ۴۵ سے ص: ۵۸ تک طویل بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ موجودہ تراجم و تفاسیر سب غلط ہیں۔ تراجم اس لیے غلط ہیں کہ وہ عربی تفسیروں کا سا مفہوم بیان کرتی ہیں۔ اور عربی تفسیریں اس لیے غلط ہیں کہ وہ روایات کی تائید پر لکھی گئی ہیں اور روایات اس لیے غلط ہیں کہ وہ ظنی ہیں یقینی نہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے جو صحیح مفہوم بیان فرمایا وہ یہ ہے کہ:

① اس آیت میں بات میاں بیوی کی ہے ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے عام مردوں اور عورتوں کی ہے اور مرد عورتوں کو صرف روزی مہیا کرنے کے کفیل ہیں۔ ان پر حاکم نہیں۔

② اس آیت ﴿ فالصٰلحٰت ﴾ کے معنی نیک عورتیں نہیں بلکہ وہ عورتیں ہیں جن کی صلاحیتیں (روزی حاصل ہونے کے بعد) نشوونما پا رہی ہیں۔

③ ﴿ قٰنِتٰتٌ ﴾ کے معنی خاوندوں کی فرمانبردار نہیں' بلکہ ان صلاحیتوں کو مصرف میں لانے والی ہیں۔

④ ﴿ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ کے معنی مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی نہیں' بلکہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اس جنین کی حفاظت کرتی ہیں جو ان کے رحم میں ہے۔

⑤ عورتوں کی نافرمانی سے مراد اپنے خاوندوں کی نافرمانی نہیں' بلکہ اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال ہے۔

⑥ نافرمانی کی صورت میں سمجھانے کا حکم خاوندوں کے لیے نہیں بلکہ معاشرہ کے لیے ہے۔

⑦ انہیں بستروں میں علیحدہ چھوڑنے کا حکم ان کے خاوندوں کے لیے نہیں بلکہ یہ نظر بندی کی سزا ہے جو جو انہیں معاشرہ یا حکومت دے سکتی ہے۔ اور

⑧ نافرمانی سے باز نہ آنے کی صورت میں انہیں مارنے کا تعلق ان کے خاوندوں سے متعلق نہیں' بلکہ عدالت انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔ (طاہرہ کے نام خطوط' ص: ۵۷)

یہ تو آپ کا ایک بیان تھا۔ اب : ﴿ وَاهْجُرُوْ هُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ ﴾ کا دوسرا بیان مفہوم القرآن سے ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں کہ:

"تو اگلا اقدام یہ ہونا چاہیئے کہ ان کے خاوند ان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اسی نفسیاتی اثر سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔" (مفہوم القرآن' ج:۱' ص:۱۸۹)

گویا مفہوم القرآن کے بیان نے "طاہرہ کے نام خطوط" کے پورے بیان کی تردید کر دی۔ وہ یوں کہ اگر اس جملہ میں ضمیر جمع مذکر غائب خاوندوں کی طرف ہے۔ تو اس فَعِظُوْهُنَّ اور اضْرِبُوْهُنَ کی ضمیر بھی لامحالہ خاوندوں کی طرف ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں بات میاں بیوی ہی کی چل رہی ہے نہ کہ عام عورتوں اور عام معاشرہ یا حکومت یا عدالت کی۔

(ج) احکام میراث

پہلا اقتباس جو انفرادی ملکیت کی بھرپور تائید کرتا ہے درج ذیل ہے (واضح رہے کہ یہاں آپ روایات اور فقہ کی غلطیاں بیان فرما رہے ہیں۔)

"اسی مسئلہ وراثت کو لیجیے قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر (؟) ان تمام مصالح کو ختم کر دیا۔ پھر قانون وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآن مجید کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آباؤ اجداد کی جائیدادوں سے محروم ہو گئے۔" اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے تو کروڑوں انسانوں کو جائیداد کا جائز وارث بنایا تھا۔ مگر فقہ اور روایات نے انہیں محروم کر دیا ہے۔

اب دوسرا اقتباس جو خالص قرآنی فکر کا حامل ہے۔ اس کے مطابق آپ سرے سے انفرادی جائیداد کے ہی قائل نہیں رہتے اور اس کی رو سے کروڑوں کیا سارے کے سارے ہی مسلمانوں کو جائیداد سے محروم کر دینا چاہتے ہیں (واضح رہے کہ اس مقام پر آپ قرآنی نظام ربوبیت کو ذہن نشین کرا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

"قرآنی نظام ربوبیت میں چونکہ انفرادی ملکیت اشیائے صرف تک ہی محدود ہوتی ہے۔ لہٰذا ان احکام کا اطلاق صرف انہی اشیاء پر ہوگا یعنی انسان کا لباس بستر فرنیچر وغیرہ اور یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہوں گی۔ اگرچہ اس کی اولاد اس کی بھی محتاج نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی تمام ضروریات تو معاشرہ پوری کر رہا ہوگا۔ (نظام ربوبیت' ص:۲۲۹)

(د) قرآنی نظام ربوبیت

نظام ربوبیت کے قیام کے متعلق ہم نے س کتاب کے مضمون "نظام ربوبیت کا فلسفہ اور تشریف آوری" کے ذیلی عنوان "نظام ربوبیت کی تاریخ" میں پرویز صاحب کے پانچ اقتباس نقل کیے ہیں جن میں۔

① پہلے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے اس نظام کی تشکیل فرمائی ہوگی۔ (معاملہ شک میں ہے)۔ (نیز دیکھئے' نظام ربوبیت' ص:۳۲۳-۳۲۴)

② دوسرے اقتباس سے آپ پورے وثوق سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے یہ نظام متشکل فرمایا تھا۔ (ایضاً' ص:۱۸۰)

③ تیسرے اقتباس میں آپ فرماتے ہیں کہ دور نبوی میں یہ نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں انسان کی ذہنی سطح ہنوز اس قابل نہ تھی کہ نظام ربوبیت کے اصولوں کو سمجھ سکے۔ (ایضاً' ص:۳۲۴)

④ چوتھے اقتباس میں آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ تو کیا سب انبیاء پر یہی نظام ربوبیت نازل ہوتا رہا ہے۔ (ایضاً' ص:۱۹)

⑤ اور پانچویں اقتباس میں آپ نے اعتراف فرمایا ہے کہ اس نظام ربوبیت کے موجد پرویز صاحب خود ہیں۔ کیونکہ اس نظام کی ضرورت ہی آج کے دور میں محسوس ہوئی ہے۔ ایضاً (مقدمہ ص ۲۴)۔

(۵) تصوف کی بنیاد

پہلا رُخ۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اسے (یعنی وحی جلی وخفی کے عقیدہ کو) امام شافعی نے وضع کیا تھا آپ عسقلان کے صوبہ میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں مصر میں انتقال کیا۔ وحی کی مذکورہ بالا دو اقسام کی سند کے لیے ایک روایت (وہی مثلہ معہ والی) بھی وضع کی گئی۔ (تصوف کی حقیقت ص ۵۲)

"ایک عقیدہ یہ بھی وضع کیا گیا کہ وحی جلی تو بالفاظہ نازل ہوتی تھی لیکن وحی خفی کو صرف خیالات کی شکل میں القا کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے اس وحی کو الہام کہہ کر پکارا جاتا ہے اور یہی الہام ہے جس کے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا سلسلہ رسول کے بعد بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ عقیدہ تصوف کی بنیاد قرار پایا۔" (ایضاً ص ۵۳)..... ہمارے ہاں وحی خفی (یعنی علم بلا الفاظ کا عقیدہ بھی مسلسل چلا آرہا ہے۔ اور غیر از نبی کی طرف الہام کا بھی۔ اور یہی عقیدہ تصوف کی بنیاد ہے ہم نے اوپر کہا ہے کہ امام شافعی نے وحی خفی کا عقیدہ وضع کیا تھا۔ (ایضاً' ص:۵۴)

مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ وحی خفی اور الہام کو ایک ہی چیز قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ وحی خفی کا تعلق رسول سے ہوتا ہے۔ اور الہام کا عام لوگوں سے الہام عام ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کو ہو سکتا ہے اور جب یہ الہام نبی کو ہوگا تو وحی خفی کی صورت میں ہوگا۔ گویا وحی خفی کی ایک شکل بصورت الہام بھی ہوتی ہے۔ اور یہ ختم ہو چکی ہے تاہم آپ نے ان دونوں (یعنی وحی خفی اور الہام کو ایک سطح پر رکھ کر اسے اواخر دوسری صدی ہجری کا وضعی عقیدہ قرار دیا ہے جو تصوف کی بنیاد ہے۔

دوسرا رخ: "قرآن اور حدیث میں تصوف اور صوفی کے الفاظ تک نہیں ملتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ ابو ہاشم عثمان بن شریک کوفی تھا۔ صوفیوں کی پہلی خانقاہ سن ۱۴۰ھ میں رملہ (واقع فلسطین) کے قریب قائم ہوئی۔ وہ کوفہ سے اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا جہاں سن ۱۶۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔" (ایضاً' ص:۷۲)

گویا تصوف کی بنیاد تو سن ۱۶۰ھ کے بعد فراہم ہوئی لیکن اس پر عمارت سن ۱۴۰ھ تک تیار ہو کر رملہ کی خانقاہ کی شکل میں سامنے آچکی تھی۔ اب اگر تصوف کی بنیاد وحی خفی یا الہام کا وضعی عقیدہ سمجھا جائے تو یہ عمارت دوسری صدی کے آخر میں بننی چاہیئے۔ اور اگر عمارت کا سن ۱۴۰ھ میں وجود تسلیم کیا جائے تو تصوف کی بنیاد کچھ اور ہی ہونی چاہیئے نہ کہ وحی خفی یا الہام کا وہ عقیدہ جسے امام شافعی نے وضع کیا تھا۔

۷۔ سوال گندم جواب چینا

۱۔ نمازوں کی تعداد: جب کوئی شخص پرویز صاحب سے ایسا سوال پوچھ بیٹھے جس کا آپ کوئی واضح جواب نہ دے سکتے ہوں تو آپ سائل کے سامنے کچھ غیر متعلقہ معلومات کا ذخیرہ پھینک دیتے اور ایسی بھول بھلیوں میں الجھا دیتے ہیں کہ اس بے چارے کو یہ خیال ہی نہ رہے کہ اس کا اصل سوال کیا تھا؟ کسی شخص نے نمازوں کی تعداد کے متعلق سوال کیا تھا کہ قرآن میں نماز کی ادائیگی کی تاکید تو موجود ہے مگر نمازوں کی تعداد' رکعات' ترتیب وغیرہ کسی چیز کا بھی ذکر نہیں تو پھر وحی خفی کو ماننے کے بغیر کیا چارہ کار ہے۔

اس سوال کا جواب آپ نے عنایت فرمایا۔ "یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا کچھ ہے۔ سردست آپ اتنا دیکھئے کہ وحی خفی کی حقیقت کیا ہے جس کی رو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔" (قرآنی فیصلے ص۱۵)۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اس کے بعد آپ وحی خفی کی حقیقت بخاری شریف کی حدیث معراج سے درج کر کے یہ ثابت فرما دیتے ہیں کہ یہ حدیث کسی یہودی کی وضع کردہ ہے کیونکہ اس سے حضرت موسیٰ کی رسول اکرم پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اور آخر میں لکھتے ہیں "بہرحال یہ ہے نمونہ اس وحی خفی کا جس کی رو سے مولوی صاحبان کے مذہب کے مطابق وہ احکام متعین ہوتے تھے۔ جن کا ذکر انہیں وحی جلی میں نہیں ملتا۔" (ایضاً ص ۱۶)

اب اگر سائل آپ سے یہ پوچھتا کہ وحی خفی کی حقیقت کیا ہے؟ تو آپ کا یہ جواب' جیسا کچھ بھی ہے برمحل تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا اصل سوال یہ تھا کہ قرآن کی رو سے نمازوں کی تعداد کیا ہے؟ جس کے متعلق آپ نے یہ فرما دیا کہ "یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے" اور یہ پھر کبھی عرض کرنے کا وعدہ آپ نے آج تک پورا نہیں فرمایا۔

۲۔ قرآن کا مستند نسخہ: بعض دفعہ پرویز صاحب ایک دعویٰ کرتے ہیں تو اس کی دلیل ایسی پیش فرماتے ہیں کہ دعویٰ اور دلیل میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں کہ:

"اس طرح یہ کتاب (قرآن) ساتھ کے ساتھ محفوظ ہوتی چلی گئی اور جب نبی اکرم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو یہ بعینہٖ اسی شکل اور اسی ترتیب میں جس میں یہ اس وقت ہمارے پاس ہے۔ لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود اور ہزاروں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اس کی ایک مستند کاپی (Master Copy) مسجد نبوی میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا جس میں نبی اکرم سب سے پہلے وحی لکھواتے تھے اسے ام یا امام کہتے تھے۔ اور اس ستون کو اسطوانہ مصحف کہا جاتا تھا۔ اسی ستون کے پاس بیٹھ کر صحابہ کرام نبی اکرم کی زیر نگرانی اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہو گئی کہ نبی اکرم نے اپنے آخری خطبہ حج (حجۃ الوداع) کے خطبہ میں لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا۔ کیا میں نے تم کو خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟ تو چاروں طرف سے یہ فضا گونج اٹھی کہ ہاں آپ نے پہنچا دیا ہے۔" (طلوع اسلام' فروری ۸۲' ص ۱۱)

اب دیکھئے دعویٰ یہ ہے کہ حضور اکرم کی وفات کے وقت قرآن کریم کے موجودہ ترتیب کے لحاظ سے لاکھوں نسخے امت کے افراد کے پاس موجود تھے اور دلیل پیش فرما رہے ہیں لاکھوں افراد تک پیغام پہنچانے کا اور وہ بھی روایات سے کیا اس پیغام رسالت کے پہنچانے کے اقرار سے از خود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی ایک مستند کاپی بھی تھی۔ جس کی لاکھوں نقول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس موجود تھیں؟

۸۔ بنائے فاسد علی الفاسد

پرویز صاحب بسا اوقات اپنے کسی غلط نظریہ یا محتاجِ ثبوت بات کو پورے وثوق سے یوں بیان فرماتے ہیں کہ اس کے مسلم ہونے میں کسی کو شک ہی نہیں پھر اس مشتبہ بات کو بنیاد قرار دے کر اس پر نئی بحث کی عمارت اٹھاتے ہیں مثلاً۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

۱۔ شرح زکوٰۃ : شرح زکوٰۃ کے متعلق آپ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اصولی حکم تو قرآن میں ہے۔ لیکن اس کی جزئیات یعنی نصاب زکوٰۃ' محل نصاب اشیاء' شرح زکوٰۃ اور شرائط زکوٰۃ وغیرہ رسول اللہ نے صحابہ کے مشورہ سے اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق طے فرمائی تھیں۔ یہ ہے بنیاد پھر وہ مسلمانوں کو مشورہ یہ دیتے ہیں کہ وہ بھی قرآن کے احکام کی جزئیات (اور اسی طرح زکوٰۃ کی بھی) مشورہ سے اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق طے کیا کریں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعتاً زکوٰۃ کی جزئیات صحابہ کے مشورہ سے طے پائی تھیں؟ اس بات کا ثبوت کبھی نہیں دیا کرتے۔ البتہ مسلمانوں کو ایسا مشورہ ضرور دیا کرتے ہیں۔

۲۔ اطاعت رسول -- تقلید : فرماتے ہیں:

"مقلد آئمہ ہوں یا مقلد روایات۔ تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہ یا صحابہ کبار یا آئمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے وقت اتنا ہی نہیں سوچتے کہ رسول اللہ و صحابہ کبار یا آئمہ فقہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل خود تلاش کیجیے۔ (اسباب زوال امت ص۱۰) اس میں غلط بنیادیں درج ذیل ہیں:

① تقلید صرف آئمہ فقہ کی اتباع غیر مشروط کو کہتے ہیں اور اس کا مسلمانوں کو کہیں حکم نہیں دیا گیا۔ لہٰذا تقلید شخصی حرام ہے۔ جب کہ رسول اللہ اور صحابہ کبار کی اتباع سنت رسول کی اتباع ہے۔ جو کہ قرآن کی رو سے لازم وواجب ہے لیکن آپ ان دونوں چیزوں کو ایک سطح پر لے آئے ہیں۔

② رسول اللہ بھی دینی مسائل خود نہیں سوچتے تھے۔ بلکہ تبع وحی الٰہی تھے اور اس کے منتظر رہتے تھے۔

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آئمہ اپنے سب مسائل زندگی میں سنت رسول کے تبع تھے اور یہ تقلید نہیں بلکہ اتباع رسول ہے۔

پھر ان غلط بنیادوں کے باوجود مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ کو سنت رسول کی پیروی کی کوئی ضرورت نہیں۔ براہ راست قرآن سے مسائل زندگی کا حل خود تلاش کیجیے۔

۳۔ نظام ربوبیت کا قیام : فرماتے ہیں:

"جیسا کہ گذشتہ ابواب میں لکھا جا چکا ہے کہ نبی اکرم نے جاں نثار رفقائے کار کی معیت میں تیئس سال میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق قرآن کے اس نظام (ربوبیت) کو متشکل فرما دیا۔ جس کو اس نے انسانی معاشرہ کا منتہیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس پروگرام کو پس پشت ڈال دیا (ن۔ ر ص۲۳۲) لہٰذا اب مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بہرحال اس نظام کو بحال کریں۔

اب محتاج ثبوت بات یہ ہے کہ آیا رسول اللہ نے واقعی یہ نظام قائم کیا تھا؟ اس بات کے ثبوت کے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

لیے آپ تاریخ سے کچھ نہیں بتایا کرتے۔ جیسا کہ انہیں خود بھی اعتراف ہے۔ (ن۔ ر ص ۳۲۳) وہ قرآن سے بھی کچھ نہیں بیان فرماتے البتہ اپنی قرآنی بصیرت پر ہی اس کی بنیاد استوار فرماتے ہیں اور مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کی تاکید فرمایا کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے ترجمان ماہنامہ طلوع اسلام کے ٹائٹل پر جلی الفاظ میں لکھا جاتا ہے۔ "قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر"

۴۔ یتیم پوتے کی وراثت: قرآنی فیصلے ص ۱۲۱ پر فرماتے ہیں کہ:

"وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے اور وہ ہے قائم مقامی" وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ "اگلا اصول یہ بتاتے ہیں کہ باپ کی وفات سے اس کا بیٹا قائم مقام ہو جاتا ہے۔" (حوالہ ایضاً)

اب سوال تو یہ ہے کہ اتنے اہم اصول کا ثبوت کیا ہے؟ یہ قرآن کی کونسی آیت کے مطابق ہو؟ کیا مرا ہوا شخص بھی وارث ہو سکتا ہے کہ اس کی وراثت کی قائم مقامی کا سوال پیدا ہو؟ تاہم آپ امت کو ایسا مشورہ ضرور دے سکتے ہیں۔

۵۔ نظریہ ارتقاء: فرماتے ہیں کہ:

"ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ منزل انسانیت میں پہنچ کر زندگی کی ارتقائی حالت وہ نہیں رہی جو حیوانات تک تھی۔" (ن۔ ر ص ۵۸)

یہ تو ہے "بنیاد" (جو قرآن نے بتائی ہے) اور مشورہ یہ ہے کہ آپ نظام ربوبیت کے پروگرام میں شامل ہو کر انسانی ذات کی مزید ارتقائی منازل طے کریں۔

۹۔ دوسرے ہتھکنڈے

پرویز صاحب کے "ہاتھ کی صفائی" آپ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا میں یہاں صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ تحریف لفظی: عند الضرورت پرویز صاحب قرآن کی آیات میں بھی تھوڑی بہت تحریف فرما سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ دنیوی خوشحالی: آپ کے نظریہ کے مطابق مومن کی دنیوی زندگی کی خوشحالی ہی اس کی اخروی فلاح کی ضمانت ہے۔ جب کہ قرآن اخروی فلاح کے ساتھ دنیوی خوشحالی کو پسند ضرور کرتا ہے لیکن اسے لازم قرار نہیں دیتا۔ اب پرویز صاحب نے اپنے نظریہ کی تائید میں قرآنی آیات میں جیسے تحریف فرمائی وہ یوں ہے:

"اس لیے کہ اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ (غلبہ اور تمکن اللہ کے لشکر کے لیے ہے۔" (مقام حدیث ص ۲۲۳)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

اور غالباً تحریف ہی کی وجہ سے آپ نے اس آیت کا حوالہ درج کرنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ یہ سورہ مجادلہ کی آخری آیت ہے اور یوں ہے۔

﴿أَلَآ إِنَّ حِزْبَ ٱللَّهِ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾﴾ "سن رکھو کہ خدا کا لشکر ہی مراد حاصل کرنے والا ہے۔" (المجادلة ۵۸/ ۲۲)

فلاح کا لفظ عموماً فلاح اخروی کے لیے بولا جاتا ہے اور غلبہ کا تعلق اس دنیوی زندگی سے ہے لہٰذا آپ نے مصلحون کی بجائے غالبون ہی درج کرنا مناسب سمجھا اور مزید بے احتیاطی یہ کی کہ اِنَّ سے پہلے ف بھی بڑھا دی۔

۲۔ مساوات مرد و زن: قرآن کہتا ہے کہ "جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر بھی ہیں۔ تاہم مردوں کو عورتوں پر درجہ یا فضیلت حاصل ہے (۲۲۸:۲) لیکن پرویز صاحب "مساوات مرد و زن" کے قائل ہیں۔ لہٰذا وہ اس "یک طرفہ فضیلت کو کیونکر تسلیم کریں؟ وہ دو طرفہ فضیلت کو (یعنی کسی پہلو میں مردوں کی عورتوں پر اور کسی پہلو میں عورتوں کی مردوں پر تو تسلیم کر سکتے ہیں۔ صرف مردوں کی عورتوں پر فضیلت تسلیم نہیں کرتے چنانچہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں جو آیت پیش فرمائی ہے وہ ہے (فضلنا بعضکم علی بعض) (طاہرہ کے نام خطوط ص ۶۷)

اب دیکھئے اس سے ملتے جلتے الفاظ قرآن میں دو مقامات پر آئے ہیں ایک جگہ رسل وانبیاء کے متعلق فرمایا فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۲۵۳:۲) اس مقام پر فضلنا کے ساتھ ھم ہے کم نہیں۔

دوسرے مقام پر فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (۷۱:۱۶) ہے یہاں کم کے ساتھ فضلنا نہیں بلکہ فَضَّلَ ہے۔

آپ نے فضلنا کا لفظ (۲۵۳:۲) سے لیا۔ اور بَعْضَكُمْ علٰی بعضٍ (۷۱:۱۶) کا ہے اور اس کو دونوں مقامات کے سیاق وسباق سے بے نیاز ہو کر مساوات مرد و زن کے موضوع کے لیے یہ جملہ فٹ فرمالیا۔

۳۔ آیات کے بے کار حصے: آپ بعض دفعہ آیات کا مفہوم بیان فرماتے فرماتے آیات کے بعض حصوں کا مفہوم گول کر جاتے ہیں۔ اور انہیں بیکار سمجھ کر اس کا مفہوم چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ایسی نوبت آپ کو عموماً معجزات کی مشکل کے وقت پیش آتی ہے۔ مثلاً۔

1. قرآن میں ہے کہ "جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے اضرب بعصاک الحجر یعنی "اپنی لاٹھی پتھر پر مارو" آیت کا یہ ٹکڑا قرآن میں دو مقامات ۶۰:۲ اور ۶۳:۲۶ پر مذکور ہے پرویز صاحب ان دونوں مقامات پر ان الفاظ کا ترجمہ یا مفہوم گول کر گئے ہیں۔
2. حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ ہونے کا ذکر قرآن میں وضاحت سے موجود ہے لیکن آپ اس "غیر فطری" کو بھلا کیسے مان لیں لہٰذا سول آل عمران میں جہاں وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ (۴۶:۳) کے الفاظ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

آئے تو آپ نے مفہوم القرآن میں ان الفاظ کا کچھ مفہوم نہیں بتایا۔

۳۔ بار بار: اگر قرآن میں کوئی حکم ایک بار مذکور ہو لیکن پرویز صاحب کے ہاں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہو کہ قرآن کو وہ حکم بار بار ذکر کرنا چاہئے تھا۔ تو آپ یہ بار بار کی تاکید قرآن کے ذمہ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:

"قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پاس اتنی قوت جمع رکھو کہ اس سے مخالفین کے دل پر تمہارا رعب چھایا رہے۔ (م۔ ح ص ۲۳)

اب دیکھئے قرآن میں یہ حکم صرف ایک بار آیا ہے (۶۰:۸) جسے آپ بار بار کہہ کر قرآن کے ذمہ لگا رہے ہیں اور جن باتوں کا فی الواقع قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے مثلاً اللہ اور یوم آخرت پر ایمان۔ صلوٰۃ وزکوٰۃ وغیرہ تو ان جیسے احکام کے آپ اتنے زیادہ مفہوم بیان کر دیتے ہیں جن کے نتیجہ کے طور پر عملی لحاظ سے ہر حکم سے چھٹی مل جاتی ہے۔ صرف آپ کے نظام ربوبیت کا ذکر خیر یا اس کے لوازمات باقی رہ جاتے ہیں۔

2 اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ایک بار ایک خاص موقعہ پر کسی خاص مصلحت کے تحت فرمایا تھا کہ حسبنا کتاب اللہ تو اس جملہ کا ایک تو مفہوم آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مفہوم کے برعکس مراد لے لیتے ہیں' دوسرے آپ اس جملہ کا ذکر کرتے وقت اکثر یوں لکھتے ہیں "جیسے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے۔ اور اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۴۔ حوالہ جات: بعض دفعہ پرویز صاحب کوئی ایسی اہم بات کہہ دیتے ہیں جس کے لیے حوالہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ مگر آپ اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے اور ایسی باتیں لاتعداد ہیں چند ایک کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

1 رسول اللہ نے نظام ربوبیت قائم فرمایا تھا۔ 2 آپ نے زکوٰۃ کی شرح صحابہ سے باہمی مشورہ سے طے کی تھی۔ 3 مسجد نبوی میں ایک صندوق تھا جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ اس صندوق میں پڑی ہوئی قرآن کی ماسٹر کاپی میں لکھوا لیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تمام باتیں "طلوع اسلام" کی "موضوعات" ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

ضمیمہ

طلوع اسلام سے چند بنیادی سوالات

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸:۴۲)

{1} وحی اور قرآن

① کیا کوئی ایسی واضح آیت قرآن میں موجود ہے جس سے معلوم ہو کہ وحی تمام تر قرآن میں محصور ہے؟

② اگر وحی الٰہی تمام تر قرآن میں محصور ہے تو بتایئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت حکم الٰہی کے مطابق کی تھی یا از خود ہی نکل کھڑے ہوئے تھے اگر حکم الٰہی سے ہوئی تھی تو یہ حکم قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر بلا حکم الٰہی ہی آپؐ نکل کھڑے ہوئے تو حضرت یونس علیہ السلام پر کیوں عتاب نازل ہوا تھا؟

③ حدیبیہ کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے تمام صحابہ سے خون پر بیعت لینے کے بعد حقیر شرائط پر اور تمام صحابہ کی مرضی کے خلاف جو صلح کی تھی۔ وہ حکم الٰہی سے کی تھی یا از خود ہی کر لی تھی؟ اگر آپ ﷺ نے از خود کر لی تھی تو آپ ﷺ نے مشورہ کے واضح حکم کے بعد ایسا کیوں کیا؟ اور اگر بحکم الٰہی کی تھی تو یہ حکم قرآن میں کہاں ہے؟

④ آپ ﷺ نے بہت سی ایسی پیش گوئیاں کیں۔ جو قرآن میں مذکور نہیں ایسی پیش گوئیاں کچھ تو آپ ﷺ کی زندگی میں ہی پوری ہو گئیں کچھ آپ ﷺ کی وفات کے بعد۔ کوئی پیش گوئی ایسی نہیں جو صحیح روایت سے ثابت ہو پھر وہ غلط ثابت ہو۔ ایسی انبائے غیب کا رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا ذریعہ تھا؟

⑤ (الف) قرآن کا بیان کیا چیز ہے؟ کیا اس بیان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے یا نہیں؟

(ب) اگر قرآن کے بیان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے وہ اللہ نے پوری کی ہے یا نہیں؟ اور اگر کی ہے تو کیسے؟

(ج) قرآن کے بیان کو اگر قرآن سے الگ کر دیا جائے تو قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا کچھ فائدہ ہے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

خصوصاً جب کہ ہر شخص اس کے علمی حصہ کی تاویل و تعبیر میں آزاد ہے اور اس کی یہ شرح کسی بھی دوسرے کے لیے قابل حجت نہیں۔ رہا احکام کا حصہ جس کی جزئیات اگر کبھی قرآنی معاشرہ یا مرکز ملت قائم ہوا تو متعین کرے گا؟

⑥ قرآن ۲۳ سال تک وقفوں سے نازل ہوتا رہا۔ تو اس کی سورتوں میں آیات کی ترتیب وحی کے ذریعہ دی گئی یا رسول اللہ ﷺ نے خود ہی جیسے مناسب سمجھا' آیات کا ربط قائم فرما دیا تھا؟ نیز بتایئے کہ اگر ترتیب کو الہامی اور بذریعہ وحی نہ مانا جائے۔ تو قرآن کو الہامی کتاب سمجھا جا سکتا ہے؟

② استواء علی العرش

⑦ اگر اللہ تعالیٰ عرش پر یا اوپر نہیں (بلکہ ہر جگہ موجود ہے) تو قرآن کہاں سے نازل ہوتا تھا؟

⑧ (الف) انسانی ذات کے ارتقاء کیلئے پرویز صاحب اپنے صراط مستقیم اوپر کو کیوں لے جاتے ہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۳۴۳)

(ب) اللہ تعالیٰ اپنے "امر" کو "سماء" سے "ارض" پر کیوں اتارتا ہے؟ (نظام ربوبیت ص ۶)

③ فرشتوں کا خارجی وجود اور تشخص

⑨ اگر فرشتوں کا خارجی وجود نہیں تو قرآن کو کون رسول اللہ ﷺ کے دل پر اتارتا تھا؟

⑩ یہ جبرئیل اور میکائیل کیا چیز ہیں؟ کراماً کاتبین کون ہیں؟ تین ہزار یا پانچ ہزار ملائکہ کی کیا حقیقت ہے جو جنگ بدر میں صرف ۳۱۳ غازیوں کی مدد کے لیے نازل ہوئے تھے؟

④ وحی اور کتابت

⑪ اگر وحی الٰہی کے لیے اور تعمیل احکام وحی کے لیے کتابت ضروری ہے تو جن انبیاء کو کتاب دی ہی نہیں گئی۔ ان کی امتوں پر احکام وحی کی تعمیل فرض تھی یا نہیں؟ نیز ان قوموں پر کیوں عذاب آیا تھا؟

⑫ موسیٰ علیہ السلام پر تورات اس وقت نازل ہوئی جب آپ فرعون سے نجات حاصل کرنے کے بعد مقام تیہ میں تھے۔ تورات کے نزول سے پہلے کی وحی اگر کتابت نہ ہونے کی وجہ سے واجب التعمیل نہیں تھی۔ تو فرعونیوں کو غرق کیوں کیا گیا؟

⑤ تکمیل دین

⑬ طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ دین دور نبوی ﷺ میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی رو سے مکمل ہو چکا۔ لہٰذا احادیث کی ضرورت نہیں اور ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر دین مکمل ہو چکا ہے تو پھر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

مرکز ملت کی کیا ضرورت ہے؟

⑥ مشورہ

⑭ طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں صرف اصول بیان ہوئے ہیں ان کی جزئیات آپ ﷺ بحکم الٰہی [1] صحابہ سے مشورہ کر کے اور اقتضآت زمانہ کے مطابق طے فرمایا کرتے تھے۔ کیا طلوع اسلام کسی ایک ایسے مشورہ کی تفصیل پیش کر سکتا ہے جس کا تعلق تشریعی امر سے ہو۔ یعنی اس کا تعلق نمازوں کی تعداد' اوقات' رکعات' ترتیب وغیرہ سے ہو یا زکوۃ کے نصاب اور شرح کے متعلق یا حج کے مناسک کے متعلق ہو یا طلاق اور رضاعت سے متعلق' وراثت سے متعلق ہو یا جہاد کے احکام سے متعلق ہو؟

⑦ ظن اور یقین

⑮ دین کے لیے یقینی ہونا ضروری ہے اور یقینی چیز صرف قرآن ہے اب قرآن کی جو جزئیات مرکز ملت طے کرے گا۔ وہ یقینی تو نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ قرآن میں نہیں ہیں۔ پھر کیا یہ دین کا حصہ اور واجب التعمیل ہوں گی؟ اگر یہ جزئیات شریعت بن سکتی ہیں۔ تو پھر سنت رسول ﷺ کیوں نہیں بن سکتی؟ اور اگر یہ جزئیات نہ دین ہیں نہ واجب التعمیل تو پھر اس کا فائدہ کیا ہے؟

⑯ ظنی ہونے سے متعلق جو کچھ اعتراضات حدیث پر کئے جاتے ہیں مثلاً بشری لغزشیں یا میلانات وعواطف' کیا یہ مرکز ملت ان سے محفوظ ومصئون ہو گا؟

⑰ جب تک مرکز ملت قائم ہو کر اصولی احکام کی جزئیات طے نہیں کرتا اس وقت تک ان اصولی احکام کی تعمیل کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ نیز کیا یہ احکام اس وقت تک ناواجب التعمیل سمجھے جاتے ہیں؟ مثلاً آج اگر کوئی شخص مسلمان ہو تو وہ احکام دین کی تعمیل کیسے کرے؟

⑱ ایک سے زیادہ ظن یا ظنون کا مجموعہ کسی واقعہ کے متعلق یقین پیدا کرتا ہے یا مزید بد ظنی؟ اگر مزید بد ظنی پیدا کرتا ہے تو قرآن نے شہادتوں کا نصاب کیوں مقرر کیا ہے؟ اور اگر یقین پیدا کرتا ہے تو حدیثوں کے یقینی ہونے پر کیوں اعتراض ہے؟

---

[1] واضح رہے کہ مشورہ صرف تدبیری امور میں ہوتا ہے تشریعی میں نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

﴿۸﴾ اطاعتِ رسول ﷺ

⑲ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کی نہیں۔ (مقام حدیث ص ۶۴) اب جو انبیاء اپنی قوم کو فاتقوالله واطیعون (۲۶:۱۰۸-۱۱۰-۱۲۶) یعنی "ڈرو اللہ سے اور اطاعت میری کرو" کہتے رہے۔ ان کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ لوگوں سے اس بنیادی نکتہ کو اوجھل رکھ کر اور خدا کا نام بھی لئے بغیر اپنی ہی اطاعت کی ترغیب دے کر نعوذ باللہ لوگوں سے شرک کرواتے رہے ہیں؟

⑳ اگر اطاعت رسول کی بھی درست نہیں تو مرکز ملت کی اطاعت کیسے درست ہو سکتی ہے؟

㉑ کیا وجہ ہے کہ امت کیلئے اسوہ حسنہ رسولؐ کی ذات کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کو نہیں دیا گیا؟ (۳۳-۲۱)

﴿۹﴾ کتابتِ حدیث

㉒ مسلم کی یہ روایت ہے کہ "جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا دے" ﴿ وما ینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحٰی ﴾ میں شامل ہے یا نہیں؟ اگر شامل ہے تو یہ وحی غیر از قرآن ہوئی۔ اور اگر شامل نہیں تو پھر اسے طلوع اسلام درست اور قابل حجت کیوں سمجھتا ہے؟

﴿۱۰﴾ ناسخ و منسوخ

㉓ درج ذیل آیت کا کیا معنی ہے؟ ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (۸۷:۶،۷) "ہم تمہیں پڑھائیں گے جسے تم بھولو گے نہیں مگر جو اللہ چاہے۔"

㉔ جرم فحش کیا چیز ہے؟ جس کی سزا عورتوں کے لیے حبس دوام ہے۔ اور اس کا نصاب شہادت زنا کے برابر ہے۔ یعنی چار شہادتیں [1] درکار ہیں؟ پھر جب اس "جرم فحش" کی سزا خود قرآن نے بتا دی تو یہ حد ہے اسلامی تاریخ میں کیا یہ سزا کسی مجرمہ کو ملی ہے؟

㉕ پرویز صاحب قرآنی فیصلے ص ۱۶۴ پر لکھتے ہیں کہ:

"قرآن کی مقرر کردہ سزائیں چار پانچ جرائم سے زیادہ کے لیے متعین ہی نہیں۔ وہ جرائم جن سے حفاظت نفس (قتل) حفاظت اموال (سرقہ) حفاظت عصمت (زنا) اور قذف اور حفاظت مملکت (بغاوت) خطرہ میں پڑ جائے۔"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے "طاہرہ کے نام خطوط" ص: ۱۹۵، ۱۹۶

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

قرآن کے متعین کردہ قابل حد جرائم کی فہرست میں سے آپ یہ جرم فحش کیوں چھوڑ گئے؟ کیا اس جرم کی سزا قرآن نے متعین نہیں کی؟

(۲۶) جس آیت میں عورتوں کے لیے حبس دوام کی سزا کا ذکر ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس جرم کے لیے کوئی دوسری سزا تجویز کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ کیا اللہ نے وہ وعدہ پورا کیا تھا؟ اگر کیا تھا تو یہ کس آیت کی رو سے پورا ہوا؟ نیز بعد ازاں کیا حبس دوام کی سزا باقی رہی یا ختم ہو گئی؟

{۱۱} وراثت

(۲۷) آپ لکھتے ہیں کہ "وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔" (قرآنی فیصلے ص۱۲۱) یہ اتنا اہم اور بنیادی اصول قرآن کی کون سی آیت سے ماخوذ ہے؟

(۲۸) کیا مرا ہوا شخص وارث بن سکتا ہے؟ پھر جو شخص خود وارث نہیں ہے اس کی قائم مقامی کیسی؟

(۲۹) قرآن نے یتیم پوتے کا دادا کے ترکہ میں سے حصہ کونسی آیت میں ذکر کیا ہے؟ چونکہ رسول اللہ ﷺ خود عبدالمطلب کے یتیم پوتے تھے اور انہیں وراثت میں سے حصہ بھی نہیں ملا تھا۔ لہٰذا یتیم پوتے کے حصہ کے لیے بالخصوص قرآن میں واضح حکم آنا چاہیئے تھا۔

(۳۰) آپ قرآنی قانون وراثت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانون وراثت جس حسن وخوبی اور جامعیت واکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔" (قرآنی فیصلے ص۱۱۳)

پھر موجودہ فقہی قانون وراثت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ ہے کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک آنا چاہیئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً:

۱/۲ + ۱/۴ + ۱/۴ = ۱ یہ تقسیم درست ہے۔ لیکن:

۱/۲ + ۱/۲ + ۱/۲ = ۳/۲ یہ تقسیم غلط ہے۔ کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ (۱-۱/۲) آتا ہے۔

اب اگر طلوع اسلام وجد میں آکر مندرجہ ذیل صورتوں میں ترکہ کی تقسیم اس طرح بتا دے کہ اللہ تعالیٰ کی حساب دانی پر کوئی حرف نہ آئے تو یہ اس کی مہربانی ہوگی۔

(الف) مرنے والی بیوی کا خاوند' ۳ بیٹیاں اور ماں باپ دونوں زندہ ہیں۔

(ب) مرنے والے کی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ صرف ایک بیٹی اور ماں زندہ ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(ج) مرنے والی بے اولاد تھی صرف اس کا خاوند اور دو بہنیں زندہ ہیں۔

﴿۱۲﴾ وصیت

(۳۱) پرویز صاحب کے نزدیک وصیت کرنا ہر مسلمان پر اس لیے واجب ہے کہ قرآن میں چار بار تاکید آئی ہے۔ اب قرآن میں جہاں وصیت کی تاکید آئی ہے' وہاں قرضہ کی ادائیگی کی بھی تاکید آئی ہے تو اگر چار بار ذکر آنے سے وصیت واجب ہو جاتی ہے تو چار بار ذکر آنے سے قرضہ اٹھانا اور پھر بغیر ادائیگی کے مرجانا کیوں واجب نہیں ہو سکتا؟

﴿۱۳﴾ مرکزِ ملت

(۳۲) مرکز ملت قرآنی اصولوں کی جو جزئیات متعین کرے گا وہ کسی صورت میں بھی "بما انزل اللہ نہیں ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ جو کوئی بما انزل اللہ کے علاوہ فیصلہ کرے تو ایسے لوگ کافر' ظالم اور فاسق ہیں۔ (۵۔۴۴۔۴۵۔۴۷)۔

تو کیا مرکز کی متعین کردہ جزئیات کی اطاعت صریح کفر و شرک نہ ہو گا؟

(۳۳) کیا موجودہ دور میں دنیا بھر کے مسلم ممالک کا ایک مرکز ملت پر متفق ہونا ممکن ہے؟ اگر ہر ملک الگ الگ مرکز ملت بنائے تو قرآنی احکام کی جزئیات ہر ملک اپنے ماحول اور اقتضآت کے مطابق طے کرے گا تو اس سے عصبیت تشتت وانتشار اور فرقہ بازی و فرقہ پرستی کو جو فروغ حاصل ہو گا اس کا کیا علاج ہے؟

﴿۱۴﴾ حجیّتِ حدیث

(۳۴) اگر احادیث حجت نہیں تو موضوع احادیث کیوں گھڑی جاتی رہی ہیں اور آج تک یہ سلسلہ کیوں جاری ہے؟

(۳۵) اگر حدیث کی حجیت سے انکار کر دیا جائے تو قرآن کی حفاظت کو ثابت کیا جا سکتا ہے؟ بالفاظ دیگر احادیث ظنی ہیں۔ تو قرآن کو یقینی کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے؟ واضح رہے قرآن کی داخلی شہادات اس وقت تک حجت نہیں بن سکتیں جب تک خارجی ذرائع سے اس کی حفاظت ثابت نہ ہو جائے۔

﴿۱۵﴾ نظامِ ربوبیت

(۳۶) اگر قرآن شخصی املاک کی نفی کرتا ہے یا اس نفی کو بہتر سمجھتا ہے تو احکام میراث حضور ﷺ کی آخری زندگی میں کیوں نازل ہوئے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

(۳۷) اگر انفرادی ملکیت اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ چیز یا ناجائز ہے تو چوری کی حد کیوں مقرر کی گئی؟

(۳۸) سرکاری سطح پر زکوۃ کی وصولی کا حکم آپ ﷺ کی آخری زندگی میں کیوں نازل ہوا؟

(۱۶) تلاوت قرآن

(۳۹) حروف مقطعات یا آیات متشابہات سے نہ کوئی حکم ملتا ہے' نہ اصول اور نہ ہی کوئی مستقل قدر۔ کیا ایسی آیات کی تلاوت کرنی چاہیئے یا نہیں؟ جب کہ ان میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا؟ اللہ میاں نے ایسی آیات کو قرآن میں کیوں شامل کر دیا ہے جن سے کوئی ضابطہ اخذ نہیں ہو سکتا۔ جب کہ قرآن آپ کی نظر میں محض ایک ضابطہ کی کتاب ہے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

کتابیات

① قرآن مجید	---	---
② مختلف تراجم وتفاسیر حسب ضرورت	---	---
③ کتب احادیث حسب ضرورت	---	---
④ جامع بیان العلم	حافظ ابن عبد البر اندلسی	طباعة المنیریه - مصر
⑤ تذکرة الحفاظ	شمس الدین الذہبی	دار الاحیاء التراث الاسلامی بیروت
⑥ توجیہہ النظر	طاہر بن صالح الجزائری	
⑦ صحیفہ ہمام بن منبہ	ڈاکٹر حمید اللہ	ملک سنز' کارخانہ بازار' فیصل آباد
⑧ فقہ السنہ	سید سابق	دار الفکر بیروت
⑨ نیل الاوطار	امام شوکانی	ادارۃ البحوث' مملکۃ العربیۃ السعودیہ
⑩ نخبۃ الفکر مع شرح نزھۃ النظر	ابن حجر عسقلانی	---
⑪ مفردات القرآن (اردو)	امام راغب اصفہانی	اہلحدیث اکیڈمی' کشمیری بازار' لاہور
⑫ منجد	---	دار الاشاعت' کراچی
⑬ منتہی الارب	---	کشمیری بازار' لاہور
⑭ فقہ اللغۃ	اسماعیل الثعالبی	مؤسسہ مطبوعات اسماعیلیان قم (ایران)
⑮ فروق اللغویہ	ابو ہلال عسکری	مکتبہ بصیرتی - قم - شارع ارم ایران
⑯ رحمۃ للعالمین	قاضی سلمان منصور پوری	غلام علی اینڈ سنز' لاہور
⑰ تاریخ الحدیث	ابو الزہرہ	ناشران قرآن لمیٹڈ
والمحدثین	ترجمہ غلام احمد حریری	اردو بازار' لاہور
⑱ تاریخ حدیث	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	مکتبہ رشیدیہ' لاہور
⑲ تدوین حدیث	مناظر احسن گیلانی	از ماہنامہ برہان' دہلی
⑳ اصطلاحات المحدثین	شیخ الحدیث سلطان محمود	فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
㉑ انتخاب حدیث	عبد الغفار حسن	اسلامک پبلی کیشنز' لاہور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

㉒ سُنّت کی آئینی حیثیت	مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ	"
㉓ خلافت وملوکیت	ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ	اسلامک پبلی کیشنز' لاہور
㉔ سلسلہ جبر وقدر	"	"
㉕ حجیت حدیث	مولانا محمد اسماعیل سلفی	اسلامک پبلشنگ ہاؤس' لاہور
㉖ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث	"	مکتبہ سلفیہ' لاہور
㉗ انکار حدیث کے نتائج	محمد سرفراز خان	انجمن اسلامیہ گکھڑ' ضلع گوجرانوالہ
㉘ تفہیم اسلام	مسعود بی۔ایس۔سی	جماعت المسلمین' کراچی
㉙ حقیقت الفقہ	حافظ محمد یوسف جے پوری	ادارہ اشاعت دین آف مومن پورہ بمبئی
㉚ آسمانی فیصلے	میاں محمد حافظ نوشہروی	ادارہ عروج اسلام' خوشاب' سرگودہا
㉛ دائرۃ المعارف اردو	---	پنجاب یونیورسٹی' لاہور
㉜ انسائیکلوپیڈیا اردو	---	فیروز سنز' لاہور
㉝ علم جدید کا چیلنج	وحید الدین خاں	ادارہ ضیاء الحدیث' مدنی روڈ' مصطفیٰ آباد' لاہور
㉞ مذہب اور تجدید مذہب	پروفیسر عبد الحمید صدیقی	اسلامک پبلی کیشنز' لاہور
㉟ اسلامی ریاست	شمیم حسین قادری	علماء اکیڈمی' لاہور
㊱ الفاروق	شبلی نعمانی	رنگ میل پبلی کیشنز' لاہور
㊲ حکایات عزیمت	بدر عالم	گلستان پبلی کیشنز' لاہور
㊳ حکومت اور علماء ربانی	حافظ عبد اللہ روپڑی	مکتبہ نذیریہ' لاہور
㊴ سُنّت نبویہ اور قرآن کریم	ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار	مجلس دعوت و تحقیق اسلامی' کراچی
㊵ تفسیر القرآن	سرسید احمد خاں	کشمیری بازار' لاہور
㊶ حلال و حرام	عطاء اللہ پالوی	غلام علی اینڈ سنز' لاہور
㊷ دو اسلام	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	"
㊸ ضربِ حدیث	صادق سیالکوٹی	نعمانی کتب خانہ' لاہور
㊹ قرآن اور پرویزی مؤاخذہ	سید محمد حسن	سپر آرٹ پریس' کراچی
㊺ فتنہ انکار حدیث	ولی حسن خان	المعین ٹرسٹ کراچی
㊻ اسلام اور دین آسان	جعفر شاہ پھلواری	ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور
㊼ تعداد ازدواج	"	"
㊽ اجتہادی مسائل	"	"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

طلوع اسلام کا لٹریچر

① مقام حدیث
② قرآنی فیصلے
③ نظام ربوبیت
④ طاہرہ کے نام خطوط
⑤ اسباب زوال امت
⑥ تبویب القرآن
⑦ لغات القرآن (۴ جلد)
⑧ مفہوم القرآن (۳ جلد)
⑨ مطالب الفرقان
⑩ کتاب التقدیر
⑪ تصوف کی حقیقت
⑫ معراج انسانیت
⑬ شاہکار رسالت
⑭ پاکستان کا معمارِ اوّل - سرسید
⑮ ابلیس و آدم
⑯ طلوع اسلام کے مختلف پرچہ جات
⑰ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ مختلف پمفلٹ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)

آئینۂ پرویزیت

حدیث، قرآن کریم کی وہ تشریح وتوضیح ہے جس کی روشنی ہی میں اسلام ایک مکمل اور جامع دین کی صورت میں سامنے آتا، عمل کے قالب میں ڈھلتا اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر قرآن کی یہ شرح وتفسیر نبوی ہمارے پاس نہ ہوتی تو دینِ اسلام کی جامعیت کا اثبات ہو سکتا تھا نہ اس کا کوئی ڈھانچہ مرتب اور اس پر مبنی کوئی معاشرہ ہی متشکل ہو سکتا تھا۔

لیکن الحمدللہ! مسلمانوں کے پاس تینوں ہی چیزیں ہیں جسے وہ پورے شرح صدر اور کامل یقین واذعان کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسلام ایک جامع دین ہے جس میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہدایات ہیں، اس کا ایک عملی قالب ہے جسے اختیار کرنے کی وہ دعوت دیتے ہیں اور ان کے صفحات تاریخ پر خیر القرون کا وہ بہترین اسلامی معاشرہ ہے جس کی صورت گری (تشکیل) مذکورہ ڈھانچے ہی پر ہوئی تھی۔

اسلام کی یہ جامعیت یا خوبی صرف اور صرف قرآن کریم کے ساتھ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کو ماخذِ دین اور حجت شرعیہ ماننے کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے قرآن نے بھی بار بار اللہ کی اطاعت کے ساتھ، رسول کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اللہ کی نازل کردہ کتاب پر کامل طریقے سے اور صحیح معنوں میں عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

حدیث رسول کی یہی وہ اہمیت ہے جو دشمنان اسلام کی نظر میں خار بن کر کھٹکتی ہے اور وہ مختلف عنوانات سے اس پر شب خون مارتے اور اس کی اہمیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اسلام کی من مانی تعبیر کر کے مغرب کی حیا باختہ تہذیب، اس کے الحاد وزندقہ اور کمیونزم جیسے غیر فطری نظریے کو سند جواز دے سکیں۔

زیر نظر کتاب اسی فتنۂ انکار حدیث کی تردید وبطلان میں ایک نہایت معرکہ آراء کتاب ہے جس میں آستین کے ان سانپوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو ''قرآن'' کے نام پر اسلام کی بنیادوں کو ڈھانے کی مذموم کوششیں کرتے رہے ہیں یا کر رہے ہیں اور ان کے ان تمام ''مغالطوں'' کا پردہ چاک کر دیا گیا ہے جو وہ حدیث کی تشریعی حیثیت کو مجروح کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں، کہ ؎

پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(حافظ صلاح الدین یوسف)

مکتبۃ السلام سٹریٹ نمبر ۲۰ وسن پورہ لاہور

Designed & produced by DARUSSALAM Ph: 042-7240024 - 7232400